خدا بخش لائبریری

جرنل

پٹنہ



خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدابخش لائبریری

جرنل پٹنہ



خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۲۲۴۲۴/۷۷
شمارہ : ۱۰۰

سالانہ : ۳۰۰ روپے
: ۶۰ ڈالر ایشیا، ۱۲۰ ڈالر غیر ممالک

اس شمارے کی قیمت: پچھتر روپے

۱۹۹۵ء

مصطفیٰ کمال ہاشمی نے پاکیزہ آفسیٹ، شاہ گنج پٹنہ میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا۔

کچھ اس جرنل کے بارے میں

خدابخش صدی یادگار تقریبات کا پانچ سالہ پروگرام بنایا گیا تھا جو ۱۹۹۱ء میں شروع ہوا اور ۹۵ پر ختم ہو رہا ہے۔ اس میں یہ طے ہوا کہ سو اہم کتابیں شائع کی جائیں۔

اس میں یہ تجویز بھی ہوئی کہ جرنل کا وقفہ اشاعت ماہانہ کر دیا جائے اور اسی اعتبار سے ۱۹۹۱ء سے شمارہ نمبر گنے جانے لگے لیکن، چونکہ یہ عملاً ممکن نہ ہو سکا کہ جس نوعیت کا یہ پرچہ تھا اس کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اسکی ماہانہ اشاعت میں تسلسل رہے، اس لیے وہ شائع تو تماہی ہوتا رہا لیکن شماروں کی گنتی میں اُسے ماہنامہ تصور کیا جاتا رہا یعنی جنوری تا مارچ کے پرچے کو جنوری، فروری، مارچ گنا گیا اور تین پرچے شمار کیے گئے جبکہ واقعتہ وہ ایک ہی تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۴ء کی پہلی تماہی تک چلا۔

۱۹۹۴ء کی دوسری تماہی سے یہ خیالی سلسلہ واقعیت کی طرف مڑ گیا یعنی شمارہ ۹۶ سے ہر تماہی نمبر گنتی میں ایک ہی شمار کیا گیا۔ گویا نمبر ۹۶ سے یہ پھر اپنی اصل کی طرف لوٹ گیا ہے۔

ایک بات اور بھی: دس سال تک کے شماروں کا حساب مالی سال سے چلتا رہا۔ ۱۹۸۷ء میں ایک فاضل شمارہ، نمبر ۴۴ مالی سال ۱۹۸۸ء کی پہلی تماہی میں دینے کے بجائے ۱۹۸۷ء کی آخری تماہی کے ساتھ دیدیا گیا تاکہ مالی سال کا حساب رکھنے کے بجائے عام تقویم جنوری تا دسمبر کا سادہ سا حساب جرنل کی اشاعت میں بھی قائم رکھا جائے۔

خریدار افراد اور اداروں کے لیے یہ دونوں نکتے کوئی مسئلہ کبھی نہیں بنائے گئے اور انہیں ایک سال میں ۴ شمارے باقاعدہ ملتے رہے، گویا وہاں یہ تماہی ہی بنا رہا اور اس لحاظ سے اس کا چندہ بھی چلتا رہا۔ تاہم یہ تفصیل دینی اس لیے ضروری تھی کہ نمبروں کی گنتی جو ۱۹۹۱ء سے ایک کو تین میں بدلی وہ صرف تخیلی ہی سمجھا جائے کہ اب جرنل پھر اپنی اصل پر واپس آچکا ہے۔

چار شمارے ہر سال پیش کیے جاتے رہے اور شروع میں جب 75/- رُپے سالانہ قیمت تھی تو ہزار صفحات کے بقدر اور جب قیمت 300/- رُپے سالانہ ہو گئی تو تقریباً دو ہزار صفحات کے لگ بھگ خریداروں کو دیے جاتے رہے ہیں۔

شمارہ ۴۴ تک مالی سال کا حساب چلتا تھا تو ہم ۴ شمارے دیتے تھے، یہ ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔ اسی سال ہم نے ایک شمارہ زائد دے کر مالی سال کو عام تقویم میں مدغم / تبدیل کر لیا۔

اور پھر ۱۹۸۸ء سے یہ سال بہ سال چلتا رہا۔ لیکن بس اتنا رہا کہ نمبر ایک تماہی کے بجائے تین مہینوں کے پڑتے رہے یعنی ایک = تین تا آں کہ ۱۹۹۴ء کی دوسری تماہی سے تخیل پھر واقعیت کی طرف مڑ گیا۔ یہ بات ابھی تک ریکارڈ میں نہیں آئی تھی، آجانی چاہئے تھی۔ تاخیر سے ہی معذرت کے ساتھ آجانی چاہئے۔

——— ضرب

جدید غزل گو

۱۹۸۵/۱۹۹۵ء کی ایک دستاویز

حرفے چند

۱۹۸۴ء میں اس سلسلے کی پہلی دستاویز "جدید غزلگو ۱۹۴۱ء کی ایک دستاویز" کے نام سے پیش کی گئی تھی جس میں مندرجہ ذیل شعراء کی اپنے ہاتھ کی لکھی غزل، اپنی خود نوشت سوانح عمری، خود اپنا کیا ہوا انتخابِ کلام شامل تھا اور ایک تصویر بھی:

(۱) آرزو لکھنوی (۲) آسی الدنی (۳) اثر لکھنوی (۴) احسان دانش (۵) علی اختر اختر (۶) اختر شیرانی (۷) امیدا میٹھوی (۸) بیخود دہلوی (۹) تاجور نجیب آبادی (۱۰) ثاقب لکھنوی (۱۱) جلیل مانکپوری (۱۲) جگر مرادآبادی (۱۳) جوش ملیح آبادی (۱۴) حسرت موہانی (۱۵) حفیظ جالندھری (۱۶) دل شاہجہانپوری (۱۷) روش صدیقی (۱۸) پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی (۱۹) سیماب اکبرآبادی (۲۰) فانی بدایونی (۲۱) فراق گورکھپوری (۲۲) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (۲۳) تلوک چند محروم (۲۴) آنند نرائن ملا (۲۵) ناطق گلاوٹھوی (۲۶) ناطق لکھنوی (۲۷) نوح ناروی (۲۸) وحشت کلکتوی (۲۹) یگانہ چنگیزی (۳۰) آزاد انصاری (۳۱) افسر میرٹھی (۳۲) سائل دہلوی (۳۳) صفی لکھنوی۔

اسوقت کے سبھی اہم غزلگو اس دستاویز میں آگئے تھے سوائے اصغر گونڈوی اور اقبال سہیل کے۔

اب جو ہم ۱۹۴۱ء کی مانند ۱۹۸۵ء میں ایک ایسی ہی دوسری عصری دستاویز کا منصوبہ بناکے نکلے تو ۱۹۹۵ء آگیا اور ہنوز روز اول است۔

دوسرے یہ ہوا کہ جب تک یہ منصوبہ بنے بنے نہ عدم رہے نہ شاد عارفی نہ راز یزدانی نہ بسمل سعیدی نہ عندلیب شادانی نہ عبدالمجید حیرت نہ ادیب سہارنپوری نہ عرشی بھوپالی نہ قابل اجمیری نہ ساحر لدھیانوی نہ مجید امجد نہ دکن کے مخدوم، شاہد صدیقی اور خورشید جاہی، نہ پاکستان کے شکیب جلالی اور اطہر نفیس۔ فیض بھی نہ رہے۔

ادھر وحید مجاز، جاں نثار اختر، تمیل مظہری، ناصر کاظمی، جاوید کمال تھک تھک کر اس راہ میں آخر ایک ایک ساتھی چھوٹ گیا! معصوم رضا راہی اور اختر الایمان بنیادی طور سے نظم کے شاعر رہے (اگرچہ راہی کی غزلیں بھی ہیں) پروین شاکر نے اپنے کلام کے تین مجموعے بھیج دیئے تھے۔ اور بس اتنا کیا کہ صفحے انتخاب کلام کے طور سے جا بجا موڑ دیئے تھے۔ اس لیے ہمیں تعلق توڑنا اور رہنے لیکن کیا کرتے۔

ایک کوتاہی ہماری رہی یعنی منیر نیازی اور ایک کوتاہی ان کی اپنی یعنی احمد فراز۔ یہ تلافی آئندہ بھی۔

"صدی کی چوتھی دہائی کے خاتمہ پر کون ممتاز ترین غزل گو تھے جن کے ہاتھوں آزادی کے آس پاس اردو غزل کس منزل میں تھی' یہ دستاویزی مجموعہ اسی سوال کا جواب ہے۔ دستاویز یہ اس لیے بن گیا ہے کہ: 'یہ شعرا کا خود انتخاب کیا ہوا کلام ہے۔ انتخاب کے ساتھ حالات بھی سب شعرا کے اپنے فراہم کیے ہوئے ہیں خواہ اسے انھوں نے خود لکھا ہو یا دوسرے نے ان کی طرف سے۔ ان شعرا کی اسی زمانے کی تصاویر یہ فراہم کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور ہر ایک کی خود نوشتہ ایک تحریر بھی، تاکہ اس کی دستاویزیت اور بھرپور ہو جائے۔"

مندرجہ بالا سطریں ۱۹۴۱ء دستاویز پیش کرتے وقت لکھی تھیں۔

۱۹۹۵ء میں انھیں یوں دہرالیں کہ صدی کی آخری دہائی کے خاتمے پر کون ممتاز ترین غزل گو تھے، جن کے ہاتھوں اردو غزل کس منزل میں تھی، یہ دستاویزی مجموعہ اسی سوال کا جواب ہے: یہ شعرا کا خود انتخاب کیا ہوا کلام ہے اور خود اپنے لکھے ہوئے حالات، اور ہر ایک کی خود نوشتہ ایک غزل بھی۔ تمام شعرا کی تصویریں بھی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک ضروری بات۔ شعرا کے خود نوشتہ حالات انتخاب کلام اور تصاویر ۱۹۸۵ء سے جمع ہونا شروع ہوئے اسلیے اب ۱۹۹۵ء میں جا بجا آپ کو [شاعر کی مدد سے!] اضافہ کرنا پڑے گا۔ کبھی انتخاب کلام میں، کبھی سوانح میں، خاص کر جہاں مجموعہ ہائے کلام کی تعداد جو اس عرصے میں دوسرے یا تیسرے بھی شائع ہو چکے ہوں گے' دوسرے یہ کہ جب یہ کام شروع ہوا تو یہ سب لوگ زندہ تھے اب ع "یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں" اجتبیٰ رضوی، تاباں، حسن نعیم، شاعر لکھنوی اور میکش اس عرصہ میں ہمیشگی میں جا ملے ہیں لیکن انکی یاد ہمارے ساتھ ہے اور ان کے اشعار/افکار ہیں اور دوسرے لوگوں کے دلوں کو خوشی اور ذہن کو بالیدگی عطا کرتے رہیں گے' اسطرح وہ سب بھی ہم میں ہی نہیں' ہمارے بعد آنے والوں میں بھی زندہ رہیں گے! افکار کبھی نہیں مرتا!!

——— ع ۔ ر ۔ ب

فہرست

پیشگفتار

غزل کے ایک متوالے (رشید احمد صدیقی) کی زبان سے غزل کی مدح میں جو یہ نثری شعر سرزد ہوئے ہیں اس مجموعۂ نقدِ غزل کے لیے اس سے بہتر دیباچہ شاید اور کہیں نہ ملے :-

○ غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔

○ غزل فن ہی نہیں فسوں بھی ہے : شاعری نہیں تہذیب بھی ؛ وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق بھی کرتی ہے، کبھی کبھی تنقید و تذکیر بھی! ہندستانی نے اردو کے آئینہ میں پہلی بار جمہوریت کی تصویر دیکھی۔

○ غزل کی اہمیت کا انحصار اب اس پر نہیں ہے کہ کبھی اس میں عشق و شباب کی باتیں کی جاتی تھیں یا اس کے وسیلے سے عورتوں سے گفتگو کی گئی یا کی جاتی ہے۔ اس کا احترام اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس سے گفتگو کرنی آجاتی ہے۔

○ غزل میں ہمارے یہاں بے راہ روی ملتی ہے، ہر طرح کی بے راہ روی ادبی مجھ کر بے راہ روی! یہ غزل کا قصور نہیں ہے۔ یہ اس راہ رو کا قصور ہے جو اپنی کم نگہی یا کم ظرفی سے رہ گزر کے فریب کو منزلِ مقصود سمجھ لیتا ہے۔ ادنیٰ درجے کے لوگوں نے زندگی کی بڑی قدروں کا اس طرح بے حرمتی کی ہے!

○ غزل کی نہم میں جبری بھرتی ممنوع ہے ؛ پروپیگنڈا بھی نہیں کرسکتے۔ بہ الفاظ دیگر غزل کے صحیفہ میں "دو غزلہ"، "سہ غزلہ"، شعبدے، بیتیں، "او باشی"، "نخرہ زنی"، تو بہ استغفار ممنوع ہے۔ 'ستارہ می شکنند آفتاب می سازند' کا عمل خراب سے کہیں زیادہ غزل کے ہر شعر پر کرنا پڑتا ہے۔ غزل صنفِ سخن ہی نہیں معیار سخن بھی ہے!

○ غزل میں اس کی آزادی ہے کہ آپ جو بحر، ردیف، قافیہ، مواد، موضوع، لب و لہجہ چاہیں اختیار کریں جیسا کہ بیشتر شعراء کرتے آئے ہیں۔ البتہ وہ اس نکتہ سے بےخبر رہے کہ جہاں آزادی دی جاتی ہے وہاں پابندی خود بخود عائد ہو جاتی ہے، جس کو نظرانداز کرنے سے شاعر اور اس کا کلام دونوں پایۂ اعتبار سے گر جاتے ہیں...... شاعر کو اپنی ذہنی کیفیت کے مطابق بحر اختیار کرنی پڑتی ہے۔ ردیف اور قافیہ کی ظاہری اور معنوی ندرت کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ زبان اور لہجہ کیا ہوگا، کس طرف کس حد تک بڑھ سکتے ہیں، بات کتنی ظاہر کی جائے گی، کتنی چھپائی جائے گی، کہاں پردے سے بے پردگی اور کہاں بے پردگی سے پردہ متصور ہوگا، پھر فن، ذوق اور زبان کی تمام خوبیوں کا اظہار "غرض بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست"۔ ان تمام پابندیوں سے وہی شاعر عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو شاعری اور شرافت کے تقاضوں کا احترام کرنا جانتا ہو!

○ اردو نثر و نظم دونوں کا اسلوب اور لہجہ متعین کرنے میں اردو غزل کا بہت بڑا حصہ ہے۔

○ غزل کا ایک قابلِ لحاظ وصف یہ بھی ہے کہ ہم اس کے مطالعہ سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ متاثر، مسرور و مستفید ہوتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ جو باتیں دوسرے اصنافِ سخن میں زیادہ پھیلی ہوئی ہیں غزل میں ان کا خلاصہ یا مرکزی تصور ایک کلیہ کی صورت میں ایک ہی مصرع یا شعر میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اور چونکہ غزل کے اشعار منفرد ہوتے ہیں اس لیے ہر شعر میں نئی بات نئے انداز سے نئے موقع و محل میں کہی ہوئی مل جاتی ہے اور مطالعہ میں تکان نہیں محسوس ہوتی۔ چنانچہ غزل کے جو عیوب بتائے جاتے ہیں اگر در پردہ غزل کے ہنر بھی ہوں تو کیا عجب! ذوقِ سلیم ساتھ دے تو ان نکتے یا لطیفے کو بھی نظر رکھنا چاہیے کہ ایک مربوط نظم کی اہمیت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے غزل کی اس طرفہ ماجرائی کو کیا کہیں گے کہ وہ غزل ہوتے ہوئے ایک طور پر متعدد مربوط نظموں کا مجموعہ ہوتی ہے!

○ اردو غزل کی مقبولیت میں جہاں اور باتیں معین ہوئی ہیں وہاں غزل کی صحیح، سلیس، شیریں، شستہ اور شائستہ زبان بھی ہے۔

○ اردو ہندستان کی مشترک اور صحت مند تہذیب کی کیسی معتبر اور دلکش علامت ہے اور اس نے اس تہذیب کو کس درجہ محکم اور بارآور کیا، اس حدیثِ دلکش پر گفتگو کا یہ محل نہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ زبان ہو، ادب ہو، تہذیب و معاشرت ہو، ان کی توانا اور صحت مند صلاحیتوں اور امکانات کو ان کی تقدیر سے ہمکنار کرنے میں اردو کا بہت بڑا دخل رہا ہے! اور اردو کو ہندستان گیر بنایا غزل نے!!

تین

○ شاعری کا منصب یا فن خوب کو خوب تر بنانا بھی ہے، دکھانا بھی ہے۔ ——— اور کوئی شاعر اس منصب کا اہل نہیں اگر وہ علم سے واقف ہو اور حقیر پر اکتفا کرے! دوسرا سبب اس کی مقبولیت کا یہ ہے کہ اچھی اور اعلیٰ غزل کے پیمانے میں جذبات یا فکر کی صہبا ہوتی ہے، وہ دو آتشہ سہ آتشہ سے بھی زیادہ آتشہ ہوتی ہے جہاں آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے اس صہبا کا طبائع پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔

○ غزل نے ہر موقع کے لیے برمحل اشعار اس کثرت سے فراہم کر دیے ہیں کہ ان کا بے اختیار زبان پر آتے رہنا تعجب کی بات نہیں۔ غزل ضرب الامثال کی دارالضرب ہوتی ہے۔

○ غزل کو مقبول عام بنانے میں مشاعرے، رزم و بزم کی محفلیں، تحریر و تقریر میں برمحل اشعار کا استعمال اور اس طرح کی دوسری تقریبیں بھی بہت زیادہ معین رہی ہیں۔ غالباً کسی اور معاشرے میں اچھے اشعار کی اتنی زبردست طلب محسوس نہ کی جاتی ہوگی جتنی اردو سماج میں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہماری زبان میں متنوع اور متفرق اشعار کی کثرت ہو۔ یہ مطالبہ صرف غزل پورا کر سکتی تھی اور کرتی رہی ہے۔

○ گانے کے لیے اردو غزل سے زیادہ کوئی صنف کلام ہے نہ ہو سکتی ہے، اس لیے کہ غزل کا ہر شعر نوبہ نو احوال و کوائف کا مکمل اظہار کرتا ہے اور مختصر سے مختصر مدت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر و محظوظ کر سکتا ہے۔

○ غزل کہنے میں سہولت یہ ہے، اور اتنی ہی دقت بھی، کہ جو بات کہنی ہوتی ہے مختصر سے مختصر الفاظ میں جلد سے جلد کہہ کر ختم کر دی جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ غزل کا شعر بڑے سے بڑے پیمانے پر بیان کرتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے پیمانے پر رجوع و مکمل کرتے ہیں۔ غزل میں داستان نہیں سناتے، تاثر دکھاتے یا تجربہ بیان کرتے ہیں... غزل میں ہر شعر مختصر ترین اور ساتھ ہی مکمل ترین افسانہ ہوتا ہے۔ اب زندگی کی مصروفیتیں اور مطالبات اتنے سریع اور شدید اور اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ طویل رزمیہ یا بزمیہ لکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔

○ غزل کی اہمیت و مقبولیت کا یہ پہلو قابل لحاظ ہے کہ مرور ایام سے دوسرے اصناف کلام سے کہیں زیادہ غزل کا معیار بدلتا اور بلند ہوتا رہا ہے، یہاں تک کہ کچھ دن پہلے کے اکثر غزل گو اور ان کا کلام اب زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا... اب غزل میں ذہن اور ذوق دونوں کی آسودگی کا مطالبہ کیا جانے لگا ہے۔

اردو غزل اس کو اس طور پر پیدا کر رہی ہے جیسے وہ اس کی نوع و نہاد کا تقاضا ہو... کسی اور صنفِ سخن پر اردو والوں کا اتنا سخت اور متواتر احتساب نہیں رہا جتنا غزل پر۔ یہ اسی نگہداشت کا تصرف ہے کہ غزل میں کہنگی راہ نہ پا سکی۔ جس صنفِ سخن پر اردو سماج کی ایسی کڑی نظر ہو وہ اور اس کے شاعر کبھی معیار سے پست نہیں ہو سکتے۔



ذوق سے آگے بڑھ کے ذہن کی آسودگی کی جو بات رشید صاحب نے اپنے آخری شعر میں کہی ہے اس میں اردو غزل کی عہد بہ عہد کی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے ___ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
جو اس شور سے میر روتا رہے گا ___ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
یہ لوگ بھی غضب کے ہیں دل پر یہ اختیار ___ شب موم کر لیا سحر آہن بنا لیا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام ___ آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا
امیرزادوں سے دلی کے مت ملا کر میر ___ کہ ہم غریب ہوئے ہیں انھیں کی دولت سے

میر (م ۱۸۱۰) کے ان پانچ شعروں میں پانچ واضح ارتقائی سطحیں ملتی ہیں۔ تاہم گفتار راست ہے کوئی ایچ پیچ، گہرا سوچ بچار کرنے اور کرلنے کی جستجو اور اپنے سے الجھنے اور دوسرے کو مزید الجھانے کا کوئی جوکھم نہیں ملتا۔ یہ اٹھارویں صدی عیسوی کی بات تھی۔ انیسویں صدی میں وہ بہت کچھ آگیا جو اس سے پہلے ناپید تھا، ڈاک، تار، ریل کی محسوس علامات کے پیچھے دو تہذیبوں کے ٹکراؤ میں نئی تہذیب کی فتحمندی کا آغاز اور اس کے جلو میں خیالات و افکار کی ایک دنیا! اردو غزل نے بڑھتے ہوئے ذہن کے ساتھ ایک چھلانگ لگائی:

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا ___ واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں
رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو ___ ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب ___ اک آبلہ پا وادیِ پرخار میں آوے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ ___ رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ___ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

پانچ

غالب (م ۱۸۶۹ء) کے ان پانچ اشعار میں پانچ مختلف سطحیں اور سمتیں واضح ہیں اور یہ بات واضح کرتے ہیں کہ شاعر سوچ سوچ کے بات کر رہا ہے مگر سانچوں میں توڑ پھوڑ بالکل نہیں ہے۔

یہ توڑ پھوڑ انیسویں صدی کے آخری ربع میں شروع ہو گئی (جب ہندستان کی پرانی دنیا ختم ہو کے نئی دنیا کو جانشینی بخش چکی تھی) مذہبی، تہذیبی، تعلیمی، معاشرتی اور دوسری سطحوں پر سرسید کی قیادت میں علی گڑھ تحریک جو فکری انقلاب برپا کر رہی تھی ادب اور خصوصاً غزل کو اس کا نقیب حالی کی صورت میں مل رہا تھا۔ حالی کے ہاتھوں اردو غزل کا بوسیدہ سانچہ ڈھلا اس سے اردو غزل کے ایک صدی آگے تک کے امکانات سامنے آگئے:

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دے گی خزاں آکے چمن کس کا ہے
گھبرا گئے ہیں بے دلیِ ہمرہاں سے ہم — اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا — دیکھے ہیں ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا
اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی — بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

غزل کو اتنی وسعت دی جا سکتی ہے کہ اس میں ساتھیوں کی بیدلی سے لیکر وطن کی تباہی تک سب کچھ بیان کیا جا سکے، حالی (م ۱۹۱۴ء) نے یہ اندازہ کرا دیا۔ لیکن غزل کے اسلوب اور اس کی لفظیات کا احترام اب بھی ملحوظ تھا کہ اقبال (م ۱۹۳۸ء) نے غزل پر شب خون مارا اور راتوں رات اس کی لفظیات، اس کا آہنگ، اس کا دروبست سب بدل کر رکھ دیا۔

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا — میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک — جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں
اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا — زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر — تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

کلاسیکی غزل واضح طور سے پہلی بار اپنی ڈگر بدل رہی تھی۔ لیکن یہ نیا سانچہ صرف اقبال سے مخصوص رہا اور اسی پر ختم ہو گیا۔

اگلا دھماکا یگانہ (م ۱۹۵۶ء) نے کیا۔

ارے کیسی سزا کہاں کی سزا — پچھتاتا تو کام کیا کرتا

مشکل تو اک دن آسان ہوگی — یہ کون جانے دم پر بنی کیا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے — اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے — وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا — دلیل راہ محبت ہے فیصلہ دل کا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا — مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہو — کس قدر واعظ مکار ڈراتا ہے مجھے

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا — چال سے تو ظالم کی سادگی برستی ہے

مزاج آپ کا دنیا سے کچھ کشیدہ سہی — فریب کھاؤ گے پھر بھی فریب دیدہ سہی
خدا کی بات خدا جانے کوئی کیا جانے — پڑھا ہے میں نے بھی قرآن چیدہ چیدہ سہی
ہوا جو بگڑی تو ٹھنڈا ہی کر کے چھوڑے گی — ہزار شعلہ بیباک سرکشیدہ سہی
مری نظر کی خطا ہوگی یا گلوں کی خطا — تمہارے راج میں کانٹے ہی برگزیدہ سہی
نکل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھا کر — تو بندگان ضرورت کا آفریدہ سہی

اگلا شدید تر دھماکا شاد عارفی (م ۱۹۶۴ء) کے ہاتھوں ہوا۔ شاد عارفی نے (یگانہ کے ساتھ مل کر جدید غزل کے ایوان کے نقش و نگار واضح طور سے ابھار دیے۔ (اب غزل جدید میں ڈھلنے کے لئے پوری طرح آمادہ ہو چکی تھی):

ہے تو احمق چونکہ عالیشان کاشانے میں ہے — اس لئے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے

تمہیں جس حال میں سجدہ کیا ہے — اسے اللہ بہتر جانتا ہے

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے — کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں
جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی — چوم لوں منھ آپ کی تلوار کا
چھا گیا ہو جیسے رعب اقتدار برہمنی — شیخ کو کس درجہ دلچسپی صنم خانے میں ہے

شاد ضعیف العمر ہے لیکن اس کے شعر جواں ہوتے ہیں — ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں
کوئی نہیں کہہ سکتا کانٹے بھی پامال خزاں ہوتے ہیں — ان کے نام و نشاں ملتے ہیں جن کے نام و نشاں ہوتے ہیں

کیا تھا کیوں تھا یہ نت سوچو کیا ہے اس پر غور کرو — شاخوں پر آنے سے پہلے ہوں گے پھول جہاں ہوتے ہیں
چند بڑے لوگوں سے مل کر میں نے یہ محسوس کیا ہے — اپنی بابت نااہلوں کو کیا دلچسپ گماں ہوتے ہیں

یگانہ اور شاد کے عہد میں اور لوگ بھی اکا دکا ایسے شعر کہہ جاتے تھے جن پر آنے والے دور کی پرچھائیاں پڑتی لگتی تھیں۔ مثلاً

قابل اجمیری

رکا رکا سا تبسم، جھکی جھکی سی نظر — تمہیں سلیقۂ بیگانگی کہاں ہے ابھی
راستہ ہے کہ کٹتا جاتا ہے — فاصلہ ہے کہ کم نہیں ہوتا
وقت کرتا ہے پرورش برسوں — حادثہ ایک دم نہیں ہوتا
آداب تری بزم کے جینے نہیں دیتے — دیوانوں کو جینے کی تمنا تو بڑی ہے
دل رسم و رہِ شوق سے مانوس تو ہو لے — تکمیل تمنا کے لئے عمر پڑی ہے

مجید امجد

جب اک چراغ راہ گزر کی کرن پڑے — ہونٹوں کی لو لطیف حجابوں سے چھن پڑے
پھر کس حسین دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی — ہر موجۂ خیال پہ صد ہا شکن پڑے
اک پل بھی کنج دل میں نہ ٹھہرا وہ رہ نورد — اب جس کے نقش پا میں چمن در چمن پڑے
اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ — میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے
میں جب ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے — میں جب ادھر سے نہ گزروں گا، کون دیکھے گا

باقی صدیقی

زندگی دل کا سکوں چاہتی ہے — رونق شہر سبا کیا دیکھیں
ہر ایک آدمی اڑتا ہوا بگولا تھا — تمہارے شہر میں ہم کس سے گفتگو کرتے

ذوالفقار بخاری

بیشتر خدا پایا اور بر ملا پایا — ہم نے تیرے بندوں کو تجھ سے بھی سوا پایا
مہر و ماہ و انجم کی بے نیازیاں توبہ — دوست ہو کہ دشمن ہو آدمی غنیمت ہے

فرق ہے رات رات میں پیارے   رات کسی کی بسر نہیں ہوتی

غیب کی ودیعت عشق، عشق کی عنایت غم   غم ہزار نعمت ہے کوئی غم کو کیا جانے

بزم میں تو ہم دونوں اجنبی سے رہتے ہیں   کوئی تم کو کیا جانے کوئی ہم کو کیا جانے

نشور واحدی

تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں   اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا

جمیل مظہری

یہ تیری آگ یوں بجھا نہ جاتی میرے سینے میں   اگر اس آگ کو بھی تاپنے والے نہ ہوتے

موت طاری ہوئی ہر شوق پہ رفتہ رفتہ   تجھ پہ مرنے کے جو ارمان تھے وہ بھی تو جیے

دیر میں وہ حرم میں نہ، عرش پہ وہ زمیں پہ وہ   جس کی پہنچ جہاں تلک اس کے لئے وہیں پہ وہ

آذری بھی حیران ہے اس صنم تراشی پر   سو بتوں کو جوڑا ہے اک خدا بنایا ہے

وہیں تک خودی ہے زمیں کے خدا ہے   جہاں بیکسی ڈھونڈتی ہے سہارا

حرم کو بھی بتکدہ سمجھتا ہے دوسری منزل ارتقا کی   وہ پہلا زینہ شعور کا تھا کہ بتکدے کو حرم بنایا

اجتبیٰ رضوی

جو ساری پونجی ہار چلا وہ عشق کی بازی ہار چلا   اس کھیل کا ریت انوکھی ہے تم نے یہی جو سمجھتے ہیں

حمد- کعبہ آپ نے ہی بدنام کلیسا آپ ہوئے   طور پہ بجلی قیس میں شیریں نجد میں لیلیٰ آپ ہوئے

فتنے جگا کے دہر میں، آگ لگا کے شہر میں   جا کے الگ کھڑے ہوئے کہنے لگے کہ ہم نہیں

ہری چند اختر

نویدِ سربلندی دی منجم نے تو میں سمجھا   سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

حفیظ ہوشیارپوری

تو نے اسے تعبیر کیا عشق سے ورنہ   کس کے لیے اے دوست پریشاں نہ ہوئے ہم

آبادیٔ دل کی ہے فقط ایک ہی صورت   بربادیٔ دل کے لیے سامان ہزاروں

نہ اب وہ ذوقِ طلب ہے نہ اب وہ عزمِ سفر   رواں ہے قافلہ تسکینِ راہبر کے لیے

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا   اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

محشر بدایونی

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ — جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائیگا

شاہد عشقی

اک زمانے کو رکھا تیرے تعلق سے عزیز — سلسلہ دل کا بہت دور تلک جاتا ہے

ضیاء جالندھری

میں کہاں پہنچا کہ ہر بت جسے پوجا میں نے — ہے شکستہ سرِ خاک اور میں شکستہ تر ہوں



یگانہ، اور شاد عارفی میں شاعرانہ عمر کا جو فرق تھا، شاد اور احمد ندیم قاسمی میں بھی قریب قریب اتنا ہی فرق رہا ہوگا۔ اردو غزل کی اس نئی روایت کو آگے بڑھانے میں اگلا بڑا رول ندیم کا ہے۔ ندیم کی اہمیت یہ ہے کہ بہتوں کے لیے یگانہ و شاد کی مانند وہ خاموش انسپریشن بنتے گئے؛ لیکن بہت سے دوسروں کے لیے جو اس خاموش انسپریشن کے اہل نہ تھے، وہ ایک تحریک میں ڈھلتے چلے گئے۔ ایسی تحریک جو نئی غزل کو ایک بہتر ڈگر پر ڈالتی تھی، اور نیشن اور فضول گوئی سے باز بھی رکھتی تھی؛ جس میں، ان کے بقول وسیع المشربی بھی تھی اور عالی حوصلگی!

ندیم کے ساتھ ساتھ فیض کی آواز بھی ابھر کر آہستہ روی مگر بڑی مضبوطی کے ساتھ نئے اردو شعر کی سب سے گراں ارز آواز بن چکی تھی۔ اقبال کے بعد کسی ایک شاعر کا پوری پہچان کے ساتھ نام لیا جا سکتا تھا تو وہ فیض ہی تھے:

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب — وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا — وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
جنھیں خبر تھی کہ شرطِ نواگری کیا ہے — وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے
محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے فیض سے — رند کا، ساقی کا، خم کا، مے کا، پیمانے کا نام

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی — بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے
جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے — مقام ہے اب کوئی نہ منزل فرازِ دار و رسن سے پہلے
آخرِ شب کے ہمسفر فیض نہ جانے کیا ہوئے — رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی
مشکل ہیں اگر حالات وہاں دل بیچ آئیں جاں دے آئیں — دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں
جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں — ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے
ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے — ناصحو، پند گرو، راہ گزر تو دیکھو
پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک — دل والو گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے
تری کج ادائی سے ہار کر شبِ انتظار چلی گئی — مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے
جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے — رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا
ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے — بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی — یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی
مقابلِ صفِ اعدا جسے کیا آغاز — وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

فیض کے یہ شعر بڑے خوبصورت شعر ہیں لیکن اس میں خیال بھی محدود ہے، اور اندازِ سخن میں بھی نہ پھیلاؤ کا کوئی امکان ہے نہ تقلید کا ——— اور ایسی تقلید کا تو مطلق نہیں جس سے اجتہاد کے سوتے پھوٹتے ہوں۔ تقلید ہوئی ضرور، سردار جعفری کی متعدد غزلیں اور تاباں کی غزلیں جو ان دونوں نے غزل کی طرف "واپسی" کے بعد کہیں اکتسابِ فیض کی چغلی کھاتی ہیں لیکن بات آگے نہیں بڑھ سکی۔ ایک شاعر نے البتہ اس رنگ کو اسی خوبصورتی سے اپنایا تھا کہ وہ اسے بہت کچھ نکھار دیتا مگر وہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ مرحوم عرشی بھوپالی کی ۱۹۵۳ء کی یہ غزل فیض کے رنگ میں فیض سے زیادہ خوبصورت غزل ہے:

تختۂ دار محبت کی سزا ٹھہری ہے — جان لینا مرے قاتل کی ادا ٹھہری ہے
ساتھیو کب مرے گلشن کی کھلیں گی کلیاں — مجھے بتاؤ تو کہاں بادِ صبا ٹھہری ہے
راہ دشوار، سحر دور، گھنی شب لیکن — قافلے ٹھہرے نہ قدموں کی صدا ٹھہری ہے
رنگِ گل کا ہے سلیقہ، نہ بہاروں کا شعور — ہائے کن ہاتھوں میں تقدیرِ حنا ٹھہری ہے
میکشو! ڈٹ پڑو چھین لو ساقی سے ایاغ — کب سے میخانے پہ رنگین گھٹا ٹھہری ہے

رازِ صیاد کیا سارے چمن نے افشا — کیا قیامت ہے کہ بلبل کی خطا ٹھہری ہے
کتنے جانباز ہیں حق گوئی کے مجرم لیکن — قابلِ دار فقط تیری ادا ٹھہری ہے

یہ مقصد زدہ غزل، جو فیض کے ساتھ اور بھی اسی درجے کے شاعر کہہ رہے تھے، بڑی خوبصورت لگتی تھی اور مدت تک باقی رہنے والے شعر اس میں تخلیق ہو رہے تھے:

مخدوم کا یہ شعر: منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے — اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

یا جذبی کے یہ شعر: ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں — جن بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے
تاریک رات اور بھی تاریک ہو گئی — اب آ ملا ہے مرحلۂ روشنی قریب ہے

شریکِ محفلِ دار و رسن کچھ اور بھی ہیں — ستمگرو! ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں
ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار — ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

دانائے غم نہ محرمِ رازِ حیات ہم — دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دلِ کائنات ہم

دل اگر دل ہے تو جس راہ سے جائے گا — دلِ دردمندوں کی وہی راہ گزر بھی ہو گی

عجب تضاد تھا اس شاعری میں اور اس عہد میں، ان کے حسن شناسوں کو یہ شاعری غائب شاعری بھی لگتی تھی اور یہ جبر شاعری بھی لگتی تھی، فیض کے شعر کی طرح یہ بھی امکانات سے خالی تھی!

زندگی کی رنگارنگی اور بھرپور توانائیوں کے ساتھ سارے تجربوں اور احساسات کے ساتھ فکر اور جذبے کے ہر پہلو کی عکاسی کرتے ہوئے غزل کے شعر جس سرچشمے سے فیضان حاصل کر سکتے تھے اور کر رہے تھے وہ نہ اقبال تھا، نہ فیض نہ فراق؛ وہ تو یگانہ اور شاد عارفی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے احمد ندیم قاسمی اور ان کا قبیلہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی کے یہ شعر دیکھئے تو فیض، مخدوم، جذبی —— ان سب سے کتنے مختلف، اور ہزار شیوہ زندگی سے کتنے قریب ہیں:

احمد ندیم قاسمی

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا — میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے — میں ایک گھنا پیڑ سرِ راہگزر ہوں
اک ہمیں کو نہ تجھے اپنا بنانا آیا — انجمن تیری ہے، نے تیری ہے، ساغر تیرے

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں   ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں
آدمی کشمکشِ حیات کا دولہا   وقت کی گردشیں براتی ہیں

خلا کے کام جو آئے خدا بنائے گئے   میں سوچتا ہوں کہ انسان ہی کے کام آئے

ہمہ اضداد ہے تاروں کا جمال   صبح کا نور ہے تاروں کا کفن

میں کب سے گوش بر آواز ہوں پکارو بھی   زمیں پر یہ ستارے کبھی اتارو بھی
یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے   مگر ندیم تم اس بوجھ کو سہارو بھی

ابتلا ابتدائے ذوقِ عمل   یعنی طوفاں اٹھا تو ناؤ چلی

عروسِ زندگانی کا سویمبر رچنے والا ہے   شکارِ حق مشیت کی کماں لچکانے آئے ہیں

چاند جب دور افق میں ڈوبا   تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

سر بچا لائے ہو لیکن یہ زیاں تو دیکھو   کتنا ویران ہے تا حدِ نظر منظرِ دار

ہر لفظ میں ماضی کے کئی گیت گندھے ہیں   تاریخ کی اک گونج ہے گویائی ہماری
جو پھول کھلا اس میں گھلا خون ہمارا   جو جام بجا اس میں کھنک آئی ہماری

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ   گٹھڑیاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی

نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا   حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

ہم گونج ہیں سازِ ارتقا کی   گونجیں گے ابھی زماں زماں ہم

وہ دھندلکا جسے سب تنزل کہتے ہیں   اب تو انساں کی ہے راہ گزر کہتے ہیں

جانے کیوں اب شبِ ہجراں پہ بھی پیار آتا ہے   تیرا غم میری محبت کو کھنگالنے آیا

آدم کی سلگتی ہوئی تاریخ رقم ہے   جبریل کے شہپر سے مرے دامنِ تر تک

اے خدا اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے   تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

فرار کا یہ نیا روپ ہے اگر ہم لوگ   چراغ توڑ کے نورِ قمر کا ذکر کریں

برسوں سے تری طرف رواں ہوں   ہمت ہے تو انتظار کر لے

ہر لمحہ اگر گریز پا ہے   تو کیوں مرے دل میں بس گیا ہے
کچھ کھیل نہیں ہے عشق کرنا   یہ زندگی بھر کا رتجگا ہے

تیرے آگے جو کھڑا ہوں تو کرم ہے تیرا   مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

ہم تجھ سے بگڑ کے جب بھی اُٹھے — پھر تیرے حضور آ گئے ہیں
یکساں ہیں فراق و وصل دونوں — یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں
پا کر بھی تو نیند اُڑ گئی تھی — کھو کر بھی تو رتجگے ہیں

اتنا ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے — جس طرف جایئے زخموں کے لگے ہیں بازار

عمر بھر جلنے کا اتنا حوصلہ پائیں گے ہم — بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم

آپ سے جھک کے جو ملتا ہوگا — اس کا قد آپ سے اونچا ہوگا

جس بھی فنکار کا شہکار ہو تم — اس نے برسوں تمہیں سوچا ہوگا

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے — کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

ندیم جو بھی ملاقات تھی ادھوری تھی — کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے

مسکرا لے جو اس عالم میں — بخدا مجھ کو خدا لگتا ہے



ان اشعار میں راست انداز بھی ہے، آڑا ترچھا بھی! راست کم آڑا ترچھا زیادہ۔

نئی حسیت اپنے قاری کے بالیدہ ذہن پر زیادہ اعتبار کرتی ہے۔ راست اندازِ بیان کے بجائے آڑے ترچھے کچھ کہہ کر نکل جاتی ہے۔ کچھ یہ بھی ہے کہ تجربہ اب اتنا سادہ نہیں رہا کہ دو اور دو چار میں سمٹ جائے۔ فکر اور جذبے کی اتنی سمتیں ہیں جتنے انسان؛ اور انسان کے اندر خود اتنی دنیائیں آباد ہیں کہاں کا اپنا ہی کوئی اور چھور نہیں۔ تجربے کی اس بے پناہی نے غزل کی روایتی لفظیات کی ہیئت ہی بدل کے رکھ دی ہے۔

ان اشعار میں راست انداز بھی ہے اور آڑا ترچھا بھی۔ اور جب میں جدید ترین اردو شاعری کے کچھ نمائندہ اشعار آپ کو سناؤں گا، تو احمد ندیم کو سننا لینے کے بعد اب آپ ان اشعار سے نہ بدکیں گے نہ اجنبیت محسوس کریں گے، بلکہ بڑی رسانیت سے ان کی گرفت میں آتے چلے جائیں گے۔

پہلے ایسے چند غزل گویوں کو سنیں جو ندیم کے معاصر ہیں:

مختار صدیقی

میں تو ہر دھوپ میں سایوں کا رہا ہوں جویا — مجھ سے لکھوائی سرابوں کی کہانی تم نے

کیا کیا ایکاری سسکتی دیکھیں لفظوں کے زندانوں میں — چپ ہی کی تلقین کرے ہے غیرت مند ضمیر ہمیں

شیر افضل جعفری

اس کو اپنی ذات خدا کی ذات لگی ہے میرے دل کو پاگل کی یہ بات لگی ہے
میں انساں کو موت کا دولہا کہہ دیتا ہوں ___ مجھ کو ماتم کی ڈولی بارات لگی ہے
بجلیاں پی کے جو اڑ جاتے ہیں وہ قیامت سے بھی لڑ جاتے ہیں
قلب انساں کی جواں حدت سے ___ آگ پر آبلے پڑ جاتے ہیں

سید ضمیر جعفری

زندگی تیرے تقاضے اگر آساں ہوتے ___ کتنے آباد جزیرے ہیں جو ویراں ہوتے
شعلوں کی گفتگو میں صبا کے خرام میں ___ آواز دے رہا ہے کوئی ہمسفر مجھے
ننگے تن سے کاٹی ہم نے تیز دوپہر خزاں کی ___ ہم لفظوں میں رونے والے دھو گئے گرد جہاں کی
رات اندھیری ہے تنگ لیکن اسکو کچھ اجالاؤ ___ جس جس طاق چراغ جلے ہیں انکی لو اکساؤ

خورشید الاسلام

دیکھا انہیں قریب سے ہم نے تو رو دیے ___ جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم
کچھ تو ہو جس کے فیض سے دل کو ہو تاب و تب بہم ___ کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم
یہ کیفیت ہے تشنہ طوالت کچھ آگے ___ گزرا ہے خلد تماشا دماغ سوز جحیم
جن سے دلِ مایوس میں گرمی کی رمق تھی ___ وہ لوگ بھی جب دل سے اتر جائیں تو کیا ہو
قہر یزید و قہر خدا، سب کو مرحبا ___ ہم کو تو اپنا شوق شہادت عزیز ہے
میں آپ کم رہا قامت سے اپنی ساری عمر کسی کی بخشی کو میری کمی نے کب دیکھا

خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ جاں نثار اختر کی نئی غزل ہے۔ یہ روایتی ترقی پسند شاعر تھے یا پھر فلمی شاعری کرتے تھے۔ لیکن بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کی غزل کا ساتھ انھوں نے کچھ اس طور سے نبھا دیا کہ نئی غزل انھیں بآسانی اپنے اکابر میں شمار کرسکی۔

جاں نثار اختر

زندگی ڈوب گئی درد کے طوفانوں میں چند یادوں کے سوا کچھ نہ بچا کچھ نہ رہا

یہ کیا ہے کہ بڑھتے چلو بڑھتے چلو آگے — جب بیٹھ کے سوچیں گے تو کچھ بات بنے گی
سوچو تو بڑی چیز ہے تہذیب بدن کی — ورنہ تو بدن آگ بجھانے کے لیے ہے
وہ لوگ جو دیوانۂ آداب وفا تھے — اس دور میں تو ان کی کہاں بات کرے ہے
ساری دنیا میں غریبوں کا لہو بہتا ہے — ہر زمیں مجھ کو مرے خون سے تر لگتی ہے
شکستہ میز پہ رکھی ہوئی یہ بند گھڑی — نہ جانے کیوں مری ہر بات کا جواب لگے
ذرا سی بات پہ ہر رسم توڑ آیا تھا — دل تباہ نے بھی کیا مزاج پایا تھا
آپ اپنے کو بھلانا کوئی آسان نہیں — بڑی مشکل سے یہاں بے خودی آئے ہے
کچھ سمجھ کر ہی خدا تجھ کو کہا ہے ورنہ — کون سی بات کہی اتنے یقیں سے ہم نے
جتنے وعدے کل تھے اتنے آج بھی موجود ہیں — ان کے وعدوں میں ہوئی ہے کچھ کمی یہ مت کہو
فاصلہ چند قدم کا ہے منالیں چل کر — صبح آئی ہے مگر دور کھڑی ہے یارو
وہ تند وقت کی رو ہے کہ پاؤں ٹک نہ سکیں — ہر آدمی کوئی اکھڑا ہوا شجر سا لگے
اجڑی اجڑی ہوئی ہر آس لگے — زندگی رام کا بن باس لگے
فرصت کار فقط چار گھڑی ہے یارو — یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو
آج بھی جیسے شانے پر تم ہاتھ مرے رکھ دیتی ہو — چلتے چلتے رک جاتا ہوں ساڑی کی دوکانوں پر
سستے داموں لے تو آتے لیکن دل تھا بھر آیا — جانے کس کا نام کھدا تھا پیتل کے گلدانوں پر
شہر کے تپتے فٹ پاتھوں پر گاؤں کے موسم ساتھ چلیں — بوڑھے برگد ہاتھ سا رکھ دیں میرے جلتے شانوں پر
ہم سب سے پہلے قتل ہوئے تم گواہ ہو — مرنے پہ دوسروں کو اچھالا گئے یہ نہیں
نہ کوئی خواب نہ کوئی خلش نہ کوئی خمار — یہ آدمی تو ادھورا دکھائی دیتا ہے
آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹوں سے چبھیں گے — یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لیے ہے
اب یہ نیکی بھی ہمیں جرم نظر آتی ہے — سب کے عیبوں کو چھپایا ہے بہت دن ہم نے
وطن سے عشق غریبی سے بیر امن سے پیار — سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں
سمجھ سکے نہ سمجھ زندگی کی الجھن کو — سوال اتنے نہیں ہیں جواب جتنے ہیں
اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں — جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں __ تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

تو نہ اب آئے تو کیا، آج تلک آتی ہے __ سیڑھیوں پر ترے قدموں کی صدا رات گئے

یہ لفظ ترے جسم کی خوشبو میں ڈھلا ہے __ یہ طرز یہ اندازِ سخن ہم سے چلا ہے

انقلابوں کی گھڑی ہے __ ہر نہیں ہاں سے بڑی ہے

کس عقیدے کی دہائی دیجئے __ ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے

زندگی تنہا سفر کی بات ہے __ اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے

میں سوچتا تھا وطن جا کے پھر ہوں گا کبھی __ مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں

دیکھوں ترے ہاتھوں کو تو لگتا ہے ترے ہاتھ __ مندر میں فقط دیپ جلانے کے لیے ہے

اور اب ندیم (اور جاں نثار اختر) کے بعد آنے والوں کو سنئے :-

منیر نیازی

مجھ کو تو عنایت ہے نہ سمجھو تو عنایت __ جو چیز ہے جیسی کہ ہے سجا کچھ نہیں رکھا

رکھنے میں نہ رکھنے میں نہ تھا فرق کچھ ایسا __ اس نے جسے معلوم ہوا کچھ نہیں رکھا

یہ خواب بھی کیا کم ہے کہ سب خواب ہے جیسے __ تعبیر نے پہلے سے بتا کچھ نہیں رکھا

احمد فراز

وہ سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی __ یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم __ تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا غم نہیں __ پر جی یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں __ جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا __ دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر __ کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

شکیب جلالی

آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے __ جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں __ جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

کیا ہوا ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی تھی   کیوں مجھے ڈھال بنانے کو یہ چھتنار گرے
وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے   کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے
کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرہ ہے   سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے   مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے
نہ اتنی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو   شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے
برا نہ مانیے لوگوں کی عیب جوئی کا   انہیں تو دن کا بھی سایا دکھائی دیتا ہے
یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے   تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے
وہیں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اپنے   وہ دور کوئی جزیرہ دکھائی دیتا ہے
وہ الوداع کا منظر وہ بھیگتی پلکیں   پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے
مری نگاہ سے چھپ کر کہاں رہے گا کوئی   کہ اب تو سنگ بھی شیشہ دکھائی دیتا ہے
سمٹ کے رہ گئے آخر پہاڑ سے قد بھی   زمیں سے ہر کوئی اونچا دکھائی دیتا ہے

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح   دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

عالم میں جس کی دھوم تھی اس شاہکار پر   دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

اتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا   زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور   رستے میں جو کھڑا تھا وہ کہسار ہٹ گیا

آکر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر   تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

کیوں رو رہے ہو راہ کے اندھے چراغ کو   کیا بجھ گیا ہوا سے لہو کا شرار بھی

شہزاد احمد

ملتی نہیں کسی سے بھی تربت کی منزلیں   گر کھو گیا ہو تو تجھے ڈھونڈ لائیں ہم

تنہائیوں میں کوئی در آیا تو کیا ہوا   تھا مدتوں سے دل کا دریچہ کھلا ہوا

خود ہی مل بیٹھے ہو یہ کیسی شناسائی ہوئی   دشت میں پہنچے نہ گھر چھوڑا نہ رسوائی ہوئی

تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں جا برسا   تپتے صحراؤں پہ گرجا سرِ دریا برسا

آخر کار ہوئے تیری رضا کے پابند
ہم کہ ہر بات پہ اصرار کیا کرتے تھے

اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں
لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے

اب تو شہزادو ستاروں پہ لگی ہیں آنکھیں
کبھی ہم لوگ بھی مٹی میں جیا کرتے تھے

کل تھی یہ فکر اسے حال سنائیں کیوں کر
آج یہ سوچتے ہیں اس کو سنا کیوں آئے

جس کو جانا ہی نہیں، اس کو خدا کیوں مانیں
اور جسے جان چکے ہیں وہ خدا کیسے ہو

خلیل الرحمٰن اعظمی

ہجر تو ہجر تھا اب دیکھیے کیا بیتے گی
اس کی قربت میں کئی درد نئے اور بھی ہیں

رات تو خیر کسی طرح سے کٹ جائیگی
رات کے بعد کئی کوس کڑے اور بھی ہیں

سوتے سوتے چونک اٹھے ہم خواب میں ہم نے کیا دیکھا
جو خود ہم کو ڈھونڈ رہا ہو ایسا اک رستا دیکھا

سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی
جب مٹی کی کھوج میں نکلے سونا ہی سونا دیکھا

آج ہمیں خود اپنے اشکوں کی قیمت معلوم ہوئی
اپنی چتا میں اپنے آپ کو ہم نے جب جلتا دیکھا

چاندی کے سے جن کے بدن تھے سورج کے سے مکھڑے تھے
کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے ان کا بھی سایا دیکھا

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

ہر شمع سے لپٹی ہوئی زنجیر دھوئیں کی
اس دور میں یہ تیرگی ہر اک پہ گزری ہے

بارہا سوچا کہ اے کاش نہ آنکھیں ہوتیں
بارہا سامنے آنکھوں کے وہ منظر آیا

شاذ تمکنت

اس کا ہونا بھی بھری بزم میں ہے وجہِ سکون
کچھ نہ بولے بھی تو وہ میرا طرفدار لگے

کسی خوبی کا تصور ہی نہیں تھا تیرے بغیر
حسن جس جا نظر آیا ترا کردار لگے

ظفر اقبال

اپنے سوئے ہوئے سورج کی خبر لے جا کر
اس کمیں گاہ میں کرنوں کو پکڑتا کیا ہے

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار مری

یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

محبوب خزاں

سادہ کاری کئی پرت کئی رنگ — سادگی اک ازلی سادہ نہیں
ایک محبت کافی ہے — باقی عمر اضافی ہے

سلیم احمد

گونگی ہے ازل سے جو حقیقت — میں اس کو زبان دے رہا ہوں
جو فصل ابھی کٹی نہیں ہے — میں اس کا لگان دے رہا ہوں
یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں — سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں
اتنی کاوش بھی نہ کر میری اسیری کے لیے — تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

سلیمان اریب

ایک حمام میں تبدیل ہوئی ہے دنیا — سب ہی ننگے ہیں کسے دیکھ کے شرماؤں میں
ایک بار کی شہرت ساری عمر چلتی ہے — ہم پیوں جو پانی بھی لوگ رم سمجھتے ہیں

شاہد صدیقی

ہم ہیں خالقِ نغمہ لاؤ ساز ہم کو دو — گیت چھیڑ بیٹھے ہو اور گا نہیں سکتے

خورشید احمد جامی

آہٹ ہے نہ غم ہے نہ کوئی چیخ ہے جامی — اس سناٹے نے اس رات کو مصلوب کیا ہے
قبروں پہ لگائے ہوئے کتبے تو نہیں ہیں — ہر شخص پہ کیوں ایک سی تحریر لکھی ہے
جلتا ہے ایک ذہن مہکتا ہے ایک پھول — روزِ ازل سے ہے یہی تخلیق کا اصول

وحید اختر

ہے نرک کے شعلوں میں جہنم کی عقوبت — دنیا میں بھی جنت ہے اگر سر پہ خلا ہے

حسن نعیم

آبسے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں — بام و در پر ہے مگر نام اسی کا لکھا
موجِ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم — وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا
کوئی جدت تو کوئی حسنِ غزل سمجھا — مرثیہ جب بھی کوئی اپنی صدی کا لکھا

بات شیریں سی لگی فن کے طرفداروں کو — قصۂ ہر چند حسنؔ کوہ کنی کا لکھا
میں اسی درخت سے کمتر ہوں مرتے میں حسنؔ — جو دھوپ سہ کے مسافر کو پیار دیتا ہے
بام خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح — خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے
یہ کشتیاں، یہ ہوائیں، یہ بادبانیں، یہ صبح — افق کے پار کوئی اور ہی آتا ہے گا
وہ لوٹ آئے تو اس کی بھی کچھ انا رکھیو — فصیل قلب کا دروازہ تم کھلا رکھیو
ہائے ہائے کر رہے ہیں زر کی خاطر صوفیا — خانقہ کی اس فضا میں ہاؤ ہو ممکن نہیں
سر پہ رکھ دیتا وہ اک تاج تو ملتے جلتے — کم نہیں اس کا کرم خاک بسر رہنے دیا
مدت ہوئی غزلوں سے گیا شورِ گلستاں — اب حرفِ غزل نوکِ سناں موجِ خوں ہے
کیسی کالی رات بیتی کیسا کالا دن چڑھا — جو بگولوں سے لڑا تھا وہ صبا سے ڈر گیا
کھڑا ہوا ہوں مثالِ گیاہ طوفاں میں — کوئی درخت نہیں ہوں جو وہ گرا دے گا
ایک کوہ سربلند پہ تنہا کھلا جو پھول — سورج سے وہ نہ آنکھ لڑائے تو کیا کرے

ساقی فاروقی

مٹ جائے گا سحر تمہاری آنکھوں کا — اپنے پاس بلا لے گی دنیا اک دن
ایک چہرہ تھا کہ اب یاد نہیں آتا ہے — ایک لمحہ تھا کہ وہ جان کا بیری نکلا
وہ دکھ جو سوئے ہوئے ہیں انہیں جگا دوں گا — میں آنسوؤں سے ہمیشہ ترا پتا دوں گا
ہوا ہے تیز مگر اپنا دل نہ میلا کر — میں اس ہوا میں تجھے دور تک صدا دوں گا
مری صدا پہ نہ برسیں اگر تری آنکھیں — تو حرف و صوت کے سارے دیے بجھا دوں گا
جو اہلِ ہجر میں ہوتی ہے ایک دید کی رسم — تری تلاش میں وہ رسم بھی اٹھا دوں گا
وہ ایک لمحہ جسے کھو دیا محبت میں — اسے تلاش کروں گا تجھے بھلا دوں گا
وہ لفظ ہاتھ نے لکھے ہیں جو نہ لکھنے تھے — میں اس خطا پہ اسے عمر بھر سزا دوں گا
اب مگر ہمیں گھر کی تمنا بھی نہیں ہے — مدت ہوئی سوچا تھا کہ گھر جائیں گے اک دن
جینے کا حوصلہ ہو تو زنداں کی ساری عمر — مقتل کی ایک رات پہ قربان کیجیے
ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں — ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی

سارے موتی جھوٹے نکلے سارے جادو ٹوٹے ___ میری خالی آنکھو! بولو اب کیا خواب دکھاؤں

اطہر نفیس

مثلِ بادِ صبا تیرے کوچے میں اے جانِ جاں آئے ہیں ___ چند ساعت رہیں گے چلے جائیں گے سرگراں آئے ہیں
دروازہ کھلا ہے کہ کوئی لوٹ نہ جائے ___ اور اس کے لیے جو کبھی آیا نہ گیا ہو
ایک سفر ہے وادیٔ جاں میں تیرے دردِ ہجر کے ساتھ ___ ترا دردِ ہجر جو بڑھ کر لذتِ کیفِ وصال ہوا
عشق فسانہ تھا جب تک اپنے بھی بہت افسانے تھے ___ عشق صداقت ہوتے ہوتے کتنا کم احوال ہوا
پھر مرے سر سے ٹلی مہرباں سورج کی دھوپ ___ پھر تری یادوں کا مجھ پر دور تک سایہ ہوا
عشق کرنا جو سیکھا، تو دنیا برتنے کا فن آ گیا ___ کاروبارِ جنوں آ گیا ہے تو کارِ جہاں آ گئے ہیں
بے نیازانہ ہر اک راہ سے گزرا بھی کرو ___ شوقِ نظارہ جو ٹھہرائے تو ٹھہرا بھی کرو
اتنے شائستۂ آدابِ محبت نہ بنو ___ شکوہ آتا ہے اگر لب پہ تو شکوہ بھی کرو
وہ نظر آج بھی کم معنیِ بیگانہ سہی ___ اس کو سمجھا بھی کرو اس پہ بھروسا بھی کرو
جسم و جاں تک یہ آگ آ پہنچی ___ دلِ سوزاں کو اب سنبھالو کچھ
راکھ ہونے میں کیا ملے گا ہمیں ___ ہاں اسی آگ سے بنا لو کچھ
خود اپنی دعاؤں پہ بھی اغراض کے پرتو ___ پرچھائیں کی صورت ہی سہی آتے تو رہے ہیں
وہ دورِ قریب آ رہا ہے ___ جب دادِ ہنر نہ مل سکے گی
اس شب کا نزول ہو رہا ہے ___ جس شب کی سحر نہ مل سکے گی
آساں بھی نہ ہوگا گھر میں رہنا ___ توفیقِ سفر نہ مل سکے گی
خنجر سی زباں کا زخم کھا کر ___ مرہم سی نظر نہ مل سکے گی

سجاد باقر

تو کون تھا کیا تھا کہ برس گزرے پہ اب بھی ___ محسوس یہ ہوتا ہے رگِ جاں کی طرح تھا
سوئے تو ہم آغوش رہے ہم ترے غم سے ___ جاگے تو حریفِ غمِ دنیا نظر آئے
نکہت تھی ڈھلی نور میں کیا اس کا بیاں ہو ___ پوچھو تو خدا! ہاتھ لگاؤں تو صنم ہے

جون ایلیا

وفا، اخلاص، قربانی، محبت — اب ان لفظوں کا پیچھا کیوں کریں ہم
ہیں باشندے اسی بستی کے ہم بھی — سو خود پر اب بھروسہ کیوں کریں ہم
کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے — تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم
زلیخائے عزیزاں بات یہ ہے — بھلا گھاٹے کا سودا کیوں کریں ہم
نہیں دنیا کو جب پروا ہماری — تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم
کوئی سکھ ہم سے کیوں پہنچے کسی کو — کسی کا نام اونچا کیوں کریں ہم
جو اس نسل فرومایہ کو پہنچے — وہ سرمایہ اکٹھا کیوں کریں ہم
کسی کو ہم نہ دے سکتے ہیں جب زہر — تو پھر اس کا مداوا کیوں کریں ہم
برہنہ ہیں سر بازار تو کیا — بھلا اندھوں سے پردا کیوں کریں ہم

ہے بس اب عادتوں کی خانہ پری — روح شامل نہیں شکایت میں
کون سمجھے کرے غرض جذبے — کتنے اچھے ہیں اپنی فطرت میں

جانے کہاں گیا وہ، وہ جو ابھی یہاں تھا؟ — وہ جو ابھی یہاں تھا وہ کون تھا، کہاں تھا؟
اب جس کی دید کا ہے سودا ہمارے سر میں — وہ اپنی ہی نظر میں اپنا ہی اک سماں تھا
عمریں گزر گئی تھیں ہم کو یقیں سے بچھڑے — اور لمحہ اک گماں کا صدیوں میں بے اماں تھا

انہی باتوں کا دل خوگر ہے اب بھی — کبھی روٹھا کرو تم بے سبب بھی
دم گفتار ہم سے انجمن میں — کہا ہوتا کچھ اس نے زیر لب بھی
بنا اُس کے ہی گزاری عمر ساری — کبھی تو مجھ کو ہوتا ہے عجب بھی

احمد مشتاق

کون بتلائے گا کتنی دستکیں باقی ہیں اور — تیرا دروازہ کھلے گا کتنے دروازوں کے بعد
جانے کس کس سے ملیں ہم تجھ سے ملنے کے لیے — پھر تری آواز آئے کتنی آوازوں کے بعد

جیسے ہر شے ہو کسی خواب فراموش میں گم — چاند چمکا نہ تری یاد نے بدلا پہلو
جھلملاتے رہے وہ خواب جو پورے نہ ہوئے — درد بیدار ٹپکتا رہا آنسو آنسو

دونوں ہی تو پیچھے تھے الزام کسے دیتے
کانوں نے کہا صحرا آنکھوں نے سنا پانی

جب شام اترتی ہے کیا دل پہ گزرتی ہے
ساحل نے بہت پوچھا خاموش رہا پانی

تمھارے بعد بہت آندھیاں چلیں پھر بھی
بجھا نہیں مری آنکھوں کے آس پاس کا رنگ

جدا ہوئے تو کئی رنگ تھے خیالوں میں
ملے تو ایک تھا پانی کا رنگ پیاس کا رنگ

خیر بدنام تو پہلے بھی بہت تھے لیکن
تجھ سے ملنا تھا کہ پر لگ گئے رسوائی کو

خلیل رامپوری

آئینہ چمکائے رکھ سب کچھ نظر آجائے گا
جس کی چاہت ہو اسے خود سے جدا سمجھا نہ کر

ہنستے چہروں کی محبت چاہیئے مجھ کو خلیل
جی کہاں سادہ لفافوں سے بہلتا ہے مرا

بادل، پربت، دریا، چشمے، جنگل، صحرا
کیوں بھلتے ہیں میں ان سب کا کیا لگتا ہوں

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمہیں بھلا دیتے

کشور ناہید

وہ اجنبی تھا پھر بھی لگا آشنا مجھے
کس سمت لے چلا ہے نیا حادثہ مجھے

میں گھر کی روشنی ہوں مجھے محفلوں سے کیا
چہروں کے میکدوں میں نہ دینا صدا مجھے

ہماری عمر تو ہے بیل عشق پیچاں کی
ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ ملا

کنوئیں بھی ختم ہوئے پنگھٹوں کا دور گیا
یہی سبب ہے کوئی تہ میں جھانکتا نہ ملا

روا روی میں ہے ہر ایک صحبت پاماں
ملیں سکوں سے تو قصے ترے سنائیں گے

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے ہیں

انور شعور

کوئی وطن ہو وطن کے فداگروں کے خلاف
قلم وروں کے قلم ان اگلتے ہیں

کیا ہے چیز ایک لمحۂ موجود
سو تجھی پر نثار ہوتا ہے

ایسا دیکھا ہے کہ دیکھا ہی نہ ہو
جیسے مجھ کو تری پروا ہی نہ ہو

کہاں کا قصۂ دوزخ کہ اک عمر
میں انسانوں کے نرغے میں رہا ہوں

مجھ کو ایسا بنا گیا کوئی
جیسے مجھ میں سما گیا کوئی

لے انا کی عمارت رنگیں
تیرے مینار ڈھا گیا کوئی

دل سے آوارہ گرد کو آخر
راستہ پر لگا گیا کوئی

سبط علی صبا

دیوار کیا گری مرے کچے مکان کی ___ یاروں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

سلمان اختر

سیکھی نئی زبان وطن سے جدا ہوئے ___ جینے کی دوڑ دھوپ میں ہم کیا سے کیا ہوئے
قبلہ تو پر پڑے تھے دکھاتے تھے ٹھوکریں ___ مندر میں جا کے بیٹھ گئے اور خدا ہوئے

مرتضیٰ برلاس

وقت شبخوں کے لیے لیس ہے ہتھیاروں سے ___ شہر کا شہر ہی سویا ہے جگائیں کس کو

ظفر زیدی

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے ___ جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایہ جائے

رسا چغتائی

تیرے آنے کا انتظار رہا ___ عمر بھر موسم بہار رہا

خالد احمد

اے دوست ترا شہر بھی ہے شہر طلسمات ___ مجھ کو جسے دیکھا وہی پتھر نظر آیا
ہر شخص حقائق کی کڑی دھوپ کے ڈر سے ___ تانے ہوئے اوہام کی چادر نظر آیا

رئیس فروغ

عشق وہ کار مسلسل ہے کہ ہم اپنے لیے ___ ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے
گفتگو ان سے جو کرنا ہے وہ سب از بر ہے ___ بات بس یہ ہے کہ آغاز نہیں کر سکتے
حسن کو حسن بنانے میں مرا ہاتھ بھی ہے ___ آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے
چراغوں کا آغاز وا انجام ہی کیا ___ جلیں بھی ہوا سے بجھیں بھی ہوا سے
دوپہر میں وہ کڑی دھوپ پڑے گی کہ فروغ ___ جس کے چہرے پہ جو غازہ ہے اتر جائے گا
بستی یونہی بیچ میں آئی اصل میں جنگ تو مجھ سے تھی ___ جب تک میرے باغ نہ ڈوبے زور نہ ٹوٹا طوفاں کا

افتخار عارف

اس بار بھی دنیا نے ہدف ہم کو بنایا ___ اس بار تو ہم شہ کے مصاحب بھی نہیں تھے
بیچ آئے سرِ قریۂ زر جوہرِ پندار ___ جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے
مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے ___ وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے
جو شب ہو تو آجائے بھی ترے شہر سے آئیں ___ خواب دیکھوں تو حوالے بھی ترے شہر سے آئیں
تیرے ہی شہر میں سر تن سے جدا ہو جائے ___ خوں بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں
بات تو جب ہے کہ اے گریۂ حرمتِ حرف ___ مدحِ قاتل میں مقالے بھی ترے شہر سے آئیں
پتھر پہ سر رکھ کے سونے والے دیکھے ___ ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے ___ میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے
میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا ___ اجاڑ دے مری مٹی کو دربدر کر دے
وہی پیاس ہے وہی شب ہے وہی گھرانا ہے ___ مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن ___ راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے
خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے ___ نوکِ سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

پروین شاکر

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی ___ میں اپنے ہاتھ سے اسکی دلہن سجاؤں گی
میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی ___ وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دیگا
بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی ___ اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے
چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو ___ ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا
ایسی خالی نسل کے خواب ہی کیا ہوں گے ___ جس کی نیند کا سرچشمہ تک جڑ میں میلا ہے
صدف میں اتروں تو پھر میں گہر بھی بن جاؤں ___ صدف سے پہلے مگر حلقۂ نہنگ میں ہوں
برس سکے تو برس جائے اس گھڑی ورنہ ___ بکھیر ڈالے گی بادل کے سارے خواب ہوا
پورے انسانوں میں گھس آئے ہیں ___ سر کٹے، جسم کٹے، ذات کٹے
کس پیار سے مل رہے ہیں کچھ لوگ ___ چمکیلے بدن میں پھن سمیٹے

چھبیس

ذرا سی کرگسوں کو آب و دانہ کی جو شہ ملی
عقاب سے خطاب کی ادا ہی اور ہو گئی

———

ہزار ٹکڑوں میں بٹ کر بھی اس کا عکس رہا
میں آئینہ تھی بکھرنے پہ اعتماد بھی تھا

———

چراغ مانگتے رہنے کا کچھ سبب بھی نہیں
اندھیرا کیسے بتائیں کہ اب تو شب بھی نہیں

میں اپنے زعم میں اک بازیافت پر خوش ہوں
یہ سانحہ ہے کہ مجھ کو ملال اب بھی نہیں

جو میرے شعر میں مجھ سے زیادہ بولتا ہے
میں اس کی بزم میں اک حرف زیر لب بھی نہیں

یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی میں نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

———

ردا کے ساتھ لٹیرے کو زادِ رہ بھی دیا
تری فراخ دلی میرے ویر ایسی تھی

———

اب کیسی پردہ داری، خبر عام ہو چکی
ماں کی ردا تو، دن ہوئے، نیلام ہو چکی

سورج بھی اس کو ڈھونڈھ کے واپس چلا گیا
اب ہم بھی گھر کو لوٹ چلیں شام ہو چکی

شملے سنبھالتے ہی رہے مصلحت پسند
ہونا تھا جس کو پیار میں بدنام ہو چکی

آنکھیں ہیں اور صبح تلک تیرا انتظار
مشعل بدست شام ترے نام ہو چکی

———

میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ ترے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

لطف کی بات یہ ہے ——— اور یہ اس سے پہلے غالب کے عہد میں بھی، پھر اقبال کے عہد میں بھی ہوتا رہا ہے کہ متوازی دھارے بہتے رہتے ہیں: ایک اپنے زمانے کے ساتھ (یا بعضوں کے بقول "اپنے زمانے سے آگے!")، دوسرا پچھلے زمانے میں ہنوز گم! ——— کہ ندیم ہی کے عہد میں، ایک طرف ندیم اور ان کا قبیل تھا، اور اس کے بالکل متوازی، ہم رنگ کی شعری روایت کو قائم رکھتے ہوئے فراق، روش اور ریگشتی کی ذہین غزل (روایت کے اندر رہ کر بغاوت!) بھی چل رہی تھی، اور، عدم (اور پھر سیف الدین سیف) کی مستانہ غزل بھی (رندانِ باصفا کی نمازیں نہ پوچھیے + سجدے ہیں مست مست دعائیں ہیں مست مست)۔ حتیٰ کہ ندیم کے جونیئر ساتھیوں احمد فراز اور شہزاد احمد کے عہد میں بھی ابن انشا (یا مثلاً ناصر کاظمی) اپنی حسن کاری سے روایتی غزل کو نکھارتے رہے۔

(کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ ترا
ہم بھی وہیں موجود تھے ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیے ہم چپ رہے منظور تھا پردہ ترا)

ان پر مقصدیت کی پرچھائیں تک نہ پڑی تھی۔ اس کے باوجود نئے زمانے کی نئی حسیت، فضا میں موجود تفکر کے ساتھ ہم آمیز ہو کے، خالص تغزل میں بھی نئے رنگ کا رچاؤ لے کے سامنے آئی تھی۔ اس میں جا بجا

محفل کے سوچنے کے پیمانے تھے' اور بے لطفی، بے رنگی (بلکہ بے زمینی بھی!) کہیں نہ تھی۔

روایتی عشقیہ شاعری کا نئے زمانے سے ہم آہنگ نیا روپ آپ نے نئی شاعرہ پروین شاکر کے یہاں دیکھا۔ ایک تجدیدی رنگ ساٹھ سے اوپر کے استاد شاعروں 'فراق' روش اور میکش کے یہاں بھی روایتی غزل کو حیاتِ نو بخشتا رہا، خصوصاً میکش کے یہاں (اگر فراق و روش کے برخلاف 'میکش ۴۰ء کے بعد والے عہد سے زیادہ متعلق ہیں) پروین کے بعد میکش کو پڑھیں، کسی کو ایک دوسرے سے کمتر نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

یہ کائناتِ زمان و مکاں سعی ہی سعی ___ نہ عاشقی مری منزل نہ حسن تیرا مقام

آنکھوں میں نمی دلوں میں یادیں   ہیں صبح کو داستانِ شب ہم
کچھ سمجھا کسی نے کچھ کسی نے ___ ہیں کس کا پیام زیرِ لب ہم

رات کو ان کی خلوت میں خود ان کے سوا کوئی بھی نہ تھا ___ صبح ہوئی تو سب کے لبوں پر میرے ہی افسانے تھے

مرے غم کے لیے اس بزم میں فرصت کہاں پیدا   یہاں تو ہو رہی ہے داستاں سے داستاں پیدا
مری عمریں سمٹ آئی ہیں ان کے ایک لمحے میں   بڑی مدت میں ہوتی ہے یہ عمرِ جاوداں پیدا
وہی ہے ایک مستی سی وہاں نظروں میں یاں دل میں ___ وہی ہے ایک شورش سی وہاں پنہاں یہاں پیدا
یہ اپنا اپنا مسلک ہے، یہ اپنی اپنی فطرت ہے   جلاؤ آشیاں تم ہم کریں گے آشیاں پیدا
ہماری سخت جانی سے ہوا شل ہاتھ قاتل کا ___ سرِ مقتل ہی ہم نے کر لیا دارالاماں پیدا

اب اندھیرا ہی اندھیرا ہے زمانے بھر میں ___ کیا ہوا یہ تری محفل میں چراغاں ہوکر

یہ حال کیا ہے کہ آغوش میں تجھے لیکر ___ تمام عمر ترا انتظار میں نے کیا

اب زمانہ سازی کا یاں دماغ ہے کس کو   ورنہ چاک پیراہن بارہا سیا بھی ہے
ایک رنگ آتا ہے ایک رنگ جاتا ہے ___ جیسے ان کی خلوت میں کوئی دوسرا بھی ہے

جستجو ہے تو مگر یاد نہیں کس کی ہے   ذوقِ رہگیری نے منزل کو کہاں چھوڑ دیا
ڈھائے ہیں تحمل سے محل ظلم کے ہم نے ___ گردن سے سرِ تیغ کو خم ہم نے کیا ہے

میں نہ دیکھوں تو ترے حسن کی قیمت کیا ہے ___ میں نہ تڑپوں تو یہ اندازِ جفا کچھ بھی نہیں
جس کو تم خود بھی نہ سمجھو وہ زباں ہے مانا ___ سب سمجھتے ہوں جسے وہ بھی زباں ہے کہ نہیں
ایمان ہے مرا تری جنت پہ اے خدا ___ لیکن یہ میرے خونِ جگر کا صلہ نہیں

اٹھائیس

اتنے فاصلے سے تو موج بھی ہے دریا بھی
ڈوب کر کوئی دیکھے موج ہے نہ دریا ہے

وہ ابھی ہیں خلوت میں اور محو ہے محفل
انتظار جلوہ بھی جیسے کوئی جلوہ ہے

میرا معبود ہے تو تیرا تجسّس بھی مگر
نہ خدا تجھ کو دکھائے کبھی الفت کا غرور

گرمیٔ سوز محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
بند کر لوں جو میں آنکھیں تو تجلی ہے نہ طور

منت نہ ہوگی، تاہم، کیا چیز ہو گئے تم
ہر شخص سے تواضع، ہر بات پر تبسم

ترا حجاب اٹھانا ہے صرف میرا کام
اگرچہ ہے مری ہستی ترے حجاب کا نام

کبھی سب کچھ تھا لیکن اب تو اتنا ہوش ہے کس کو
یہ دل ہے یا ترا جلوہ، یہ سر ہے یا ترا سودا

بدل دیا تری غفلت نے آرزو کا نظام
یقیں تو کب تھا مگر اب ترے شک بھی گئی

سمجھ کے یہ وہ خوش ہیں تباہ کر کے ہمیں
اور ایک ہم ہیں کہ یہ بات سمجھ کے خوش ہیں

بتکدے والوں کو بھی ہم سے شکایت کیا کیا
اب پڑی سر پہ جا بنے تو خدا یاد آیا

جہاں میں ہوں وہاں تو بھی ہے اے دوست
جہاں تو ہے وہاں کوئی نہیں ہے

ہے میر کارواں ہر اک یہاں پر
کہ میر کارواں کوئی نہیں ہے

نہیں ہے نظم جہاں کا سنوارنا مشکل
ستم یہ ہے کہ دلوں کا نظام برہم ہے

لگا کے دل کسی کافر سے دیکھ لے زاہد
یقین کر کہ محبت ہی اسم اعظم ہے

مری نگاہ نے ہستی کو دی ہے ضو میکشی
میں دیکھ لوں تو یہ موتی ہے ورنہ شبنم ہے

جنگ میں بھی ہیں صلح کے پہلو صلح میں بھی ہیں جنگ کی شانیں
اس جیسے معصوم کو یا رب کس نے سکھائی ہیں یہ گھاتیں

اس کی آنکھیں، اس کی آنکھیں کیسی ہیں اب کیا کہیے
اچھا ٹھہریے سوچنے دیجیے، اسکی آنکھیں! اس کی آنکھیں!!

نفرت جو آدمی سے سکھائے وہ کفر ہے
دین اور زبان کی ہو کہ قوم و وطن کی بات

اک نظر ایک تبسم ہے مسافر کو بہت
چھاؤں کی یاد میں بھی راہ، گزر جائے گی

یہ جہاں ایک نظر اور نظر کچھ بھی نہیں
وہ جہاں صرف خبر اور خبر کچھ بھی نہیں

ان کی خوشبو سے مہکتی مری سانسوں کے سوا
اور اس باغ میں اے باد سحر کچھ بھی نہیں

رات شبنم کی طرح ہو گئی پھولوں میں بسر
اب کیا غم ہے اگر وقت سحر کچھ بھی نہیں

نقش پا بھی تو ڈھونڈتے نہیں راہی کی طرح
منزل عشق بجز راہ گزر کچھ بھی نہیں

یہ جہاں تجھ کو نقطۂ وہم و گماں لگتا ہے مجھ کو ہر ذرّہ یہاں ایک جہاں لگتا ہے
پیچ و خم راہ کا رکھتا ہے پریشان تجھے مجھ کو یہ بھی خمِ گیسوئے بتاں لگتا ہے
راہ کا سنگ ہے اک سنگِ گراں تیرے لیے مجھ کو یہ سنگ بھی منزل کا نشاں لگتا ہے
میری نظروں میں ہے یہ ابرِ بہاری کا سفر تجھ کو چھایا ہوا گلشن پہ دھواں لگتا ہے
روز آ جاتی ہے شب وعدۂ فردا لے کر کتنا اچھا یہ جہانِ گذراں لگتا ہے
چال سے ان کی چمک اٹھتا ہے راہوں کا غبار مجھ کو ہر رستہ یہاں کاہکشاں لگتا ہے
اور کچھ دم مری آغوش میں اے عکسِ شفق تو مجھے نامہ برِ لالہ رخاں لگتا ہے
ایک ہلکا سا تبسم مری راتوں کا چراغ وہ بھی تیرے لبِ نازک کو گراں لگتا ہے
بھر گئی کان میں اس طرح وہ شیریں تلخی اب کسی بات میں دل اپنا کہاں لگتا ہے
دل کی کچھ بات کریں تجھ سے یہاں آ میکش تو مجھے واقفِ اسرارِ جہاں لگتا ہے

معلّم ہوں کہ ناقد، حضرتِ واعظ ہوں یا ناصح نہ سمجھیں خود، مگر اوروں کو تو سمجھاتے جاتے ہیں
خوشی سے بھی وہ دل کانٹوں پہ چلتے ہیں اے میکش یہ پھولوں کی طرح کھلتے ہیں تو مرجھاتے جاتے ہیں

ہے یہ انساں ہی وہ قبلۂ برحق کہ جسے سجدہ کرنے کے لیے دیر و حرم آتے ہیں

خزاں کی تیغ پہ ہے خونِ نسترن باقی ابھی ہے رنگِ چمن نکہتِ چمن باقی
بدل گیا ہے چمن میں مزاجِ لالہ و گل ہے اک تمھی میں تری بوئے پیرہن باقی
ہوا زمانہ کہ رستے ہیں عشق کے ویراں نہ راہبر ہی کو ہے نہ راہزن باقی
نہ بتکدے میں برہمن نہ شیخ کعبے میں مگر ہے معرکۂ شیخ و برہمن باقی

ایک اور متوازی دھارا مجروح، سردار، تاباں (فیض زدگی سے قبل)، مخدوم، کیفی، ساحر اور تازہ تر، حبیب جالب ا) کا تھا، ایک تنہا دھارا، جذبی ـــــ اور ایک اور اکیلی آواز، اختر انصاری (دہلوی):



لیکن جیسا کہ آپ نے دیکھا "ان میں"، کوئی آواز اثر انداز یا رجحان ساز آواز نہیں بن پائی۔ فکر یا جذبہ کا اکہرا پن انھیں سب کو ایک جزیرہ بناتا رہا جہاں ع ملک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے! اکہری شاعری کا زمانہ تیزی سے بیت رہا تھا!!



تاہم یہ کیسی عجیب اور دلچسپ بات ہے کہ اکہرے شاعر اپنی پہچان جس سہولت سے کراتے رہے، راستے سے ہٹ کے چلنے والوں کو اردو قاری نے ابھی تک اس طرح مان کے نہیں دیا ہے۔ شاد عارفی ایک واضح مثال ہیں۔ خود یگانہ کی دریافت ان کے انتقال کے برسوں بعد، اب کہیں جا کے شروع ہوئی ہے۔ احمد ندیم کا احترام سب کرتے ہیں مگر شعر محفلوں میں فیض کے پڑھے جاتے ہیں اور شعری یا افسانوی مجموعوں کے ناموں کے لیے فیض کی تراکیب استعمال ہوتی ہیں۔ قبولیت کی سند اطہر نفیس کو نہیں اطہر نفیس کی ان غزلوں کو ملی جو گائی جا سکیں (یعنی ابن انشا کی سطح سے اوپر نہ ہوں!!)۔ شکیب جلالی کو نہیں احمد فراز (ندیم + فیض + عدم) کو اور ان کے بعد افتخار عارف (ندیم + فیض) کو ملی، پروین شاکر (ندیم کے لہجہ میں محدود عشقیہ شاعری) کو ملی۔ تسلیم شدہ غزلگویوں کی لکیر ابھی تک اپنے معمول سے ہٹی نہیں ہے۔ اقبال، فیض، احمد فراز —— اور اب افتخار عارف و پروین شاکر۔



جاں نثار اختر ختم ہوئے جو احمد ندیم کے ساتھ ساتھ چل کے اردو غزل کو نئی سمتیں دینے لگے تھے۔ شکیب جلالی، اطہر نفیس، ادریس فروغ ختم ہوئے، جدید غزل کو ان سے بڑی امیدیں تھیں۔ بیکش مدت سے بستر علالت پر ہیں (ان کے ہم نفس، روش رخصت ہی ہو لیے) خورشید الاسلام اور شہزاد احمد کچھ تھک سے گئے ہیں۔ ظفر اقبال اپنے فن سے کھلواڑ کرنے لگے (سلیم احمد مرحوم بھی کچھ اسی روش کے اثر آئے تھے)، احمد سرفراز احتجاجی شاعری کی نذر ہوئے، افتخار عارف کربلائی شاعری میں لگے ہیں یا بابے گرو کے ماتم میں حسن نعیم اپنی انا کے شکار ہوئے، پروین شاکر محدود عشقیہ شاعری پر قناعت کر بیٹھی ہیں۔ یہ چاروں اپنے اپنے خول سے نکل آئیں گے، ان کی توانا شاعری سے اس کی پوری توقع کی جا سکتی ہے کہ غزل کو دس بیس سے بڑھ کے ہزار بارہ سو شعر تو دیے جا سکیں۔ ایک احمد ندیم کا شجر پر ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے!) اکیلا کہاں تک چلے گا،

زندگی کی کتنی اداؤں کو سہار سکے گا! بالآخر، ہر عہد کے کچھ نہ کچھ بالکل نئے تقاضے ہوتے ہیں، جنھیں نا لکھ چاہے مگر پچھلے عہد کا زائیدہ اس خوبصورتی سے نہیں پورا کر پاتا، نہیں سمجھ پاتا، جیسے خود اُس عہد کا آدمی!
——— اور عہد کا عالم یہ ہے کہ وہ جو سَو سال میں بدلتا تھا، اس صدی کے نصف آخر میں اوّل اوّل دس دس سال میں بدلنے لگا، اور ۱۹۷۰ء کے بعد تو پانچ پانچ سال بھی پورے کرنے مشکل ہونے لگے۔ ایسے چار مصرعے نے صرف کہنے کے لیے کہا تھا سہ حادثے ہوتے تھے زمانے میں + اس قدر انقلاب کس دن تھا! آج ہوتا تو زبان گنگ ہو جاتی!



صدی کے بچے ہوئے آخری پندرہ برسوں کا آغاز ہو چکا ہے ــ اور آگے کے سارے امکانات بظاہر شاعری کے اسی سلسلۂ نسب سے جڑے نظر آتے ہیں جو شاد عارفی، یگانہ اور احمد ندیم سے چلتا ہے۔ بکری انداز سخن کو سنجیدگی سے اپنانے والے برصغیر میں صدی کے نصفِ آخر کے آغاز سے اس وقت تک اچھی اور بڑی شاعری کر رہے ہیں لیکن ندیم کی شاعری کی طرح ان کی غزل پر بھی کوئی چھاپ نہیں ہے۔ وہ عام آدمی کی خاص باتیں ہیں۔ (خاص آدمی کی عام باتیں بھی ہوتیں تو توجہ طلب ہوتیں) مگر کیا کیجیے، عام آدمی بھی خاص بات کہتا ہے، اور ایک دو بار نہیں، مسلسل، تو اپنی طرف توجہ کھینچ ہی لیتا ہے۔ اور لگتا ایسا ہی ہے کہ اب یہ ایک شخص کے بجائے ایک عہد کی شاعری کا زمانہ آ چکا ہے۔ اب ایک تسلیم شدہ شاعر کے اشعار کی طرف توجہ ضرور ہوگی، لیکن بس ایک بار! اور پھر ایک لمحہ کے لیے قاری اپنے کو اپنے زمانہ میں رکھ کے ذرا سوچنے لگ گیا تو، وہ پلٹے گا تو ان بے نام شاعروں کی طرف جن میں سے ہر ایک نے دو چار، دس بیس شعر ہی سہی مگر کہے ہیں اپنے قاری کی فہم و فراست پر اعتماد کر کے اپنے عہد کی علم و دانش کی Frequency کو سامنے رکھ کر اپنے زمانے کا ریزہ ریزہ درد سمیٹ کے!

مختصر سی تعداد میں ان اشعار کے کہنے والے بڑے شاعر نہیں کہلائیں گے مگر ان کے شعر بڑے شعر کہلائیں گے؛ اور یہ سب بڑے شعر مل کے اس عہد کی غزل کو وہ مجموعی عظمت عطا کریں گے جسے نظرانداز کرنا آسان نہ ہوگا۔



مندرجہ بالا تحریر ۱۹۸۶ء میں لکھی گئی۔ اب ۱۹۹۵ء ہے۔ اور ان دس برسوں میں کتنے ہی خوبصورت شعر، بڑے شعر، اچھے شعر آپ کی نظر سے گزر چکے ہوں گے۔ آپ کو یاد بھی ہوں گے، امید ہے

اپنی یادداشت کے طفیل ہمارے اس دس سالہ گیپ سے درگزر فرمائیں گے۔ ویسے ہم نے ایک صورت نکال لی ہے اور وہ اس طرح کہ ایک ذیلی مجموعے کی شکل میں چند باذوق دوستوں کی مدد سے اس خلا کو (بلکہ ۱۹۸۶ء تک کے ہمارے ذوق سے مختلف خلا کو بھی) پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ لائبریری کی طرف سے "اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد" کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے۔

(عابد رضا بیدار)

اجتبیٰ رضوی



سید اجتبیٰ حسین رضوی — پ ۱۹۰۸ء

عکسِ تحریر

امروز کہ شر بہ خیر مدغم شدہ است
دیوانِ دلیل و بحث برہم شدہ است
گنجینۂ ایماں شدہ آں سرمایہ
کز بدعت و زندقہ فراہم شدہ است

[illegible]
۱۵/مئی ۱۹۸۸ء

اجتبیٰ رضوی

نام :- سید اجتبیٰ حسین رضوی، تخلص :- رضوی (ابتدائی تخلص شاعری میں تپش)، والد کا نام :- سید اظہر حسین

وطن :- چھپرہ، ولادت :- ۱۹۰۸ء چھپرہ، ابتدائی تعلیم :- گھر پر ہوئی۔

اصولی تعلیم :- ۱۹۲۳ء :- راجپوت ہائی اسکول چھپرہ، ۱۹۲۵ء میٹریکولیشن، ۱۹۲۷ء آئی اے ۱۹۲۹ء بی۔ اے (جی بی بی کالج، موجودہ لنگٹ سنگھ کالج، مظفرپور) ۱۹۳۸ء :- ایم اے (فارسی)، پٹنہ یونیورسٹی

زندگی کے اہم واقعات :- ۱۹۲۶ء :- بڑے بھائی سید مجتبیٰ حسن کا ارتحال (دریائے رہوہ میں ڈوبنے سے)، ۱۹۳۰ء :- والد ماجد کا انتقال، ۳۰-۱۹۲۹ء ضلع اسکول چھپرہ میں عارضی ملازمت، ۳۱-۱۹۳۰ء :- مدرسہ سلیمانیہ میں عارضی ملازمت، ۱۹۳۱ء :- شادی، ۱۹۳۳ء :- لڑکی کی ولادت، ۱۹۳۵ء :- لڑکے کی ولادت، ۸ ستمبر ۱۹۳۶ء :- اہلیہ کا انتقال، ۱۹۳۷ء :- قیام کلکتہ۔ صحافت۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبتوں میں شرکت مصریات کے مطالعے میں، ۳۹-۱۹۳۸ء :- راجندر کالج میں لکچرر (تقرری) اور تھیوسوفیکل سوسائٹی میں شمولیت ۱۹۴۴ء (اواخر) :- ترک دنیا۔ گیا کی پہاڑی کے کسی غار میں طویل مراقبہ یا اعتکاف، ۱۹۴۵ء (اوائل) :- اعتکاف سے واپسی، ۱۹۵۴ء :- "شعلۂ ندا" کی اشاعت، ۱۹۵۷ء :- لڑکی کی شادی، ۱۹۶۰ء :- ملت کالج کی پرنسپلی، ۱۹۶۵ء :- کالج کی عظیم الشان عمارت کی تیاری اور اس میں کالج کا منتقل ہونا، ۷۲-۱۹۷۱ء :- حج و زیارت ۷۴-۱۹۷۲ء :- ۱۹۳۴ء کے زلزلے سے مجروح شدہ ذاتی مسجد کی تعمیر جدید، ۱۹۷۵ء :- ایل۔ این متھلا یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر، ۱۹۷۷ء :- یونیورسٹی کے عہدے سے سبکدوشی۔

مشاغل :- مطالعہ، تصویرکشی، باغبانی، تدریس۔ شوق :- فلسفہ، مصریات، روحانیات، مذہبیات والٰہیات، ادب (شاعری)، فن تعمیر، موسیقی۔ موجودہ قیام اور مشغلہ :- اپنے لڑکے مرتضیٰ اظہر رضوی پروفیسر و صدر شعبۂ مابعد الطبعیات و منطق و فلسفہ۔ ملت کالج کے ساتھ دربھنگہ میں قیام اور ان کی ذہنی و فکری تربیت، پوتوں کی ناز برداری۔

انتخاب کلام

جہاں میں حاجت روا محبت تو حسن اک نقش مدعا ہے — مصورِ عشق رنگ بھر دے تو حسن ہے حسن ورنہ کیا ہے

حاصلِ سعیِ موجِ رنگ دیکھئے لالہ زار میں — گل ہی سے آگ لگ چلی پیرہن بہار میں

مدعیانِ ہوش و خرد سب دھارے پر بہتے ہی رہے
آپ کا جب دیوانہ آیا وقت کا دھارا موڑ چلا

آگ ہے بجلی آگ میں ذرے آگ ہے سورج آگ ہیں تارے
ہم نے نہ کی تھی شوخ نگاہی آپ نے کیوں عالم کو جلایا

ہم پہ شریعت ہم پہ طریقت ہم پہ حدودِ فکر و نظر
آپ چلے تو گلشن گلشن صحرا صحرا آپ ہوئے

جل نہیں سکتا جو پروانہ بزم سے ٹل ہی جاتا ہے
رشتۂ شمع تو جلتے جلتے آخر جل ہی جاتا ہے

قیس کے بعد تو خاک اڑنے لگی تھی رضوی
مجھ سے ویران نہ دیکھا گیا ویرانے کو

سرِ شوریدہ کو بالیں تو مل جائے
بلا سے بتکدے کا آستاں ہے

ایک دن رندوں نے مسجد میں نماز کے پڑھی
دوسرے دن اسے میخانہ بنا کر چھوڑا

فردوس کا وہ توشہ ہی سہی، ساقی کا جگر گوشہ ہی سہی
لیکن نہ بھرا ساغر جس سے اس مینا کو مینا نہ کہو

مانا کہ سلیقہ جینے کا آتا بھی نہ ہو نادانوں کو
یہ دشتِ جنوں آباد تو ہے، اللہ رکھے دیوانوں کو

سب پہ طاری ہولِ قیامت اور خوشی دیوانوں کو
بارے اس نے حال تو پوچھا ہم سے پریشاں حالوں کا

سمیٹ لیتے بیک سجدہ کائناتِ شہود
بقدرِ حسرتِ دل وسعتِ جبیں نہ ہوئی

چکائے قرض اپنا مجھ سے اے قدرت کے سوداگر
کہ اس سینے میں دل باقی ہے، اس گردن پہ سر باقی

بازار میں آکر نادان دل منظر کے کھلونوں پر مچلا
اور پیرِ خرد کو کاندھے پر اپنا پہ نظر ڈھونا ہی پڑا
ہم تخمِ محبت جنت سے سینے میں چرا کر لے آئے
اس ریت میں کیا اُگتا وہ بھلا! ہاں لائے تھے بونا ہی پڑا

خدا پرستی کا بیج بو کر خودی کا دل میں فروغ دیکھو
یہیں سے چھوٹے خدا اُگے ہیں، بڑی خطرناک یہ زمیں ہے
فغاں کہ یہ رسمِ جبہہ سائی نہیں بہ مقدارِ ذوقِ سجدہ
وہ کاش دل تک اتر کے رہتا جو داغ آسودۂ جبیں ہے

جس راہ میں پیچ و خم نہیں ہے
اس راہ میں کیوں حرم نہیں ہے
سجدہ ہے کرشمۂ تصور
مت کہہ کہ خدا صنم نہیں ہے

طلب کی ذلت و بیچارگی، معاذ اللہ
مری خودی کا تشنج ہے یہ دعا کیا ہے
ہم اٹھ کھڑے ہوئے دنیا سے جھاڑ کر دامن
کہ ان بجھے ہوئے ذرات میں دھرا کیا ہے

روا ہے کیا تری دنیا میں ناروا کیا ہے
مجھے بتا کہ "یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے"
یہ اتحادِ طبیعت یہ اختلافِ مزاج
یہ طرفہ کاریِ رفتارِ ارتقا کیا ہے
حیات جس کو کہیں اک جنونِ گرم روی
یہ کیوں ہے، اس کی غرض اس کا مدعا کیا ہے

اس دل کا تحیر تھا آئینہ اس سر کا تصور تھا مو قلم
تمثال پہ نقطے لگا گئے تصویر بدلتی چلی گئی
اک حد میں شریعت کہی گئی اک حد میں طریقت کہی گئی
انسان جو چلتا چلا گیا رفتار بدلتی چلی گئی

قدم سے دور جبیں رہنِ سنگِ در ہوگی
فغاں کہ بے کسیٔ سجدہ مشتہر ہوگی
طوافِ پردہ گہِ آرزوے نامشہود
بہت ہوئی تو یہی قسمتِ نظر ہوگی

جہاں ہے سرسبز کشتِ ارماں اجاڑ صحرا وہاں رہے گا
ادھر کو جو بہہ رہی تھیں نہریں اب ان کے رخ موڑے جا رہے ہیں
یہ رسمِ میخانہ کیا ہے آخر کوئی تو پیرِ مغاں سے پوچھے
جو گل بنائے گئے تھے کوزے وہ آج کیوں توڑے جا رہے ہیں

تکمیلِ زندگی کو جنوں کا ہے انتظار
اب تک خرد حریفِ مشیت نہ ہو سکی
قطرہ کے دل کی ہوک پہ قلزم نہیں بڑا
میری امید اس کی مشیت نہ ہو سکی

بساطِ بزمِ مے سے کم نہیں ہے کوئے دلداری
سنبھل کر پاؤں رکھیے ہر قدم اک آبگینہ ہے
ابھی تو دل کے ٹکڑے جمع کرنے سے نہیں فرصت
گریباں کی ہزاروں دھجیاں ہیں جن کو سینا ہے

مریضِ جلوہ کچھ اپنی خبر ہے؟
نظر کا رخ کدھر تھا اب کدھر ہے؟
کلی کا مسکرانا دیکھ لے دیر
بہت گہرا یہ طنزِ مختصر ہے

اب سب کی زباں سے سن لیجیے خلوت کا بیاں جلوت کا بیاں
اُف کیا کیا راز نہ فاش کیے آغوشِ جنوں کے پالوں نے
اس دل کو راہِ محبت میں جس جس نے پایا لوٹ لیا
اک تم ہی نہیں سب نے یہ کیا خاروں نے گلوں نے لالوں نے

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارا طلسمِ ہست و بود
اک جنونِ ادعا ہے مدعا کوئی نہیں
دیدۂ بیدار نے توڑا طلسمِ آرزو
جلوہ گاہِ ناز میں میرے سوا کوئی نہیں

مجبور نگاہیں تکتی ہیں قدرت کے تماشے ہوتے ہیں
بنتا ہے کوئی مٹتا ہے کوئی دس ہنستے ہیں سو روتے ہیں
ہر سمت سے خطرہ ہے دل کو مانگے نہ کوئی چھینے نہ کوئی
مفت ایک پرائی پونجی کو ہم رستے رستے ڈھوتے ہیں

ہے اک انتشار سکوں میں بھی سر و پا کا ہوش جنوں میں بھی
کہیں بارِ منتِ سنگ ہے کہیں دامِ لذتِ خار ہے
جسے ڈھونڈتے ہو وہ میہماں کہیں اور اُٹھ کے چلا گیا
جو سرائے کہنہ میں رہ گیا ہے وہ کہنگی کا غبار ہے
یہ نقوشِ رنگ جو دل میں ہیں گل و لالہ ان کو سمجھ نہ تو
جو بہار تھی وہ گزر گئی جو رہا وہ داغِ بہار ہے
ہے کشادہ وسعتِ دو جہاں مگر اے مکانِ لامکاں
جو یہی احاطۂ جستجو ہے تو جستجو کا فشار ہے
بہمہ جمود و فتادگی ہے تمام دشت میں کھلبلی
دلِ رضویِ حزیں آشنا یہ بتا تو کس کی پکار ہے

تمہاری گر جستجو نہ کرتے تو ہم جہاں تھے وہیں پہ تم تھے
ہم اپنی منزل سے بڑھ گئے ہیں برا ہو اس ذوقِ جستجو کا
طلب کے صحرا کا ذرہ ذرہ ہے خندہ زن سعیِ رائگاں پر
سلا دے اب اے نسیمِ غفلت کہ تھک گیا پاؤں جستجو کا
مری محبت کی انتہا تھی مرے تخیل کی بت تراشی
بکھر گئی آرزو کی پونجی طلسم ٹوٹا جو رنگ و بو کا

ڈھونڈ لیتے تجھے ہم ہمتِ مرداں کی قسم
قید ہیں وسعتِ محدودِ بیاباں کی قسم
سرحدِ ہوش میں مت جا کہ ہیں طوفانِ شکوک
دل میں رہ تجھ کو چراغِ تہِ داماں کی قسم
آج اگر بچ گئی رضوی تو یہ کل ٹوٹے گی
مہر خم کیا ہے؟ لبِ توبۂ رنداں کی قسم

اس ساز پہ نغمہ اب چھیڑو تو نالہ پیدا ہوتا ہے
موجود ہیں وہ سب تار جو تھے بس ایک نہیں ہے ٹوٹ گیا
ہم روتے ہیں اپنے پیاروں کو اور فطرت ہم سے کہتی ہے
اب اور کھلونوں سے کھیلو جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا
ہاں سن کہ تجھے تھی ہم سے غرض محتاجِ نظر تھا حسن ترا
رکھی رہی شانِ استغنا آخر کو یہ بھانڈا پھوٹ گیا

دل ہے اور خودنگری ذوقِ دعا جس کو کہیں
بے خودی چاہیے ہم کو کہ خدا جس کو کہیں
ہے ترے کیسۂ پندار میں ایسی کوئی چیز؟
دل کی بے تابِ محبت کا صلہ جس کو کہیں
تم سے رضوی کئی منزل ہے زمانہ پیچھے
راہرو اس کو کہو راہنما جس کو کہیں

اوچھی تھی نظر ہی جب تو بھلا ارمانِ تماشا کیا کرتے
ذرے کے جگر تک جا نہ سکے ہم ہمتِ صحرا کیا کرتے
رات اس نے نقاب الٹی جو ذرا سب بندِ تعین ٹوٹ گئے
وہ وہ نہ رہا، ہم ہم نہ رہے، اے شوقِ تماشا کیا کرتے
تم نے ہی چمن کو لوٹ لیا، تم نے ہی نشیمن پھونک دیا
ہم شکر کی ہمت کر نہ سکے شرما گئے شکوہ کیا کرتے

جلووں سے نہ آنکھ جھپکتی ہے جلووں کو نہ آنکھ ترستی ہے
ہم نے وہ پیالہ پی ہی لیا جس میں نہ خمار نہ مستی ہے
کچھ لمحے ہیں جن لمحوں میں احساس اسے چھو لیتا ہے
عالم سے ادھر جو عالم ہے، ہستی سے ادھر جو ہستی ہے
ہے روح کی حالت کندن کی جتنا ہی تپے گی نکھرے گی
غم ایک کسوٹی ہے جس پر یہ فطرت ہم کو کستی ہے

پھیرا ہی کیوں ہوائے رہِ کوئے یار نے
اندھیر کر دیا مری مشتِ غبار نے
افسردگی بھی حسن ہے تابندگی بھی حسن
ہم کو خزاں نے تم کو سنوارا بہار نے
اس دل کو شوقِ دید میں تڑپا کے کر دیا
کیا استوار وعدۂ نا استوار نے
جلوے کی بھیک دے کے وہ ہٹنے لگے تھے خود
دامن پکڑ لیا نگہِ اعتبار نے
گیسو غبارِ راہِ تمنا سے اٹ نہ جائیں
صحرا میں آپ نکلے ہیں ہم کو پکارنے

دونوں جہاں کی ساری پونجی بار ہوئی جن ناتوؤں پر
مردِ گدا کے ہاتھ میں کیونکر ان ناقوں کی مہاریں آئیں

تیرے فقیر کو رستا چلتے عزت و ذلت میں الجھانے
مندر سے پوجائیں دوڑیں مسجد سے پھٹکاریں آئیں

گوشۂ عرش کا بوسہ لینے دہر سے اُٹھ کر باری باری
کافر کی فریادیں آئیں غازی کی للکاریں آئیں

نا مہرباں بنے تھے، مگر مہرباں رہے
چھپ چھپ کے خود وہ رہنے لگے ہم جہاں رہے

میرا دلِ گسستہ علائق ہے اک سوال
یعنی جو پھول شاخ سے ٹوٹے کہاں رہے

اف! یہ درازدستیٔ ارمانِ مشتِ خاک
محمل میں گرد پڑتی ہے لیلےٰ کہاں رہے

ہائے اس کالبدِ خاک سے بیدردِ حیات
کس طرح ملتی ہے، کس طرح جدا ہوتی ہے

کوئی اس رہروِ غربت کی خبر لادیتا
آہ جو دل سے نکلتی ہے وہ کیا ہوتی ہے

اک عجب عالمِ آئینہ ہے سیمائے شہود
کہ جہاں ایک نظر لاکھ ادا ہوتی ہے

دریائے بے کنار کا ساحل بنادیا
اب جستجو کو شوق کے قابل بنادیا

صحرائے جستجو میں فریبِ نگاہ نے
اپنے غبارِ شوق کو محمل بنادیا

جو وسعتیں سما نہ سکیں کائنات میں
ان کو سمو سمو کے مرا دل بنادیا

اسی امید پہ تھی لغزشِ رنداں ساقی
تھام لے گا کوئی گرتے ہوئے بازو اپنا

تند و سرشور و تنک طبع یہ فطرت جس سے
ان کو ارماں کہ نکالیں کوئی پہلو اپنا

ہم تو آشفتہ سری سے نہ سنورنے پائے
آپ سے کیوں نہ سنوارا گیا گیسو اپنا

سب اپنی آنکھ کا آنسو کسی کو سونپ کر آئی
نگاہِ واپسیں اک زندگی کا قرض بھر آئی

تجلی نے کیا شرمندہ اس کو اہلِ ہمت سے
حقیقت کیوں جھکی اتنی کہ تا حدِ نظر آئی

یہ کیسا ماجرا ہے ہر مصورِ نقشِ حیرت ہے
تری تصویر جب کھینچی مری تصویر اُتر آئی

سکوتِ منظر کے زیرِ دامن بہت سے طوفاں پل رہے ہیں
حباب ہے آرزو ئے ساحل ہوا چلی اور حباب ٹوٹا

ادائے تعمیر کہہ رہی ہے جفائے تخریب کا فسانہ
بہت سے تارے چھٹک کے نکلے کہیں کوئی آفتاب ٹوٹا

ہم اور میخانے کی امانت وہاں پہنچ جائے دل سلامت
خدا نہ کردہ جو اپنے ہاتھوں یہ شیشۂ لاجواب ٹوٹا

نظر نہیں ہے تو کون دیکھے حجاب کیسا نقاب کیسی
ادھر کھلی اپنی چشمِ بینا ادھر طلسمِ نقاب ٹوٹا

کسی کی رعنائیوں کو برہم کیا مری شوخیٔ نظر نے
تجلیاں تلملا کے نکلیں جلال آیا حجاب ٹوٹا

زباں سے دل کا فسانہ ادا کیا نہ گیا / یہ ترجماں تو بنی تھی مگر بنا نہ گیا
ہم ان کے وعدۂ فردا کو لے کے بیٹھے ہیں / کہ جن سے آج کا وعدہ وفا کیا نہ گیا
دمِ اخیر وہ دینے لگے حیاتِ دگر / پھر ایک عمر کا احسان اٹھایا نہ گیا

زندگی نغمۂ بیداریِ احساس بھی ہے / اور وہ لوری بھی ہے جو دل کو سلا دیتی ہے
کارواں فکر کا ہے منزلِ آخر پہ تو کیا / زندگی منزلِ اول سے صدا دیتی ہے
بات بگڑے کہ بنے یہ مری بے تابیٔ شوق / تیری آواز سے آواز ملا دیتی ہے

ظہورِ بیکری صحرا میں ہے صرف اک نشاں میرا / غبارِ کارواں ہوں دور نکلا کارواں میرا
رسائی مرگِ شوق، افتادگی ننگِ تن آسانی / بلا کی کشمکش ہے اور غبارِ ناتواں میرا
مجھے گھبرا کے دوشِ ہستیٔ جاوید پہ پھینکا / کوئی دم بھی نہ اٹھا موت سے بارِ گراں میرا
چمن سے اک طرف ہوں نخلِ بے برگِ تمنا پر / ارے او برقِ رہ گم کردہ یہ ہے آشیاں میرا

چرانے کو چرا لایا میں جلوے روئے روشن سے / مگر اب بجلیاں لپٹی ہوئی ہیں دل کے دامن سے
تنوع کچھ تو ہو اے بلبلِ کم ذوق، ماتم کیا / اگر تعمیرِ صحرا ہو گئی تخریبِ گلشن سے
مجھے کچھ تجربے ہر رنگ کے جھولی میں رکھ چلنا / مسافر ہوں غرض کیا ہے مجھے صحرا و گلشن سے
مذاقِ جذبِ باطن گم ہے اب تزئینِ ظاہر میں / یہ طفلِ دشتِ ایمن گھٹ گیا تہذیبِ گلشن سے

بخشی ہیں اس خودی کو پئے امتحانِ ظرف / پروردگاریاں مرے پروردگار نے
کب سے کیا ہے باندھ کے احرامِ بے خودی / میرا طواف گردشِ لیل و نہار نے
ہمت پہ میری پیار سے امڈا ہے قلبِ بحر / دھوئے ہیں پاؤں گریۂ ابرِ بہار نے
صحنِ مجاز میں بہ ہزاراں ہزار ناز / کھیلی ہے مجھ سے آنکھ مچولی بہار نے
پہنچیں ہزار عالمِ آشفتگی بہ دوش / اترا ہے ناز خود مرے گیسو سنوارنے
اس جامِ دل کو اپنی ہتھیلی پہ لے کے خود / چھلکا دیا ہے ساقیٔ کوثر نثار نے
رشکِ دوئی سے وسعتِ آغوش کر کے تنگ / بھینچا ہے مجھ کو وحدتِ کثرت شکار نے
میں کافرِ مجازہ پرست حق آشنا / سمجھا کہاں کہاں سے صدا دی ہے یار نے
دیوانہ وار کفر کو ایماں کیے ہوئے / دوڑا تو ساتھ چھوڑ دیا اعتبار نے

کچھ بات تو کرتا چل اے مانجھی تو ہی ایک سہارا ہے
اب کتنی دور کنارا ہے؟ اب کتنی دور کنارا ہے؟

وہ کون ہے جس کو ظلم تمہارا پیار سے اپنے پیارا ہے
یہ عاشق اپنے شوق کے ہیں سب عاشق کون تمہارا ہے

جب تک نہ حریم ناز سے تم درویش کی کٹیا میں اترو
ہم تم کو پکارے جائیں گے جب ہم نے تم کو پکارا ہے

ہے شام جھما جھم تاروں سے، ہے صبح جھکا جھک کرنوں سے
یہ کس نے بال سنوارے ہیں؟ یہ کس نے روپ نکھارا ہے

برباد یہاں ناموس نظر اے دیدۂ بینا کون کرے
اقرار تماشا کون کرے، انکار تماشا کون کرے

ہم کو نہ ہو گر یہ دربدری تو خدمتِ صحرا کون کرے
بکھرے نہ کرن تو ذرّوں کو سورج کا شناسا کون کرے

پردیسی جلووں کی خاطر یہ آگ کا سودا کون کرے
جو وحشتِ خسِ صحرا نے کیا راہی سے وہ ساکھا کون کرے

اس حرص و ہوس کے میلے میں ہم جنسِ محبت لائے ہیں
سب سستے مال کے گاہک ہیں یہ مہنگا سودا کون کرے

خرد کی تیرگی میں آپ کا جلوہ بس ایسا تھا
کہ آدھی رات کو جیسے یکایک صبح ہو جائے

یونہی تاریخِ فطرت میں ہیں تحریکاتِ روحانی
کہ مستِ خواب کوئی چونک کر پھر جیسے سو جائے

وہی ریگِ درشتِ دہر میں لالے اگاتا ہے
جو دل کے خون سے سینچے زمیں اور جان بو جائے

ادھر رکتا ہے خامہ کاتبِ تقدیر کا چل کر
ادھر یہ اپنا تیور ہے کہ جو ہونا ہے ہو جائے

حسن کو دی گئی حیا عشق کو آن دی گئی
تم سے نہ دل لیا گیا ہم سے تو جان دی گئی

دشت نے الحذر کہا، موجِ ہوا نے الحفیظ
بخششِ قہر، الاماں! خاک کو جان دی گئی

پچھلے پہر مزار پر آ کے نقاب الٹ گئے
چادرِ نرمِ ماہتاب قبر پہ تان دی گئی

وعدۂ دید روزِ حشر سنتے ہیں تو نے کر لیا
تجھ سے بھلا غرورِ ناز کیسے زبان دی گئی

تماشا آسماں تک ہے، تصور آستاں تک ہے
مگر شوقِ دلِ بے تاب کیا جانے کہاں تک ہے

دلِ فاراں کی گرمی سینۂ ہندوستاں تک ہے
کہاں بھڑکے تھے شعلے اور بے تابی کہاں تک ہے

سنا ہے کاروانِ آرزو اب آستاں تک ہے
ہوائے شوق! میری خاکِ سرگرداں کہاں تک ہے؟

بھرے گا کون رنگِ خونِ دل نقشِ حقیقت میں
تمہاری داستاں بھی بس ہماری داستاں تک ہے

انڈیلے جا مئے مینا گدازِ جلوہ اے ساقی
کہ ضبطِ تشنگی صہبا اسی رطلِ گراں تک ہے

صلہ بے تابیوں کا مل گیا میں نے یہ خود دیکھا
کہ میرے دل کی دھڑکن اس دلِ نامہرباں تک ہے

تماشا اور تحیر میں کوئی نسبت نہیں رضوی
کہ وہ ہے آستاں تک یہ خدا جانے کہاں تک ہے

ہر مذہب بے روح جسد ہے جذبے کی قلاشی ہے
راکھ کے تودے تکتے ہیں، یہ کعبہ ہے وہ کاشی ہے

شرع کی قیل و قال سنی، اف نہ وجد و حال سنا
ذہن کی وہ عیاشی ہے اور روح کی یہ عیاشی ہے

دل مردہ مفلوج ہیں روحیں کون جلے اور کون جلائے
اس ٹھنڈے ماحول میں بیجا شوق کی اخگرپاشی ہے

صانع قدرت تیرے قلم کا کیا کہنا لیکن یہ بتا
نقش بنانا نقش مٹانا یہ کیسی نقاشی ہے

اور پھر کون سی اب ہوگی ملاقات کی رات
بھیگی بھیگی یہ گنہگار سی برسات کی رات

گھومتے کٹتا ہے کوچے میں ترے دن کا دن
بیٹھے کٹ جاتی ہے چوکھٹ پہ تری رات کی رات

یوں ہیں برہم تری گھنگھور گھٹا سی زلفیں
جیسے بکھری ہوئی بپھری ہوئی ظلمات کی رات

ایسی آباد تری بزم ہے اے جانِ نشاط
جیسے کعبہ کی سحر جیسے خرابات کی رات

نہیں سہی مرے نالوں میں کچھ اثر نہ سہی
نظر کچھ آپ کی بے چین ہے ادھر نہ سہی

ہم الجھنوں میں پڑے عقلِ نارسا لے کر
وہ عیشِ بے خبری خوب تھا خبر نہ سہی

ادا فروشیِ بازارِ طور اور حضور!
خبر یہی تو ہے مشہور معتبر نہ سہی

فدا ہو تابِ بصارت مری بصیرت پر
نظر نے چھین تو لیا طاقتِ نظر نہ سہی

کعبہ نہیں ہوا کہ کلیسا نہیں ہوا
دل آپ کے طفیل میں کیا کیا نہیں ہوا

اف وہ قمار خانۂ روزِ ازل کی دھوم
جیتے ہیں وہاں، مگر اچھا نہیں ہوا

اس کی شگفتگی کو نئی فصل چاہئے
دل ہے وہ فتنہ جو ابھی برپا نہیں ہوا

تحلیل ہو گیا نگہِ آفتاب میں
وہ ذرہ حقیر جو صحرا نہیں ہوا

خار کچھ پھول سے کم اے چمن ایجاد نہیں
کہ خلشِ دل کے لئے لطف ہے بیداد نہیں

نغمہ و نالہ باندازۂ تاثیر اے دل
ہے ابھی خام وہ آہنگ جو فریاد نہیں

آپ کا گھر جسے انسان کا دل کہتے ہیں
کون کہتا ہے کہ آباد ہے، آباد نہیں

ہم کو کہتے ہیں جو آلودۂ لذت طلبی
کیا وہ آلودۂ صد لذتِ ایجاد نہیں

گھونگھٹ الٹو کہ تمہیں پوج کے کافر ہو جائے
دلِ بدبخت جو ایمان سے بھی شاد نہیں

پیچ در پیچ ہے زنجیرِ نظامِ صحرا
ایک ذرہ بھی یہاں ذرۂ آزاد نہیں

فارغِ کشمکشِ سود و زیاں ہوں رضویؔ
عاشقی کیا ہے اگر گنجِ خداداد نہیں

دلوں کو آکے دیکھو تو یقیں نہیں گماں ہو تم — لبِ فسانہ ساز پہ برائے داستاں ہو تم
غبار بن کے آرزو رواں دواں ہے کو بکو — کہیں سے کچھ صدا تو دو کہاں ہو تم کہاں ہو تم
رہِ درازِ زندگی میں رہروؤں کی خیر ہو — کہ ناقہ بد قدم ہے اور شریر ساربان ہو تم
جبیں نے کھینچ تو لیا تمہیں ضمیر سنگ سے — ہجوم سجدہ کی قسم مگر ابھی نہاں ہو تم
زبانِ گل و گیاہ کی ہے شکوہ سنج بے دلی — یہی تمہارا باغ ہے اسی کے باغباں ہو تم

نکل چلی بن کے اک بگولا ہجومِ گردِ بیاں سے آگے — جو گرد تھی کارواں سے پیچھے وہ بڑھ گئی کارواں سے آگے
ٹھہر ٹھہر شوقِ لاابالی چلا کہاں آستاں سے آگے — یہیں ہے اک محشرِ تماشا نہ جانے کیا ہو یہاں سے آگے
نمودِ بے اختیارِ ہستی خود اپنی قسمت سے بےخبر ہے — کہ منزلِ کارواں ہے اب تک تخیّلِ کارواں سے آگے
پکارتی رہ گئی حقیقت پڑا رہا جستجو کا صحرا — ٹھہر گئے ہم خدا کی مسجد بنا کے دیرِ بتاں سے آگے
سکونِ مطلق کہاں کہ ہم نے ٹھہر کے منزل پہ بھی یہ دیکھا — کہ گردِ آشفتگی رواں ہے حریمِ آسودگاں سے آگے

جنوں کی کون سی بیتابیاں جہاں میں نہیں — وہ ہوک صوتِ جرس میں ہے جو اذاں میں نہیں
ازل سے دل میں مشیت کے چبھ رہا ہوگا — وہ راز جو ابھی تقدیر راز داں میں نہیں
عجب نہیں کہ وہی اک ہو مردِ راہ شناس — ابھی جو رہروِ گم گشتہ کارواں میں نہیں
ہمارے خوف کی خلاقیاں خدا کی پناہ — وہ بجلیاں ہیں نظر میں جو آسماں میں نہیں
لکھا ہوا انہی ذرات کے صحیفوں میں — مرا فسانہ ہے لیکن مری زباں میں نہیں

یہ نہ پوچھ مجھ سے کہ کیا ہوا رہِ جستجوئے دراز میں — دلِ پاش پاش کو دیکھ لے جو پڑا ہے کوئے نیاز میں
تری پرستشوں کی بھی چھیڑ سے ترا شکوہ لب پہ نہ آسکا — کہ بہت رچی ہوئی گونج ہے یہ سکوتِ سینۂ ساز میں
مجھے مل گئی یہ سِ دشت و در ہمہ گیر و محکم و مستتر — وہ خود آگہی جو تڑپ رہی تھی حریمِ ناز و نیاز میں
مئے جلوہ ڈھال بھی ساقیا تجھے فکرِ شیشہ نہیں روا — کہ ہے جانِ شیشہ لگی ہوئی اسی آبِ شیشہ گداز میں
وہ فسانۂ سرِ رہ گذر سرِ حشر مجھ سے نہ پوچھئے — جو گزر گئی سو گزر گئی خم و پیچ راہِ مجاز میں
کوئی انقلاب مگر ہے پھر بہ نصیبِ کوچۂ عاشقاں — کہ میں پڑھ رہا ہوں نئے فسوں تری چشمِ فتنہ طراز میں
جو شہود سے ہے لطیف تر کہیں گم نہ ہو وہ شہود میں — کہ مشاہدوں سے ہے رنگ ابھی نگہِ مشاہدہ باز میں
یہ کرشمے چند جو بچ گئے وہ بنے ہیں فتنۂ آرزو — جو پگھل گئے سو پگھل گئے نگہِ کرشمہ گداز میں

کیوں ہیں طوفاں کی زد میں حرم و دیر و کنشت
ان مزاروں پہ تو مدت سے چراغاں بھی نہیں

کس نے اس انجمنِ شوق کو تاراج کیا
دل گزرگاہِ خیالاتِ پریشاں بھی نہیں

جلوہ آبادِ تصور بہ ادا کاریٔ شوق
اب تو مرہونِ فسوں سازیٔ جاناں بھی نہیں

کائنات اپنی ہمیں دے کے بھی فارغ نہیں آپ
ہم تو کچھ مدّعیٔ وسعتِ داماں بھی نہیں

کب سے میخانے میں رضوی نہیں آیا ہے نظر
اس خزاں دوست کو کچھ شرمِ بہاراں بھی نہیں

زہد کی آستین ٹٹول، دیکھ کہاں صنم نہیں
سنگِ سیاہ ناگزیر، ورنہ حرم حرم نہیں

محنتِ شوق و خودسری شیوۂ سعیٔ ناتمام
مجھ پہ کرم نہ کر کہ میں گدیہ گرِ کرم نہیں

گم بھی تو ہو کہ جستجو لطفِ حیات بن سکے
اہلِ طلب وہ راہ کیا جس میں کہ پیچ و خم نہیں

وجہِ گناہ و کفر و شر وجہِ خرابیٔ نظر
تم کو گماں کہ تم نہیں ہم کو یقیں کہ ہم نہیں

شانۂ فکرِ خردہ گیر حسن کی یوں رگیں نہ توڑ
تجھ میں مزاجِ دانیٔ گیسوئے خم بہ خم نہیں

فتنے جگا کے دہر میں آگ لگا کے شہر میں
جا کے الگ کھڑے ہوئے کہنے لگے کہ ہم نہیں

حدیں پھیلیں نظر کی پھر بھی کم بینی نہیں جاتی
کہ ہر صورت ابھی اک آنکھ سے دیکھی نہیں جاتی

زمینِ دل بہت کچھ نرم کر دی بے قراری نے
مگر "ہم ہیں" اسی احساس کی سختی نہیں جاتی

حیاتِ جامہ زیب اور لو بہ تو جامے مگر کیا ہے؟
کہ اس برباد ساماں کی تنک رختی نہیں جاتی

مرا ذکرِ وفا لکھ کر مورخ یہ بھی لکھتا ہے
یہ اک رسمِ کہن تھی اب کہیں برتی نہیں جاتی

میں کیا منہ لے کے آؤں آپ کے آئینہ خانے میں
یہ صورت ایسی بگڑی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

تصور سے بھی آگے جستجو کی راہ جاتی ہے
وہاں کی بات لیکن پھر یہاں لائی نہیں جاتی

جبیں پہ اُس در کا پیار بھی ہے، اگرچہ اس گھر کا بار بھی ہے
اِدھر کے جھکتے نہیں تقاضے، اُدھر سے پیہم پکار بھی ہے

چڑھا کے پی تھی مئے جوانی غضب تھا شیریں وہ شور پانی
اسی کا دو دن سرور بھی تھا، اسی کا اب تک خمار بھی ہے

یہ راہِ دور و دراز مجھ کو دکھاتی لائی یہی تماشا
قدم قدم اجتماع بھی ہے نفس نفس انتشار بھی ہے

ہمارے ان کے بس اک محبت خدائی کیا بندگی کہاں کی
بہت ہی نازک ہے گو یہ رشتہ مگر یہی استوار بھی ہے

وہ سوزنِ فکر جس نے اک دن یہ رختِ تہذیب سی دیا تھا
اسی کی کاوش سے آج دیکھو یہ پیرہن تار تار بھی ہے

نہیں فقط باؤلی لگا ہیں، ظہور خود ہے خرامِ مستی
سکونِ محمل نشیں کا دشمن یہ ناقۂ بے مہار بھی ہے

نگار خانے میں مہر و مہ کے بہت بھیانک ہے نقشِ آدم
بلا کا سرکش، ازل کا باغی، مگر یہی شاہکار بھی ہے

دلِ محرم کا دکھ اس چشمِ نامحرم نے پہچانا
یہیں سے بات جب پھوٹی تو اک عالم نے پہچانا

انھیں ہونا تھا رسوا ہو چکے تا حدِّ رسوائی
نہ اُس عالم نے پہچانا نہ اِس عالم نے پہچانا

نگاہِ مہر یکساں سب پہ تھی مبہم سا تیور تھا
یہ ذرے دیکھتے ہی رہ گئے شبنم نے پہچانا

دلِ آدم ہی اک سرچشمۂ رحمت ہے عالم میں
یہ رازِ آسودگی بھولی ہوئی تھی غم نے پہچانا

یہ کبر و ناز اب کیا جب سرِ بازار تم نکلے
مگر ہاں یہ کہو بہتوں نے دیکھا کم نے پہچانا

ملک محوِ تجلی، مطمئن رمزِ تجلی تھا
کہ یہ مٹی کا پتلا اُٹھ کے بولا "ہم نے پہچانا"

تجھے کس کس طرح اے نقطۂ مایوسیِ بینش
دلِ بیتاب کی بیتابیِ پیہم نے پہچانا

تری غیرت کو آخر کیا ہوا اے نازِ خود بینی
ہے اک غوغا کہ تجھ کو عقلِ نامحرم نے پہچانا

اب اس آئینے سے آئینے روشن ہوتے جاتے ہیں
تمھیں جب دل نے پہچانا تو اک عالم نے پہچانا

فغاں جو بیگانۂ طپش ہے وہ روشناسِ اثر بھی ہوگی؟
شجر سے جو شاخ کٹ چکی ہے وہ کیا کبھی بارور بھی ہوگی

ظہورِ کامل نہیں ہے اب تک تری تجلی ہے اور غیرت
وہ پردہ پوشِ چمن رہی ہے وہ پردہ دارِ نظر بھی ہوگی

یہ فطرتِ آرزو ہے اوچھی تم اس پہ کرتے ہو کیا بھروسا
تمہارے جلوے کی جو امیں ہے وہی نظر پردہ در بھی ہوگی

جو نقطۂ نیستی سے باہر نکل چکی وہ نئی تجلی
یقین مانو کہ اک نہ اک دن نصیبِ شمس و قمر بھی ہوگی

حذر کریں مجھ سے اہلِ خلوت کہ میں اب اک شعلۂ نوا ہوں
جو لَو چراغِ حرم ہے اب تک وہ مشعلِ رہگزر بھی ہوگی

یہی مقامات ہیں سفر کے انھیں کوئی کیا بدل سکے گا
جسے پہنچنا ہے ان کے در تک وہ آرزو دربدر بھی ہوگی

یہ ورثۂ سوزِ پاک جاناں دلوں کی پونجی بھی بن سکے گا؟
ازل سے جو رائگاں ہے اب تک وہ ضربِ غم کارگر بھی ہوگی

بشر کا یزداں جمال ہونا تجلیٔ لازوال ہونا
بہت ہی دشوار یہ مہم ہے مگر کسی روز سر بھی ہوگی

شعاعیں کچھ نرم و گرم رضو کی ہمارے دل پر چمک چکی ہیں
ابھی تو گویا سحر ہوئی ہے چڑھے گا دن، دوپہر بھی ہوگی

خرد کو خانۂ دل کا نگہباں کر دیا ہم نے
یہ گھر آباد ہوتا اس کو ویراں کر دیا ہم نے

گھٹے جاتے تھے تم مینائے قلبِ اہلِ خلوت میں
تمھیں جامِ کفِ صحرا نشیناں کر دیا ہم نے

انیسِ خواجگاں تم تھے، جلیسِ خاصگاں تم تھے
مگر تم کو نصیبِ کم نصیباں کر دیا ہم نے

حریمِ ناز سے تم کو چرا لانے کے مجرم ہیں
یہ صحرا تھا اسے بھی کوئے جاناں کر دیا ہم نے

زمیں خاکسترِ یک شعلہ و یم آبِ یک گریہ
یہی وہ آب و گل ہے جس کو انساں کر دیا ہم نے

جفا سے فطرتِ آسودگاں تعمیر کی تم نے
وفا کو قسمتِ آشفتہ حالاں کر دیا ہم نے

بھلا اتنا بھی عریاں جلوہ وارزاں نظر ہوتا؟
حجاب اندر حجابِ آغوشِ ارماں کر دیا ہم نے

متاعِ حسن محسوسات میں ارزاں ہی رہ جاتی
گراں اس کو بیک تخئیل یزداں کر دیا ہم نے

کھنڈر میں ماہِ کامل کا سنورنا اس کو کہتے ہیں
تم اترے دل میں جب دل کو بیاباں کر دیا ہم نے

صلائے عام دے اے نازِ خلوت بیچنے والے
کہ اب منسوخ عہدِ طور و فاراں کر دیا ہم نے

ہوں وہ قطرہ کہ نہیں یاد سمندر مجھ کو
مگر آتی ہے اک آوازِ برابر مجھ کو

کہیں تسکینِ نظر ہو، نہیں باور مجھ کو
کہ نظر آتے ہیں منظر پسِ منظر مجھ کو

کاوشِ نظارگیٔ سایہ گہِ دو وصفات
دیکھ لے آئینۂ ذات کے اندر مجھ کو

روح کی گو بخ بنا لیتی ہے خود اپنا مقام
مجھ کو دیکھو کہ ہوا دار بھی منبر مجھ کو

یہ تقاضائے طپش اور یہ تمنائے خاک
آپ نے کیوں نہ دیا آگ کا پیکر مجھ کو

منکرِ دعویٔ دیدار نہیں ہوں لیکن
اپنی آنکھوں کی زبانی نہیں باور مجھ کو

میں ہوں اور رہبریٔ گم شدگانِ ظلمات
خضر سے چھوٹ کے تکتا ہے سکندر مجھ کو

نہ دیے جائیں مری پیاس کے اندازے جام
اور دی جائے بہ اندازۂ ساغر مجھ کو

دل ہے مجبورِ تپش رازِ محبت کی ہو خیر
اب چھلکتا نظر آتا ہے یہ ساغر مجھ کو

نبھ سکی مجھ سے نہ ہمرازیٔ جوشِ دلِ جام
کھو اک موجۂ سر رفتۂ ساغر مجھ کو

دل دیا تھا تو تمنا کو بھی بڑھنے دیتے
تم نے جلنے نہ دیا آگ لگا کر مجھ کو

احمد ندیم قاسمی



احمد ندیم قاسمی (پ۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء)

عکسِ تحریر

غزل

خزاں نصیب میں رشتہ مگر بہار سے بھی
مجھے تو گُل کی توقع ہے نوکِ خار سے بھی

مُصر ہوئے ہیں کہ لگ جاؤں باوقاروں میں
انہیں یہ ضد کہ میں خارج رہوں شمار سے بھی

جہاں بھی جاؤں اسیرِ حیات رہتا ہوں
یہ مسئلہ تو نہ حل ہوگا فرار سے بھی

سحر کی کتنی دعائیں خدا سے مانگی ہیں
اب التماس کروں گا جمالِ یار سے بھی

میں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ باز آؤں
بنیں گے نقش نئے میرے غبار سے بھی

ندیمؔ وقت کا مرہم نہ میرے کام آیا
کہ زخمِ دل نہ بھرا طولِ انتظار سے بھی

[illegible]

احمد ندیم قاسمی

نام: احمد شاہ، ادبی نام: احمد ندیم قاسمی، والد کا نام: پیر غلام نبی، قبیلہ: اعوان، تاریخ پیدائش: ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء، مقام ولادت: انگہ۔ تحصیل و ضلع خوشاب (پنجاب)

ملازمتیں اور ادارتیں: سب انسپکٹر آب کاری: ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک، ایڈیٹر ہفتہ وار "پھول"، ہفت روزہ "تہذیب نسواں": ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک، ایڈیٹر ماہنامہ "ادبِ لطیف": ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک، سکرپٹ رائٹر پشاور ریڈیو سٹیشن: ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۸ء تک، ایڈیٹر رسالہ "سویرا": ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک، بانی و مدیر رسالہ "نقوش": ۱۹۴۹ء تک، ۱۹۵۳ء سے آخر ۱۹۵۹ء تک، ایڈیٹر روزنامہ "امروز": ۱۹۶۳ء سے تاحال، بانی و مدیر رسالہ "فنون": ۱۹۷۴ء سے تاحال، ناظم "مجلسِ ترقی ادب" لاہور، ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک اعزازی سیکریٹری "بزم اقبال": ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک، مدیر رسالہ "صحیفہ": ۱۹۷۴ء سے تاحال، مدیر رسالہ "اقبال": ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک۔

اعزازات: • آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا جب مضمون نویسی کے کل پنجاب مقابلے میں اوّل رہا اور ریڈ کراس سوسائٹی کی طرف سے سند حاصل کی • انجمن حمایت اسلام کی گولڈن جوبلی پر نظم کے اوّل درجے پر آنے کی وجہ سے سونے کا تمغہ ملا • مجموعۂ کلام "دشت وفا" پر آدم جی ادبی انعام ملا • مجموعۂ کلام "محیط" پر آدم جی ادبی انعام ملا • مجموعۂ کلام "دوام" پر آدم جی ادبی انعام ملا • ۱۹۶۸ء میں ادب کے میدان میں تمغۂ حسن کارکردگی (پرائڈ آف پرفارمنس) ملا • ۱۹۸۰ء میں ادب کے میدان میں اعلیٰ کارکردگی پر "ستارۂ امتیاز" کا ایوارڈ ملا • ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا سکریٹری جنرل رہا۔ نیز افرو ایشین رائٹرز شاخ پاکستان کا صدر رہا۔

متفرقات: دو بار بحیثیت نظر بند جیل گیا • مئی ۱۹۵۱ء سے نومبر ۱۹۵۱ء تک، • اکتوبر ۱۹۵۸ء سے فروری ۱۹۵۹ء تک۔

تصانیف:

شاعری • رم جھم (قطعات) • جلال و جمال • شعلۂ گل • دشت وفا • محیط • دوام • لوحِ خاک

افسانے • چوپال • بگولے • طلوع و غروب • گرداب[1] • سیلاب[2] • آنچل • آبلے • آس پاس • در و دیوار • سناٹا • بازارِ حیات • برگِ حنا • گھر سے گھر تک • کپاس کا پھول • نیلا پتھر۔

---

[1] [2] بعد میں ان دونوں مجموعوں کا انتخاب "گرداب و سیلاب" کے نام سے شائع ہوا۔

تنقید • تہذیب و فن (جلد اوّل) ادب اور تعلیم کے رشتے

بچوں کے لیے • دوستوں کی کہانیاں • نئی نویلی کہانیاں • تین ناٹک

مرتبہ کتابیں • نقوشِ لطیف (خواتین کے افسانے) • انگڑائیاں (معیاری اردو افسانوں کا انتخاب)

• علامہ اقبال (سوانحی کتابچہ) • نذر حمید احمد خاں (متنوع موضوعات پر اہل الرائے حضرات کے مقالات)

• ترجمہ پاکستان کی لوک کہانیاں۔

اخبار نویسی: • روزنامہ "امروز" (لاہور) میں "پنج دریا" اور پھر "عنقا" کے قلمی نام سے ۲۵ برس تک مزاحیہ کالم نویسی • روزنامہ "جنگ" میں "لاہور لاہور ہے" کا معاشرتی اور ثقافتی کالم • روزنامہ "حریت" میں "لاہوریات" کا معاشرتی اور ثقافتی کالم • روزنامہ "جنگ" اور پھر روزنامہ "حریت" میں "موج در موج" کے عنوان سے مزاحیہ کالم • آج کل روزنامہ "جنگ" میں ایک کالم "رواں دواں" لکھ رہا ہوں۔

انتخابِ کلام از "جلال و جمال"

تاریکیِ شب سے ہو کے مانوس
اب نور ہی نور دیکھتا ہوں
جب سے میں قریب ہوں تمہارے
ہر چیز کو دور دیکھتا ہوں

ٹھہر اکے شبِ ہجر کی بے کیف سحر میں
تارے اتر آئے ہیں مرے دیدۂ تر میں
اللہ! مرے کفر سے تو قطع نظر کر
میں تیری جھلک دیکھتا ہوں نوعِ بشر میں

نظامِ دہر ترے اختیار میں ہے، مگر
میں سوچتا ہوں کہ تو کس کے اختیار میں ہے

یہ دھرا ہے گناہ کا انبار
رحمتیں آپ ہی شمار کریں

مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی

جہاں پناہ! مجھے بازوؤں میں لے لیجے
مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

میں چھوڑ دوں ترے کہنے سے احترامِ جفا
مگر میں ذوقِ وفا میں ذرا کمی تو کروں
مجھے بہشت سے انکار کی مجال کہاں
مگر زمین پہ محسوس یہ کمی تو کروں

الٰہی، حشر میں دے رخصتِ نمائشِ دل
میں اس بسیط اندھیرے میں روشنی تو کروں

چراغ تھکنے لگے، بھیگنے لگیں آنکھیں
کب آ سکے گا مرے خانۂ تباہ میں تو
اب آفتاب کی باری ہے، رات بھاری ہے
میں دیکھتا رہوں کب تک ستارۂ سحری

جہاں سے پھول گرا تھا، وہیں کلی چٹکی
اگر ہے فتنہ یہی، تو نثارِ فتنہ گری

انسان اب کچھ نکھرے تو نکھرے
سونے پڑے ہیں شاہوں کے دربار

ہم تو ندیم اب اکتا چلے ہیں
انوار! ظلمات! ـــ تکرار، تکرار

خدا نہیں، نہ سہی ـ ناخدا نہیں، نہ سہی
ترے بغیر کوئی آسرا نہیں، نہ سہی

تری نگاہ میں ہوں، تری بارگاہ میں ہوں
اگر مجھے کوئی پہچانتا نہیں، نہ سہی

تیرا رواج رہنما، میرا مزاج رہنما
میرا عدم بھی عین زیست، تیرا وجود بھی عدم

یہ پھول بھی تو اسی دھول سے اُگے ہیں ندیم
مرا خدا مری دنیا کا رہنے والا ہے

کیا جانے، کس خیال میں گم تھا اسیرِ نو
اپنے پروں کو خواب میں پھیلا کے رہ گیا

تو میری زندگی سے بھی کترا کے چل دیا
تجھ کو تو مری موت پہ بھی اختیار تھا

(انتخاب از شعلۂ گل)

کشتِ ویراں! ابھی برسات کی رت باقی ہے
بدلیاں جھوم رہی ہیں سرِ کہسار ابھی

بگاڑ ہو کہ بناؤ، عجیب تیرے سبھاؤ
ستارہ میں ہیں بلادے تو ابروؤں میں تناؤ

اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا، کہ دل کے دیپ جلاؤ

خدا کے لب پہ ہنسی ہے، خدائی جھوم رہی ہے
تمہاری بات چلی ہے، مری حسین خطاؤ

ادھر شباب کا مسلک ہے، ادھر شراب کا رس ہے
قدم قدم پہ قفس ہے ندیم دیکھتے جاؤ

میں کب سے گوش بر آواز ہوں، پکارو بھی
زمین پر یہ ستارے کبھی اتارو بھی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اداس نقش گرو، اب مجھے نکھارو بھی

یہ جرم ہے کہ میں گردوں پرست کیوں نہ ہوا
جو اذن ہو تو ترے حسن کو گواہ کروں

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

دستِ گل چیں میں کھل رہی ہے کلی
میرے جینے سے اس کی موت بھلی

گردشِ چشم ہے کہ گردشِ دہر
پلکیں جھکنے لگیں کہ دھوپ ڈھلی

رس میں جو بات ہے وہ مس میں نہیں
اب مرا عشق میرے بس میں نہیں

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں
ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

آدمی شش جہات کا دولہا — وقت کی گردشیں براتی ہیں

فضا کا ذکر کریں، بحر و بر کا ذکر کریں — بہت بلند ہے فردوس — گھر کا ذکر کریں
ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے — حضور فلسفۂ خیر و شر کا ذکر کریں

ترے نصیب میں راتیں، مرے نصیب میں دن — ترے چراغ، مرے دل کے داغ جلتے ہیں

عروسِ زندگانی کا سوئمبر رچنے والا ہے — نئے ارجن مشیت کی کماں لچکانے آئے ہیں

خدا کے کام جو آئے، خدا بنائے گئے — میں سوچتا ہوں کہ انساں ہی کے کام آؤں
رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں — کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں
میں اب سے دور فرشتوں کے گیت لکھتا رہا — یہ آرزو ہے کہ اب آدمی کو اپناؤں

یوں بے کار نہ بیٹھو دن بھر، یوں پیہم آنسو نہ بہاؤ — اتنا یاد کرو کہ بالآخر آسانی سے بھول بھی جاؤ
سارے راز سمجھ لو لیکن خود کیوں ان کو لب پر لاؤ — دھوکا دینے والا رو دے ایسی شان سے دھوکا کھاؤ

الٰہی! حشر میں انساں سے یہ مواخذہ کیوں — تو نارسیدہ رہا، وہ فریب دیدہ رہا

نمی میں ڈوب کے ٹھنڈی ہوائیں آئی تو ہیں — برس بھی جائیں گی آخر گھٹائیں چھائی تو ہیں

کیا ترے لطف کا معیار زباں بندی ہے — بات بے بات بدل جاتے ہیں تیور تیرے
اے مری قوم! مرا ذوقِ سفر کفر سہی — اور اگر دائرے بنتے رہیں رہبر تیرے؟

طوفان کا منتظر کھڑا ہے — یہ عین سحر کو شب کا عالم

وقت کی آنکھ بنا جاتا ہے — تیرہ و تار قفس کا روزن
رات کو آگ نہ لگ جائے کہیں — آنچ دیتے ہیں ستاروں کے بدن

یہ اور بات کہ انجان بن گئے ورنہ — ترے خرام کو پہچان لیں ہزار میں ہم
دمک رہا ہے رخِ شام پر ستارۂ شام — غروبِ مہر پہ اب کون دھر سکے الزام

ندیم! دامنِ شب سے ڈھلک رہی ہے سحر — کہ بھیجتے ہیں ستارے بھی تیرگی کو سلام

قرارِ جاں بھی تمہی اضطرابِ جاں بھی تمہی — مرا یقیں بھی تمہی ہو مرا گماں بھی تمہی
تمام حسنِ عمل ہوں، تمام حسنِ بیاں — کہ میرا دل بھی تمہی ہو، مری زباں بھی تمہی

جو پیار نہ کر سکے زمیں سے — پائیں گے نہ بھیک آسماں سے

یزداں پہ جھپٹ پڑے گا ابلیس
انساں ہٹا جو درمیاں سے

ہر ایک شے پہ اجالا سا ہلکا ہلکا ہے
ترا خیال ہے یا صبح کا دھندلکا ہے

کچھ درگذر کا کھیل، کچھ ایثار کا کمال
ورنہ وہ کون ہے جو کسی سے نباہ لے!

مدت کے بعد اذنِ تبسم ملا ہمیں
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

سجدہ اظہارِ ماندگی نکلا
سانس پھولی تو لو خدا سے لگی

جیتے ہیں جو مرنے کی تمنا میں ندیم
وہ موت سے پیشتر ہی مر جاتے ہیں

وہ کفر ہے ایمان کی معراجِ کمال
جس کفر کو انساں سے محبت ہو جائے

(انتخاب از "دشتِ وفا")

اب آئے ہو آفتاب لے کر
ظلمات سے جب گذر گیا چاند

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی

چاند جب دور افق پر ڈوبا
ترے لہجے کی تھکن یاد آئی

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمہاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستۂ غم ہو جاتے

کون کہتا ہے، محبت ہے فقط جی کا زیاں
ہم تو اک دل کے عوض حشر اٹھا لائے ہیں

ان کو لوٹا تو اجڑ جاؤ گے
جن کا سامان ہے بے سامانی

کفر کے انکار کی عظمت کا گو منکر نہیں
میں کسی قوت کے حسنِ ربط کا قائل بھی ہوں

دور سے دیکھا تو پلکوں تک کے سائے گن لیے
جیسے جیسے تم قریب آئے، دھواں بنتے گئے

ہم ہیں ترا نقشِ خود نمائی
پندار ہمیں سے کیوں خدایا!

تخلیقِ زمیں کا طنز مت کر
ہم نے ترا آسماں بنایا

جس بھی فنکار کے شہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہو گا

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہو گا

اس رت کو سدا بہار کر لے
اک بار کسی سے پیار کر لے

جب تک میں ترا جمال دیکھوں
تو زخم ہرے شمار کر لے

برسوں سے تری طرف رواں ہوں
ہمت ہے تو انتظار کر لے

پرواز کو محدود نہ کر شام و سحر تک — انساں کی ہیں مملکتیں حدِ نظر تک

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے — مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

تو اتنا قریب ہے، کہ تجھ سے — میں پوچھ رہا ہوں، تو کہاں ہے

وقت بدلا، پہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا — آندھیوں میں سرِ کہسار چراغاں جیسے
تجھ سے مل کر بھی تمنا ہے کہ تجھ سے ملتا — پیار کے بعد بھی لب رہتے ہیں لرزاں جیسے
بھری دنیا میں نظر آتا ہوں تنہا تنہا — مرغزاروں میں کوئی قریۂ ویراں جیسے
غمِ جاناں، غمِ دوراں کی طرف یوں آیا — جانبِ شہر چلے دخترِ دہقاں جیسے
عصرِ حاضر کو سناتا ہوں اس انداز میں شعر — موسمِ گل ہو مزاروں پہ گل افشاں جیسے
زخم بھرتا ہے زمانہ، مگر اس طرح ندیم — سی رہا ہو کوئی پھولوں کے گریباں جیسے

چپ ہوں کہ چپ کی داد پہ ایمان ہے مرا — مانگوں دعا جو میرے خدا کو خبر نہ ہو

آنکھ کھولی، تو جہاں کانِ جواہر تھا ندیم — ہاتھ پھیلائے تو ہر چیز کو عنقا دیکھا

نارسائی کی قسم، اتنا سمجھ میں آیا — حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا
سب حجاباتِ نظر دل کے نہ دکھنے تک تھے — درد چمکا تو اندھیرا بھی نہ رہنے پایا
ابر کے چاک سے جب، رات ستارے جھانکے — اے مرے بھولنے والے، تو بہت یاد آیا
جب بھی دیکھوں کوئی شہ پارۂ فن سوچتا ہوں — کتنے لوگوں نے مرا قصۂ غم دہرایا
بیچ دوں کیوں اسے اک نانِ جویں کے بدلے — میں نے جس دل کے لیے ایک جہاں ٹھکرایا
اس توقع پہ کہ شاید کبھی انساں سنبھلے — ہر نئے ظلم نے جینے پہ مجھے اکسایا

سانس لینا بھی سزا لگتا ہے — اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے
سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش — جو گزرتا ہے، خفا لگتا ہے
مسکراتا ہے جو اس عالم میں — بخدا، مجھ کو خدا لگتا ہے
اتنا مانوس ہوں سناٹے سے — کوئی بولے تو برا لگتا ہے

شب کے پہلو میں کہیں پھوٹ رہی ہے پو بھی — کبھی دنیا میں اندھیرے نہ جہانگیر ہوئے
وہی آواز کی قوسیں، وہی تانوں کے خطوط — چند نغمے تھے جو مل کر تری تصویر ہوئے

تیرے جاتے ہی یہ محسوس ہوا ___ عمر گذری تجھے پل بھر دیکھے

اے چھونا بھی ممکن، سوچنا بھی تجھ کو ناممکن ___ تری دنیا میں یارب تجھ کو پوجیں یا اسے چاہیں

اتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے ___ جس طرف جائیے، زخموں کے لگے ہیں بازار
سر بچا لائے ہو، لیکن یہ زیاں تو دیکھو ___ کتنا ویران ہے، تاحدِ نظر، منظرِ دار

آج کے دن کا بدل کیا ہوگا ___ کل ہی سوچیں گے کہ کل کیا ہوگا

ترے پہلو سے اٹھ کر کھو گئے ہم ___ خیالوں کی گھنی تنہائیوں میں

سورج ابھرا کہ قیامت جاگی ___ رات گزری کہ زمانے گزرے

انتخاب از "محیط"

کتنے معصوم ہیں انساں کہ بہل جاتے ہیں ___ اپنی کوتاہی کو دے کر غم و آلام کا نام
یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے، کہ ندیم ___ میرا کردار کا کردار ہے — اور نام کا نام

اس کی قبا بھی نقابِ صنم تھی میرے گریباں کی مانند ___ اسی لیے تو شیخ حرم سے اپنا بہت یارانہ چلا
عشق نہ تھا تو نکتہ بہ نکتہ بات سے بات نکلتی تھی ___ عشق ہوا تو آخری دم تک ایک یہی افسانہ چلا
آدمی اپنی ہی آواز سے ڈر جاتا ہے ___ اس قیامت کی خموشی ہے فضا پر طاری

اک عمر کے بعد مسکرا کر ___ تو نے تو مجھے رُلا دیا ہے
اس وقت کا میں حساب کیا دوں ___ جو تیرے بغیر کٹ گیا ہے
کچھ کھیل نہیں ہے عشق کرنا ___ یہ زندگی بھر کا رت جگا ہے
میرے ہی نقوشِ پا سے بچ کر ___ صحرا مرا نام پوچھتا ہے
مٹی سے اگر بنا تھا آدم ___ انسان تو پیار سے بنا ہے

الٰہی، اب کوئی آندھی عطا ہو صحرا کو ___ سمندروں پہ تو گھر کر برس گئی ہیں گھٹائیں

سقراط نے زہر پی لیا تھا ___ ہم نے جینے کے دکھ سہے ہیں
یکساں ہیں فراق و وصل دونوں ___ یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں
ہم دل کے گداز سے ہیں مجبور ___ جب خوش بھی ہوئے تو رو دیے ہیں

ترے فراق میں بھی تجھ سے ربط قائم ہے ___ کہ میری یاد میں تو بھی تو جاگتا ہوگا

میں کھل کے رو نہ سکا جب، تو یہ غزل کہہ لی — بچھڑ کے مجھ سے، مگر تو نے کیا کیا ہو گا

طویل ہجر کا یہ جبر ہے، کہ سوچتا ہوں — جو دل میں بستا ہے، اب ہاتھ بھی لگاؤں اُسے

یوں تو جو رنگِ چمن کل تھا، وہی ہے آج بھی — پھول ماضی میں مگر اس کرب سے کھلتا نہ تھا

اب تو کچھ کہنے سے پہلے خون ہو جاتا ہے دل — اتنی شدت سے تو میں نے آج تک سوچا نہ تھا

یوں تو جو پیدا ہوا ہے، مر ہی جائے گا مگر — ہائے وہ دن، موت کا جب اس قدر چرچا نہ تھا

دُھن تو مجھ کو قیس کی سی تھی، مگر اس دور میں — پھول اتنے تھے، کہ صحرا کا کوئی رستہ نہ تھا

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں — کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اُتر جاؤں

اے خدا، اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے — تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

جس راز سے انساں کو کوئی فلسفے سوجھے — دیکھا تو وہی پھول کی پتّی پہ رقم تھا

ہر تازہ حقیقت مجھے جس موڑ پہ لائی — تا حدِّ نظر دشتِ پُر اسرار علم تھا

سب نے انسان کو معبود بنا رکھا ہے — اور سب کہتے ہیں — "انساں میں کیا رکھا ہے"!

ابھی ابھی تمہیں سوچا تو کچھ نہ یاد آیا — ابھی ابھی تو ہم اک دوسرے سے بچھڑے تھے

یہ فخر بھی تو بہت تھا، کہ جو ہنسے ہم پر — وہ کوئی غیر نہیں تھے، تمام اپنے تھے

یہ ارتقا کا چلن ہے، کہ ہر زمانے میں — پرانے لوگ، نئے آدمی سے ڈرتے تھے

ندیمؔ، جو بھی ملاقات تھی، ادھوری تھی — کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے

اپنی پوشاک سے ہشیار! کہ خدامِ قدیم — دھجیاں مانگتے ہیں اپنے گریبانوں کی

صنعتیں پھیلتی جاتی ہیں، مگر اس کے ساتھ — سرحدیں ٹوٹتی جاتی ہیں گلستانوں کی

ان کو کیا فکر، کہ میں پار لگا، یا ڈوبا — بحث کرتے رہے ساحل پہ جو طوفانوں کی

مقبرے بنتے ہیں زندوں کے مکانوں سے بلند — کس قدر اوج پہ تکریم ہے انسانوں کی

تیری رحمت تو مسلّم ہے، مگر یہ تو بتا — کون بجلی کو خبر دیتا ہے کاشانوں کی؟

ابھی تکمیل کو پہنچا نہیں ذہنوں کا گداز — ابھی دنیا کو ضرورت ہے غزل خوانوں کی

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا — دیکھا نکل کے گھر سے، تو جھونکا ہوا کا تھا

اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں! — تو سامنے تھا، اور تصور خدا کا تھا

حیران ہوں کہ دار سے کیسے بچا ندیمؔ
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

نئی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی تاریخ خود لکھے گا
بس اب عجائب گھروں میں رکھ دو قدیم معیار خیر و شر کے

اس حسن کو آغوش میں لینے کا جنوں ہے
جو حسن مجھے حدِّ نظر تک نظر آئے

کیا عرش سے آگے بھی کوئی ہے کہ نہیں ہے!
اب تو مجھے خود اپنے خیالوں سے ڈر آئے

جیسے صحرا میں جدھر جائیے، ریت اڑتی ہے
عمر نے ساتھ دیا، صرف بسر ہونے تک

کل رات عجیب خواب دیکھا
بجھتا ہوا آفتاب دیکھا

انسان نے فکر ترک کر دی
ایسا بھی اک انقلاب دیکھا

دشمن بھی جو چاہے تو مری چھاؤں میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ، سرِ راہگذر ہوں

قدرت سے ودیعت ہیں مجھے رنگ بھی، رس بھی
ارزاں ہوں، کہ میں شاخِ بریدہ کا ثمر ہوں

اپنے کاندھے پہ جنازے لیے اپنے اپنے
ہم کروڑوں ہیں، مگر پھر بھی اکیلے کیوں ہیں

پا بہ زنجیر سہی، چیخ تو سر کر دیتے
ہم نے دکھ اتنے کڑے صبر سے جھیلے کیوں ہیں

مرے نصیب میں بنجر زمیں کی رکھوالی
کنوئیں اداس مرے کھیت بے ثمر میرے

تری شمیم بدن نے قدم اکھیڑ دیئے
میں آندھیوں میں بھی کیسا سنبھل کے چلتا تھا

یہ سوچ کر، کہ میں تیرے بغیر زندہ رہا
میں تیرے سامنے کل رات کتنا رویا تھا

تو دیکھتا ہے تو کیوں روشنی سی پھیلتی ہے
افق پہ یا تری آنکھوں میں چاند ڈوبا تھا

یہی کہ عشق سلیقہ ہے زندہ رہنے کا
میں ایک عمر میں بس اتنی بات سمجھا تھا

وہ ایک پل تھا کہ عصرِ رواں، کہ پوری صدی
ندیمؔ، دل سے جو اک تیر سن سے گذرا تھا

گھر سے نکلے گی فقط رات کو اس کی بیٹی
اتنی غیرت تو ابھی تک مرے ہمسائے میں ہے

دور تک ان کی بصارت بھی ترے ساتھ گئی
صرف آنکھیں ہی تو تھیں تشنۂ دیدار کے پاس

پیاس کیا بجھتی کہ صحرا کا تھا منظر سامنے
دھوپ اتنی تیز نکلی، رنگ دریا جل گیا

اب تو ذرے بس سے باہر ہیں، ستارے پاس ہیں!
آگ وہ برسی کہ سب معیارِ اشیا جل گیا

خدا نہ کردہ، کسی قوم پر یہ وقت آئے
کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینوں میں

کسے معلوم تھا، اس شے کی بھی تجھ میں کمی ہوگی — گماں تھا، تیرے طرزِ جبر میں شائستگی ہوگی
میں اپنے آپ کو سلگا رہا ہوں اس توقع پر — کبھی تو آگ بھڑکے گی، کبھی تو روشنی ہوگی
شفق کا رنگ کتنے والہانہ پن سے بکھرا ہے — زمیں بامِ افق پر اپنے سورج سے ملی ہوگی
سنا ہے، عالمِ لاہوت میں پھر زندہ ہونا ہے — مگر دھرتی سے کٹ کر زندگی کیا زندگی ہوگی
وہ وقت آئے گا، چاہے آج آئے، چاہے کل آئے — جب انساں دشمنی، اپنے خدا سے دشمنی ہوگی

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا — میں تو دریا ہوں، سمندر میں اُتر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ — بُجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

میری قسمت میں شب تھی، لیکن میں — شمع بن کر سحر کے کام آیا
جبر کو بھی زوال ہے — جیسے — آہن، آئینہ گر کے کام آیا
عجز کو بھی عروج ہے جیسے — ایک قطرہ، گہر کے کام آیا
زندگی، اہلِ شر کے گھر کی کنیز — خیر کا کام، مر کے کام آیا
تاجِ زریں پہ کچھ نہیں موقوف — سنگِ طفلاں بھی سر کے کام آیا
سیم و زر آدمی کے چاکر تھے — آدمی سیم و زر کے کام آیا

شکستہ پائی کے مرحلے، دشتِ ہجر میں اس لیے نہ آئے — کہ یہ سفر میں نے طے کیا ہے دراز پلکوں کے سائے سائے
جسے فرشتوں نے خلد سے، ربِّ خلد کے حکم سے نکالا — وہ خلد زادہ، زمیں پہ تخلیقِ خلد سے کیسے باز آئے

دھندلانے لگی ہیں تیری یادیں — میں کتنا غریب ہو رہا ہوں
سو جاتی ہیں جب صدائیں شب کو — میں اپنے کھنڈر میں گونجتا ہوں
اتروں گا چمن پہ اوس بن کر — میں ٹوٹتی رات کی دعا ہوں
گل کی تو ہیں سب صفات مجھ میں — بس یہ ہے کہ قبر پر کھلا ہوں
اے صبح! مری گواہ رہنا — میں رات سے عمر بھر لڑا ہوں

شب گزرنے سے تو انکار نہیں — آج تک صبح کے آثار نہیں
جتنا مشکل ہے ترس کر جینا — اس قدر موت بھی دشوار نہیں

وہی نقش رو برو ہے، وہی عکس چار سو ہے   مجھے تیری آرزو تھی، مجھے تیری آرزو ہے
میں دیارِ شش جہت میں جو تری جہت نہ بھولا   تو کمال کیا ہے میرا، کہ وفا تو میری خو ہے
مرا ربط ہے جو تجھ سے، وہ ہے ربط گردشوں کا   پسِ ہر غروب میں ہوں، پسِ ہر طلوع تو ہے
تو ملا تو یہ ہوس ہے، پسِ خد و خال دیکھیں   وہ جو کھو کے جستجو تھی، وہی پا کے جستجو ہے

تو ملا ہے تو تھکن ٹوٹ پڑی صدیوں کی   اب میں مر کر بھی ترے ساتھ نہیں جا سکتا
جس نے گلزار کو مہکے ہوئے جھونکے بخشے   کاش! صحرا میں بھی اک موجِ صبا لا سکتا
درد سینے میں چمکتے ہیں کہ تیری شمعیں   زندگی! میں ترے احساں نہیں گنوا سکتا
دامنِ کوہ میں کھلتا ہے جب پھول ندیم   دنگ ہوتا ہے، کہ پتھر نہیں مرجھا سکتا

دیوانہ ہوں میں بھی اگر نکلتے ہیں بہ ہر لفظ   افکار کے خورشید، مرے چاک قلم سے

چاند پر جب سے لوگ جانے لگے   حرف پتھر زمیں پہ لانے لگے

کس قدر قحطِ وفا ہے مری دنیا میں ندیم   جو ذرا ہنس کے ملے، اس کو مسیحا سمجھوں

شب کا بھی اک جمال ہے، لیکن   تم تو دن بھی دھواں دھواں دیکھو

ایک کو دوسرے کا ہوش نہیں   یوں تو ہم ساتھ ساتھ چلتے ہیں
وہ کڑا موڑ ہے ہمیں درپیش   راستے ہر طرف نکلتے ہیں

جرم جس طرح پسِ پردۂ در ہوتے ہیں   لوگ اس دور میں سچ بھی پسِ دیوار کہیں

ہر شخص تجربات کی دنیا ہے، سب سے مل   دانائیاں سمیٹ کے، پیارے! بکھر نہ جا
میں نے کہا نہ تھا کہ طلسمِ انا نہ توڑ   اب اپنا سامنا جو کیا ہے تو ڈر نہ جا
عزمِ سفر کیا ہے تو رختِ سفر بھی باندھ   منزل ہے آسمان، تو بے بال و پر نہ جا
دل میں اُٹھا ہے درد، تو اظہارِ درد کر   آنسو امڈ پڑے ہیں تو منہ پھیر کر نہ جا
برحق ہے موت اگر، تو ہے برحق حیات بھی   یوں جیتے جی تو موت کی ہیبت سے مر نہ جا
دستک سے دستِ فن کو نہ آلودہ کر ندیم   سب جا رہے ہیں جانبِ در، تو مگر نہ جا

خدا کی طرح، میری چپ کے بھی مفہوم لاکھوں ہیں   اک اندازِ تکلم ہے کسی سے کچھ نہ کہنا بھی

میری آنکھیں مجھے لوٹا — کہ تجھے دیکھ تو لوں
اے بہاروں کے چراغوں کو بجھانے والے
لوگ اس وقت کو آشوبِ جہاں کہتے ہیں
سر اٹھا لیتے ہیں، جب ناز اٹھانے والے
جانے اب تک تو کہاں تھا، کہ دکھائی نہ دیا
اے مجھے حدِ نظر تک نظر آنے والے

طوفان ہے ہم رکاب میرا
ہر خیمہ ہے بے طناب میرا
ہاں، شب تو گزر چکی ہے کب کی
ابھرا نہیں، آفتاب میرا
کتراتے رہے جو آئینوں سے
کرتے رہے احتساب میرا
دنیا بھی تو حشر ہے الٰہی
دنیا ہی میں کر حساب میرا

میں جو روؤں، کوئی ہوتا نہیں رونے والا
جو سکوں دشت میں دیکھا ہے، وہ شہروں میں نہیں
اس زمانے کے جو دکھ ہیں، وہ نرالے دکھ ہیں
کچھ علاج ان کا، بزرگوں کی بیاضوں میں نہیں
صرف دہقان کے خرمن کو بھلا کیوں تاکے
برق حالات میں ہوتی ہے، گھٹاؤں میں نہیں
رہنماؤں سے بس اتنا سا گلہ ہے مجھ کو
ان کے ہونٹوں پہ جو باتیں ہیں، وہ ذہنوں میں نہیں
پاؤں مٹی نے وہ پکڑے ہیں، کہ ہلنا ہے محال
اب کوئی لطف خیالوں کی اڑانوں میں نہیں

سوئے جسم و جاں دیکھوں، یا میں یہ سماں دیکھوں
پھول پھول ہاتھوں میں کیسے کیسے پتھر ہیں
صبر کیوں دلاتے ہو، ضبط کیوں سکھاتے ہو
مجھ کو کتنی صدیوں کے یہ سبق تو ازبر ہیں

عمر کا ہے یہ تقاضا، کہ زمانے کا مزاج
درد اٹھتا ہے تو اب طیش بھی آ جاتا ہے
شانِ جمہور تو جب ہے کہ ہر انسان کہے
میرا حاکم، مرا ہر حکم بجا لاتا ہے

یہ ابر و کشت کی دنیا میں کیسے ممکن ہے
کہ عمر بھر کی وفا کا کوئی صلہ ہی نہ ہو
مری نگاہ میں وہ پیڑ بھی ہے بدکردار
لدا ہوا ہو جو پھل سے، مگر جھکا ہی نہ ہو

میں کسی شخص سے بیزار نہیں ہو سکتا
ایک ذرہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا
اس قدر پیار ہے انساں کی خطاؤں سے مجھے
کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا
تیرگی، چاہے ستاروں سے سفارش لائے
رات سے مجھ کو سروکار نہیں ہو سکتا
وہ جو شعروں میں ہے اک شے پسِ الفاظ، ندیم
اس کا الفاظ میں اظہار نہیں ہو سکتا

میں ہوں تیرا کہ تو شیدا میرا
بس یہ جھگڑا رہا تیرا میرا

مجھ سے بچھڑ کے، یوسفِ بے کارواں ہے تو / مجھ کو تو، خیر درد ملا، تجھ کو کیا ملا

محبت ایک سمندر ہے، وہ بھی اتنا بسیط / کہ اس میں کوئی تصور نہیں کنارے کا

عشق جنوں سہی، مگر عشق فقط جنوں نہیں / ہوتے ہیں کچھ مطالبے عشق سے آگہی کے بھی
بت شکنی کا مرتبہ یوں تو بلند ہے، مگر / اپنے ہی خاص لطف ہیں صنعتِ آزری کے بھی
کیسے مرا فقیہِ شہر میری سمجھ میں آ سکے / ڈھنگ قلندری کے بھی، رنگ سکندری کے بھی

تجھ سے کس طرح میں اظہارِ تمنا کرتا / لفظ سوچا تو معانی نے بغاوت کر دی
میں تو سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے / تو نے جا کر تو جدائی مری قسمت کر دی

ترے کمالِ بلاغت سے ہم کو شکوہ ہے / جو گفتگو تری آنکھیں کریں، وہ لب نہ کریں
کہیں وفا سرِ بازار بک نہ جائے ندیم / کہ اب تو لوگ محبت بھی بے سبب نہ کریں

مسجد کے اندر مسجد تعمیر ہوئی / جذبے ٹھنڈے، سجدے بے تاثیر ہوئے

شہر ہیں یہ، کہ تمدن کے عقوبت خانے / عمر بھر لوگ چنے رہتے ہیں دیواروں میں
آپ دستار اتاریں تو کوئی فیصلہ ہو / لوگ کہتے ہیں کہ سر ہوتے ہیں دستاروں میں
رت بدلتی ہے تو معیار بدل جاتے ہیں / بلبلیں خار لیے پھرتی ہیں منقاروں میں
میرے کیسے میں تو اک سوت کی انٹی بھی نہ تھی / نام لکھوا دیا، یوسف کے خریداروں میں
چھن لے بازارِ ہنر سے کوئی بہروپ ندیم / اب تو فنکار بھی شامل ہیں اداکاروں میں

خدا کرے، مجھے دنیا تجھی سے پہچانے / تری نظر سے گروں یا تری نظر میں رہوں

صرف رنگت ہی نہیں پھولوں میں / ان سے نکہت کی بھی حکمت سیکھو
ایک آنسو بھی نہ روکو دل میں / اور خوش رہنے کی عادت سیکھو

جو برائی تھی، مرے نام سے منسوب ہوئی / دوستو! کتنا برا تھا مرا اچھا ہونا

جس پہ کسی حق دار کا حق ہم سے سوا ہو / ہم ایسی کسی چیز کی حسرت نہیں کرتے
اے دل، تجھے انجام کی کیا فکر پڑی ہے / ہم عشق کی دنیا میں سیاست نہیں کرتے
ہر ظلم کے منہ پر ہمیں سچ کہنے کی لت ہے / ہم لوگ تو ظالم کی بھی غیبت نہیں کرتے

میں دور رہوں، سن سکوں تو کافر — تو تجربۃً مجھے صدا دے
تہذیب ہے عشق کی انوکھی — دل دکھتا رہے، مگر دعا دے
یوں اس نے ندیمؔ مجھ کو دیکھا — جیسے کوئی راستہ دکھا دے

کل جب تیرے آنے میں کچھ دیر ہوئی تھی — میں نے زمیں کی گردش کی آواز سنی تھی
پتے ناحق اس کے دکھ پر تڑپ رہے تھے — چڑیا خوشی خوشی بارش میں بھیگ رہی تھی
کاش ندیمؔ خدا کو کوئی یاد دلا دے — برسوں پہلے میں نے ایک تمنا کی تھی

جی چاہتا ہے، فلک پہ جاؤں — سورج کو غروب سے بچاؤں
بس میرا چلے جو گردشوں پر — دن کو بھی نہ چاند کو بجھاؤں
میں چھوڑ کے سیدھے راستوں کو — بھٹکی ہوئی نیکیاں کماؤں
میں شب کے مسافروں کی خاطر — مشعل نہ ملے تو گھر جلاؤں
یوں بٹ کے بکھر کے رہ گیا ہوں — ہر شخص میں اپنا عکس پاؤں
آواز جو دوں کسی کے در پر — اندر سے بھی خود نکل کے آؤں
رونا بھی تو طرزِ گفتگو ہے — آنکھیں جو رکیں تو لب ہلاؤں

خدا کو دیکھ لینا چاہتا ہوں — "شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ"
ابھی آدم فلک سے گر رہا ہے — ابھی انسان ہے نا آفریدہ
زوالِ شب کا نوحہ لکھ رہا ہوں — سحر کا بنتا جاتا ہے قصیدہ

در مرے پچھے گھر زوندے کا، ہوائیں لے اڑیں — پھر پڑا چھینٹا تو آدھی رہ گئی دیوار بھی

صبح کے نور سے بھیگے ہوئے کھیتوں میں کسان — ہل چلاتے ہیں تو فنکار نظر آتے ہیں

میں تری کھوج میں مبہوت پھرا کرتا ہوں — میں ترے پاس سے گذروں تو صدا دے دینا

(انتخاب از "دوام")

اگر گروں تو کچھ اس طرح سربلند گروں — کہ مار کر، مرا دشمن مجھے سلامی دے
شاید ان درباروں میں خوش دلی بھی دولت ہے — ہم تو مسکراتے ہی نگر گئے گداؤں میں

ایک بے گنہ کا خون، غم جگا گیا کتنے　　بٹ گیا ہے اک بیٹا، بے شمار ماؤں میں
بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی　　تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں

قرنوں پہ محیط علم تیرا　　لمحوں کا مجھے حساب آئے

یہ شاید سچ کہنے کا ہنگام نہ تھا　　اب گھبرایا بیٹھا ہوں جھوٹے کی طرح

کوئی کوہ کن ہو کہ قیس ہو، کوئی میر ہو کہ ندیم ہو　　سبھی نام ایک ہی شخص کے، سبھی پھول ایک ہی ڈال کے

بستی کو نگل گیا اندھیرا　　جب آگ بجھی ہے میرے گھر کی
وقت آئے گا — جب نہیں مرے گا　　مرضی نہ ہوئی اگر بشر کی

یہ راز مجھ پہ کھلا اس کی حسن کاری سے　　کہ آدمی ہے خدا کے مزاج کا پرتو

نمازِ صبح کی مہلت میسّر ہو تو کیسے ہو　　اذانیں سُن کے کھو جاتا ہوں چڑیوں کی پکاروں میں

ہر ایک ڈوبنے والا یہ سوچتا ہے کہ میں　　بھنور سے بچ کے نکلتا تو پار اتر جاتا
تمام عمر مرادشت میرے ساتھ رہا　　تمام عمر تمنا رہی کہ گھر جاتا

ہم سب اپنا آپ چھپائے پھرتے ہیں　　ہم انسان — فرشتوں کی تمثیلیں ہیں
حل نہ ہوا مغرب کا یہ سفاک تضاد　　پاؤں تلے لاشیں، سر پر انجیلیں ہیں

پڑھتا ہوں جب اس کو تو ثنا کرتا ہوں رب کی　　انسان کا چہرہ ہے کہ قرآن کا پارہ
جنّت ملی جھوٹوں کو اگر جھوٹ کے بدلے　　سچّوں کو سزا میں ہے جہنم بھی گوارا
مستقبلِ انسان نے اعلان کیا ہے　　آئندہ سے بے تاج رہے گا سرِ دارا

رہنماؤں سے بس اتنا ہی ہمیں کہنا ہے　　کہ وہ الفاظ کے ناموس کو بیچا نہ کریں
ہم نے کس صبر سے ہر جبر سہا ہے، لیکن　　اب جو ہم چیخ اٹھیں آپ بھی غصّہ نہ کریں

دل و جاں بیچ کے احسان اتارے اس کے　　خود کو ناپید کیا، نقش ابھارے اس کے
وہ تو یکتا ہے، مگر عالمِ تنہائی میں　　میں نے گھبرا کے کئی نام پکارے اس کے

اک عمر سے میں تیرے تعاقب میں رواں ہوں　　اے وقت! اترے کیسے تقدیر میں کیا ہے

تو آدمی کا ہے معبود — اور عظیم و جلیل　　میں قدسیوں کا ہوں مسجود — اور خوار و زبوں
خدا نہیں تو کوئی آدمی کہیں مل جائے　　میں کیا کروں اگر اتنی بھی آرزو نہ کروں

دل سے لب تک حرف کا سارا سفر برزخ میں ہے   شوقِ حق گوئی کا لیکن خوف ہے تکفیر کا

درحقیقت دل میں گھر کرنا ہے پربت کاٹنا ـــــ تم نے افسانہ بنا ڈالا ہے جوئے شیر کا

گل ترے دل میں کھلیں اور مہک جاؤں میں ـــــ اسی رشتے میں ہر انساں کو پرونا چاہوں

یہ جو اک عمر کی تنہائی ہے ـــــ میرا معیارِ توانائی ہے

زرِ محنت جو ہمارا ہے، وہ سب کا ہے اگر ـــــ قصرِ مرمر جو تمہارا ہے، تمہارا کیوں ہے

اس کا ہونا ہے مرے ہونے سے ـــــ میں نہ ہوتا تو خدا کیا کرتا

دن چھپا تو مسافرِ سحر کے لیے کتنی تاریک صدیوں سے گزرا   ایک سورج کے بعد ایک سورج نکلنے میں کتنے زمانے لگے

جس نے جس دور میں بھی مسیحائی کی اسکو مصلوب ہونا پڑا ـــــ لوگ مُردوں کو زندہ کرانے کے بعد اسکو مقتل میں لانے لگے

چلا ہوں ترکِ محبت کی آرزو لے کر   یہ آرزو بھی کہیں دردِ سر نہ ہو جائے

ـــــ

کس نے کہا کہ بھولا ہوا اک فسانہ ہیں   ہم کل بھی ایک عہد تھے اب بھی زمانہ ہیں

ـــــ

میں نے غم سہے کتنے اب بساط الٹ دوں گا   وہ مری نوازش تھی یہ مرا ارادہ ہے

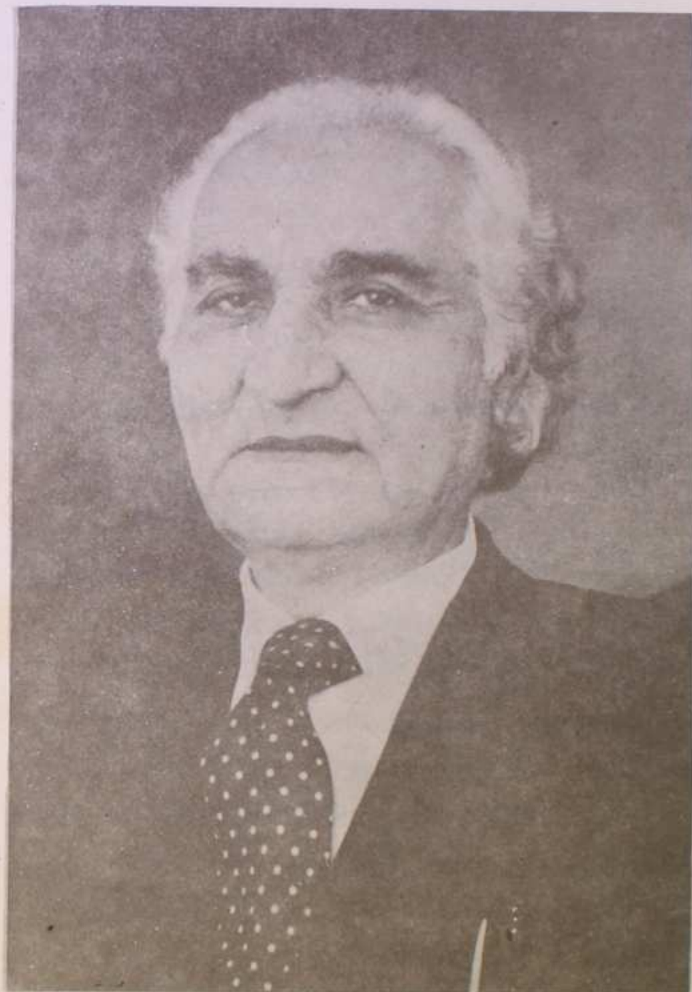
ـــــ

ہوشمندوں نے کہا ہر بزدلی کو مصلحت   جانبِ مقتل گئے تو حرفِ دیوانے گئے

ـــــ

●●

اختر سعید خاں



اختر سعید خاں (پ ۳ر اکتوبر ۱۹۲۳ء بھوپال)

عکسِ تحریر

لب سکوت پہ اک حرف بے نوا ہی نہیں
وہ رات ہے کہ کسی کو سحر دعا ہی نہیں

خموش رہیے تو کیا کیا صدائیں آتی ہیں
پکار لیجیے تو کوئی مڑ کے دیکھتا ہی نہیں

جو دیکھیے تو جلو میں مہر و ماہ و نجوم
جو سوچیے تو سفر کی یہ ابتدا ہی نہیں

قدم قدم پہ ہر اک سمت آشنا سہی لیکن
گزر رہا ہوں جدھر سے وہ راستا ہی نہیں

اب اور نذر کو کیا ہے کہ زندگی لائی
گلِ صبح اگر خونِ کربلا ہی نہیں

کسی کے تم ہو کسی کا خدا ہے دنیا میں
مرے نصیب میں تم بھی نہیں خدا بھی نہیں

اس ازدحام میں کیا نام کیا نشاں اختر
ملے وہ ہنس کے مگر جیسے آشنا ہی نہیں

[illegible]
۳۰ جنوری ۸۲ء

اختر سعید خاں

میری زندگی میں کوئی واقعہ حیرت کا ہے نہ عبرت کا، اس کے سوا کیا لکھوں کہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو بھوپال میں پیدا ہوا۔ میرے والد مرحوم کا نام حامد سعید خاں ہے جو حسرت، فانی، اصغر اور جگر کے سلسلے کی ایک کڑی تھے اور ہندستان کے ادبی حلقوں میں اپنی شاعری اور شخصیت کی وجہ سے احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں جب شعر کہنا شروع کیا تھا تو دوسرے مقامات کی طرح بھوپال میں بھی غزل داغ، امیرؔ اور ان کے تلامذہ کی صدائے بازگشت بنی ہوئی تھی۔ والد صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بھوپال میں غزل کا دامن رعشہ دار ہاتھوں سے چھڑا کر ان ہاتھوں میں دے دیا جو جنوں کی حکایات نئے خون سے لکھ رہے تھے۔

مجھے اردو کا قاعدہ میری ماں نے پڑھایا۔ رائسین کا مڈل اسکول میری پہلی درسگاہ ہے، جب کچھ چل نکلا تو والد صاحب نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مقدمۂ باقیات فانی اور اصغر گونڈوی کے مجموعہ نشاطِ روح پر اقبال سہیل کا لکھا ہوا تبصرہ پڑھایا، ان مضامین کے معانی و مطالب برسوں بعد میری سمجھ میں آئے لیکن یہ ضرور ہوا کہ میری روح کو شعر سے نسبت پیدا ہو گئی۔ اسی دوران فارسی کی متداول کتابیں اپنے پھوپا مولوی یعقوب علی خاں صاحب مرحوم سے پڑھیں جو اپنے وقت کے زبردست عالم تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے والد صاحب مجھے اور میرے چھوٹے بھائی اظہر سعید خاں

کو جو میرے ہم سبق تھے لاہور لے گئے اور سر عبدالقادر کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے علامہ تاجور نجیب آبادی کی نگرانی میں دیال سنگھ کالج میں داخل کرا دیا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ہم دونوں بھائی قانون کی تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیے گئے۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم یونیورسٹی سے ہم دونوں نے درجۂ اوّل میں ایل۔ ایل۔ بی۔ کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۴۷ء سے بھوپال ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ اطہر ۱۹۷۰ء میں پاکستان چلے گئے اور میں اسی دیار میں ہنوز وکالت کر رہا ہوں:

او بہ صحرا رفت ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

میری پرورش جاگیردارانہ فضا میں ہوئی ہے، میرے دادا احمد سعید خاں اور والد دونوں جاگیردار تھے اور والیانِ بھوپال سے متوسل تھے۔ لیکن ان کی زندگیوں میں جاگیرداری کی خو بو نہیں تھی۔ اسی لیے میں بھی اس افسانوی سماج کا کردار نہیں بن سکا۔ میرے اسلاف سرحد کے پٹھان تھے، پردادا حکیم محمد سعید خاں بچپن میں ہندوستان آ گئے تھے اور طب کی تکمیل کے بعد بھوپال کے خاندانِ شاہی کے طبیب ہو گئے تھے۔ دادا نے بھی طب میں دستگاہ حاصل کی تھی لیکن اسے پیشہ نہیں بنایا۔ وہ قدیم تہذیب اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا نمونہ تھے اور بڑے کنبے کے کفیل۔ ولی عہد بھوپال کے ہمدم و دمساز تھے اور نواب ولی عہد انھیں شرافت پناہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ والد صاحب مشرقی علوم اور اگلی شرافتوں کے پاسدار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اور مجلسی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت کی تشکیل میں عاقلانہ انکار اور عاشقانہ اقرار کو بڑا دخل تھا۔ ان کی زندگی محبت اور شاعری سے عبارت تھی۔ ان کا دائرۂ احباب نوابزادگان سے لیکر شہر کے ناکسوں تک وسیع تھا اور ان کا گھر شعرا اور ادبا کا مہمان خانہ تھا۔ ان کی شانِ بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے نہ اپنی زندگی کو اہمیت دی نہ شاعری کو۔ وہ "بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں" کے مثال ۱۹۶۰ء کے اوائل میں رخصت ہو گئے۔

صحت مند اور خوبصورت روایات کی وراثت سے دستبردار ہوئے بغیر میں ۱۹۴۴ء سے ادب کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوں، اور ترقی پسندی میرا ذہنی رویہ بن چکی ہے۔ میں نے ترقی پسندی کو کبھی اس کے محدود معانی میں سمجھا نہ برتا ہے۔ شاید اسی لیے میری چالیس سالہ سیاسی، سماجی اور ادبی زندگی آسمانوں میں پرواز کرنے کے بجائے زمین پر بسنے والے انسانوں کے دلوں کی دھڑکن سننے میں گزری ہے اور محبت میرے فکر و عمل کی روح رواں ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ پیشہ وارانہ مصروفیت نے مجھے بہت سے مفید کام نہیں کرنے دیے۔

انتخابِ کلام

مزہ تو جب ہے کہ میں تجھ سے مانگ لوں تجھکو ——— پھر اپنے جذبۂ گستاخ کی سزا مانگوں

اختر یہ تیرے پاؤں کے کانٹے نئے نہیں ——— کانٹوں سے کھیلتا ہوا چھالا عجیب ہے
اے دشتِ جنوں گواہ رہنا ——— کانٹے ہیں اور اِک برہنہ پا ہے
چمن آرائی تھی جس گل کا شیوہ ——— مری راہوں میں کانٹے بو گیا ہے
کب بادِ صبا آئی، کب گل کا پیام آیا ——— ٹوٹا جو کوئی چھالا، کانٹوں کا سلام آیا
کانٹوں کی خلش سے ہر لحظہ پھولوں کی طلب بڑھتی ہی گئی ——— صحرا سے گزر کر دیوانہ، نزدیک گلستاں آ ہی گیا
مبارک خضر کو لطفِ حیاتِ جاوداں اختر ——— محبت کی حیاتِ مختصر کچھ اور ہوتی ہے
پلک جھپکتے ہی ہر لمحہ نقشِ ماضی تھا ——— سکونِ لمحہ حاصل مجھے ملا ہی نہیں
پروردگار حوصلۂ یک گناہ دے ——— دم گھٹ رہا ہے عشق کو توفیقِ آہ دے
اجل کے سینے میں چبھ رہا ہے خزاں کے دل میں کھٹک رہا ہے ——— وہ اِک لمحہ اڑا لیا ہے جو ہم نے کھلتی ہوئی کلی سے
وہ زندگی تھی، آپ تھے، یا کوئی خواب تھا ——— جو کچھ تھا ایک لمحے کو بس سامنا ہوا
وہ ایک لمحہ جو مری گرفت میں نہ آسکا ——— لئے حیاتِ جاوداں قریب سے گزر گیا
یہ جو ملتی ہے ترے غم سے غمِ دہر کی شکل ——— دل نے تصویر سے تصویر اتاری ہوگی
غمِ جہاں میں غمِ دل شمار ہو کے رہا ——— یہ فیصلہ بھی سرِ کوئے یار ہو کے رہا
فکر و فن جاگ اٹھے، لوح و قلم جاگ اٹھے ——— زندگی جن سے عبارت ہے وہ غم جاگ اٹھے
نیرنگیٔ نشاطِ تمنا عجیب ہے ——— کچھ شام سے قفس میں اجالا عجیب ہے
ہر خواب اعتبار شکستوں سے چور ہے ——— دل میں مگر غرورِ تمنا عجیب ہے
اک نہ اک عنوان شرحِ آرزو کرتے رہو ——— کچھ زمانے کی کچھ اپنی گفتگو کرتے رہو
چند ذرّے دل کے رقصاں ہیں فضاؤں میں ابھی ——— لاؤ ان ذروں میں حشرِ آرزو برپا کریں
اِک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہوگی ——— رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہوگی
جھونکوں میں ہوا کے جل رہے ہیں ——— شمعِ سرِ رہ گزار ہیں ہم!
چمن میں جرم ٹھہرایا گیا تھا مسکرانے کو ——— مگر پھولوں نے ہنس ہنس کر بدل ڈالا زمانے کو
بلا سے تیرہ شبی کا جواب لے آئے ——— بجھے چراغ تو ہم آفتاب لے آئے

میں وہ رہرو ہوں کہ ہر موڑ پہ منزل کی طرف ______ پہلے میں بڑھتا ہوں اور راہنما میرے بعد

لو موت کے سنگین پہرے سے اک غم جواں ٹکرا ہی گیا ______ مر مر کے بالآخر انساں کو جینے کا سلیقہ آ ہی گیا

میں نے سنا تھا سورج نکلے ڈھل جاتی ہے رات ______ میں نے دیکھا صبح بھی نکلی رات کی پہرے دار

یہ دل کبھی صبح حشر سے نہیں ہے کم کسی طرح ______ گر جو ہم نے کاٹ دی وہ رات ہی کچھ اور تھی

سحر ہوئی تو ماحصل یہ تھا شبِ امید کا ______ جو اعتبار تھا گیا جو انتظار تھا رہا

ہر شاخ پہ کانٹے تھے نگراں، ہر موڑ پہ گلچیں تھے لیکن ______ کلیوں نے چٹکنا سیکھ لیا، پھولوں کو مہکنا آ ہی گیا

اِدھر سے بھی گزر جائے بہارِ زندگی اکثر ______ دیارِ ہند میں آباد ویرانے ہزاروں میں

جب بھی بڑھتا ہے اندھیرا سوئے دل ______ یہ چراغ اور بھی لَو دیتا ہے

ہمصفیرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا ______ یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہو گی

یہ زمانہ مجھے جب زخم نیا دیتا ہے ______ اک چراغ اور بھی سینے میں جلا دیتا ہے

حوصلے دل کے بہت عشق بڑھا دیتا ہے ______ جو بھی غم دیتا ہے طاقت سے سوا دیتا ہے

بلندی سے ہماری سمت ہنس کر دیکھنے والو! ______ بلندی خود ہمارے سامنے خم ہے جہاں ہم ہیں

آثار اچھے نہیں شبِ ہجر ______ دل کو کچھ کچھ قرار سا ہے

قریب و دور کچھ پرچھائیاں سی ساتھ چلتی ہیں ______ نہ جانے یہ تمہاری یاد کے سائے ہیں یا تم ہو

پتہ یوں تو شگفتِ گل سے بھی ملتا ہے موسم کا ______ جو دیوانے سے ملتی ہے خبر کچھ اور ہوتی ہے

ہوئی جو صبح تو اشکوں سے جگمگا اٹھی ______ جو آئی شام تو یادوں سے مشکبار گئی

کس کے ہاتھوں بک جائے یہ کن داموں معلوم نہیں ______ دل کی قیمت دونوں عالم دل کی قیمت ایک نظر

مدت سے لاپتہ ہے خدا جانے کیا ہوا ______ پھرتا تھا ایک شخص تمہیں پوچھتا ہوا

شاید چمن میں جی نہ لگے لوٹ آؤں میں ______ صیاد رکھ قفس کا ابھی در کھلا ہوا

ہوئے جب وہ پرسانِ غم کھو گئے ہم ______ جہاں جاگنا تھا وہیں سو گئے ہم

کچھ ترے ساتھ زندگی گزری ______ کچھ تری یاد میں گزاری ہے

بچا بھی لائیں جو ہم جلوہ گاہ جاناں سے ______ یہ چوٹ کھائی ہوئی زندگی کہاں گزرے

رنگِ گل رنگِ بتاں رنگِ جبینِ محنت
جو حسیں رنگ ہے شامل مری تصویر میں ہے

اس طرف بھی کوئی خوشبو سے مہکتا جھونکا
اے صبا تو نے تو وہ زلف سنواری ہوگی

سارا بدن ہے دھوپ میں جھلسا ہوا اگر
دل پر جو پڑ رہا ہے وہ سایا عجیب ہے

پھینکے نہیں ہیں آج تک ریزہ ہائے دل
ٹوٹے تعلقات کا رشتہ عجیب ہے

عالم اک انتظار کا ہے
کھلتا نہیں انتظار کیا ہے

ہے دیدنی رنگ روئے قاتل
ہر زخم جواب مانگتا ہے

یا رب ترا کمال ہنر ہم پہ ختم ہے
یا صرف مشق ناز کا اک تجربہ ہیں ہم

اس راز کو بھی فاش کر اے چشم دل نواز
کانٹا کھٹک رہا ہے یہ دل میں کہ کیا ہیں ہم

کل اس زمیں پہ اتریں گے پھولوں کے قافلے
اک پیکر بہار کی آواز پا ہیں ہم

قیمت دل کا مجھے اندازہ کچھ ہو تو سہی
پھر چرا لینا نگاہیں پہلے دیکھو تو سہی

کچھ نظر آتا تو ہے وہم و یقیں کے درمیاں
یہ مرا سایہ ہے یا میں ہوں بتاؤ تو سہی

پل رہا ہو لائق تعبیر شاید کوئی خواب
میری ان اجڑی ہوئی آنکھوں میں جھانکو تو سہی

جز اجل کیا کچھ نہیں ہے اب علاج زندگی
چارہ ساز و غمگسار و منھ سے بولو تو سہی

بند رکھو گے دریچے دل کے یارو کب تلک
کوئی دستک دے رہا ہے اٹھ کے دیکھو تو سہی

میں دستِ بے ہنر میں ایک پتھر ہوں ہنر والو
مجھے پھر سے تراشو مجھ کو تاب زندگی دے دو

الگ رہنے دو اس کو عشق کی پامال رسموں سے
یہ اک نازک سا رشتہ جسکو میں سمجھوں نہ تم جانو

عجیب مرحلے تھے وہ رہِ حیات کے جہاں
نہ دل سا راہزن رہا نہ غم سا رہنما رہا

میں سوچتا ہوں تیرے ساتھ زندگی میں کیا نہ تھا
میں دیکھتا ہوں تجھ سے چھوٹ کے زندگی میں کیا رہا

سلگتے خوابوں کی بستی ہے رہگزار حیات
یہاں دھواں ہی دھواں ہے ذرا سنبھل کے چلو

جو زخم دے کے گئی ہے ابھی نسیم سحر
سکوت گل سے عیاں ہے ذرا سنبھل کے چلو

روش روش ہے گزرگاہ نکہت برباد
کلی کلی نگراں ہے ذرا سنبھل کے چلو

لوگ ڈھونڈا کیے آئینوں میں اپنے چہرے
ہم نے پتھر میں بھی جھانکا تو صنم جاگ اٹھے

آبلہ پا ہی سہی لیکن مری رفتار تو دیکھ
گرد میں سوئے ہوئے نقش قدم جاگ اٹھے

آج بھی دشتِ بلا میں نہر پر پہرا رہا / کتنی صدیوں بعد میں آیا مگر پیاسا رہا
اک سلگتا آشیاں اور بجلیوں کی انجمن / پوچھتا کس سے کہ میرے گھر میں کیا تھا کیا رہا

جان دی کس کے لیے ہم یہ بتائیں کس کو / کون کیا بھول گیا یاد دلائیں کس کو
جرم کی طرح محبت کو چھپا رکھا ہے / ہم گنہگار نہیں ہیں یہ بتائیں کس کو
روٹھ جاتے تو منانا کوئی دشوار نہ تھا / وہ تعلق ہی نہ رکھیں تو منائیں کس کو
کوئی پرسانِ وفا ہے نہ پشیمانِ جفا / زخم ہم اپنے دکھائیں تو دکھائیں کس کو

ہوائے موسمِ دیوانہ گر کچھ اور ہوتی ہے / چمن والو بہاراں کی سحر کچھ اور ہوتی ہے

کتابِ زندگی اس گھر کی دیواروں پہ لکھ آئے / اب اس کے بعد باقی کیا ہے موضوعِ سخن اختر
جو تھیں کچھ دھڑکنیں دل میں سب اس کے نام کر آئے / کوئی ایسے سے کرتا کیا حساب جان و تن اختر
گئی ہوں گی وہ نظریں دور تک میرے تعاقب میں / کلیجے سے لپٹ کر آ گئی ہے اک کرن اختر
یہ شمعِ رہگزر ہے اس کو جلنے دو ہواؤں میں / تہِ دامن نہیں رکھتے چراغِ فکر و فن اختر
جہاں مصلوب ہیں حرف و نوا زر کی صلیبوں پر / وہاں بھی ہم سے دیوانے ہیں اک نعرہ زن اختر

ہم کدھر نکل آئے کون سی یہ منزل ہے / قطعِ عمر آساں ہے قطعِ راہ مشکل ہے
محوِ خواب دنیا کی بیکراں خموشی میں / جو مہک اٹھے گل ہے جو دھڑک اٹھے دل ہے

اس کا کیا ذکر کہ وہ شخص پرایا بھی تھا / مجھ سے جو کٹ گئے ان میں مرا سایا بھی تھا
ہم ادھر سیرِ چمن ہی کو نہیں آئے تھے / صبح دم نرم ہواؤں کو جگایا بھی تھا

وہاں پہنچ کے بے خبر کوئی ہوا تو کیا ہوا / میں جلوہ گاہِ ناز میں یہیں سے بے خبر گیا
ترے بغیر زندگی کو ڈھالنے چلا تھا میں / جو آج سامنا ہوا میں زندگی سے ڈر گیا

کہیں کس سے ہمارا کھو گیا کیا / کسی کو کیا کہ ہم کو ہو گیا کیا
کھلی آنکھوں نظر آتا نہیں کچھ / ہر اک سے پوچھتا ہوں وہ گیا کیا
مجھے ہر بات پر جھٹلا رہی ہے / یہ تجھ بن زندگی کو ہو گیا کیا
اداسی راہ کی کچھ کہہ رہی ہے / مسافر راستے میں کھو گیا کیا

کچھ بھی اے گردشِ ایام یاد آتا نہیں / جب سے وہ بچھڑے ہیں اپنا نام یاد آتا نہیں

جانے کیا کیا کہہ گیا آشوبِ غم میں تجھ کو میں ۔۔۔ تیرے سر لیکن کوئی الزام یاد آتا نہیں
جیسے سب طے ہو چکے ہوں زندگی کے مرحلے ۔۔۔ سوچتا ہوں اور کوئی کام یاد آتا نہیں

پھونک ڈالے تپشِ غم تو برا بھی کیا ہے ۔۔۔ چند یادوں کے سوا دل میں رہا بھی کیا ہے
بے نوا ہوگا نہ اس شہر میں ہم سا کوئی ۔۔۔ زندگی تجھ سے مگر ہم کو گلا بھی کیا ہے
کہیں اک آہ میں افسانے بیاں ہوتے ہیں ۔۔۔ ہم نے اس دشمنِ ارماں سے کہا بھی کیا ہے
زندگی چھین لے بخشی ہوئی دولت اپنی ۔۔۔ تو نے خوابوں کے سوا مجھ کو دیا بھی کیا ہے

اسی نگاہ نے مارا الم پرستوں کو ۔۔۔ وہی نگاہ مری زندگی سنوار گئی
زمینِ کوئے ملامت بھی خیر راہ میں تھی ۔۔۔ کہاں کہاں لیے موجِ خرامِ یار گئی

صفحۂ ہستی پہ اب تک نقش ہیں سب ناتمام ۔۔۔ چشم خوں بستہ رکھو دل کو لہو کرتے رہو
شوخیٔ دستِ جنوں کے ہم بھی قائل ہیں مگر ۔۔۔ جب ذرا فرصت ملے دامن رفو کرتے رہو

وہم و خیال کی طرح کٹتے ہیں زندگی کے دن ۔۔۔ قہر یہ ہے کہ زندگی وہم و خیال بھی نہیں
آخر کار زندگی خاک اڑا کے رہ گئی ۔۔۔ دامنِ ماہ و سال میں گردِ ملال بھی نہیں

میں نے جس خواب کو آنکھوں میں بسا رکھا ہے ۔۔۔ تو بھی ظالم مرے اس خواب کی تعبیر میں ہے

میں نے مانا ایک نہ اک دن لوٹ کے تو آ جائے گا ۔۔۔ لیکن تجھ بن عمر جو گزری کون اسے لوٹائے گا
کتنی یادیں کتنے قصے نقش ہیں ان دیواروں پر ۔۔۔ چلتے چلتے دیکھ لیں مڑ کر کون یہاں پھر آئے گا

یہ کس امید پر اٹھ آئے تھے ہم انکی محفل سے ۔۔۔ ابھی تک تو اجل آئی نہ وہ آئے منانے کو
کہیں ایسا نہ ہو تم نے مجھے دل سے بھلایا ہو ۔۔۔ بہت جی چاہتا ہے ان دنوں آنسو بہانے کو

چھیڑ کے قصے مہر و وفا کے باتیں لوگ بنائیں گے ۔۔۔ تم سے چھٹ کر جینے والے جی کے بہت شرمائیں گے
اگلی بہار میں اے دل والو چاکِ جگر کی باری ہے ۔۔۔ پچھلے جنوں کے تار گریباں اب کے کام نہ آئیں گے

ایک سایہ ہے کہ پیچھا کر رہا ہے آج بھی ۔۔۔ کون ہے یہ جو مجھے پہچانتا ہے آج بھی
اَن گِنت صدیوں سے ہوں آوارۂ دشتِ حیات ۔۔۔ اس خرابے سے مگر رشتہ نیا ہے آج بھی

پھر رہا ہوں کو بہ کو زنجیرِ رسوائی لئے ۔۔۔ ہے تماشا سا تماشا زندگی کے نام پر
کچھ علاج ان کا بھی سوچا تم نے اے چارہ گر ۔۔۔ وہ جو دل توڑے گئے ہیں دلبری کے نام پر

کچھ نہ نکلا دل میں داغِ حسرتِ دل کے سوا ہائے کیا کیا تہمتیں تھیں آدمی کے نام پر
کوئی پوچھے میرے غمخواروں سے تم نے کیا کیا خیر اس نے دشمنی کی دوستی کے نام پر

عشق بن کیا ملا زمانے کو فطرتِ عشق میں خلل ہی سہی
خواب کیا کیا دکھا گئی اختر عمر اک لمحہ ایک پل ہی سہی

قدم قدم پہ چمن میں خزاں کے پہرے تھے مگر اشارۂ فصلِ بہار ہو کے رہا

نظر اٹھے تو نہ سمجھوں جھکے تو کیا سمجھوں سکوتِ ناز یہ پیرایۂ بیاں کیا ہے
بہیں نہ آنکھ سے آنسو تو نغمگی بے سود کھلیں نہ پھول تو رنگینیٔ فغاں کیا ہے

پھرتی ہے زندگی جنازہ بدوش بت بھی چپ ہیں خدا بھی ہے خاموش
اک تعلق قدم کو راہ سے ہے میں نہ آوارہ ہوں نہ خانہ بدوش

کبھو آندھیوں سے آئیں کبھو برق سے جلائے یہ رہا مرا نشیمن کوئی آنکھ تو اٹھائے
وہی رزم گاہِ ہستی میں رجز بنے ہوئے ہیں جو ترے لیے لکھے تھے وہی گیت کام آئے

ہر ایک غم سے سلامت گزر گیا ہے دل خدا کرے کہ محبت کی تاب لے آئے
گئے تھے ہم بھی ان آنکھوں سے مانگنے کیا کیا وہی ہوا کہ بس اک اضطراب لے آئے

ہم بھی ناواقف نہیں آدابِ محفل سے مگر چیخ اٹھیں خاموشیاں تک ایسا سناٹا بھی کیا
بے طلب اک جستجو سی بے سبب اک انتظار عمرِ بے پایاں کا اتنا مختصر قصہ بھی کیا

تنہا تو زمانے سے تم جیتے نہ ہم جیتے کچھ حسن بھی کام آیا کچھ عشق بھی کام آیا
اس جانِ تکلم سے جب کھل کے ہوئیں باتیں پھر جا کے یہ تھوڑا سا اندازِ کلام آیا

بن کھلی ایک کلی پہلو میں ہم بھی اے بادِ صبا رکھتے ہیں
بکنے والو تمھیں کچھ بولو وہ تو چپ ہیں جو خدا رکھتے ہیں

اک فسانہ بنا گئیں ہم کو چھوٹی چھوٹی کہانیاں دل کی

کس بات پہ شرمسار ہو تم دامن چپ ہے لہو بھی چپ ہے
کیا کھیل تھا دل کا توڑ دینا اب میری طرح سے تو بھی چپ ہے

جب کبھی بیتے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہوں کوئی آواز میں آواز ملا دیتا ہے

گزر دے مجھے جس کے حضور مرحلہ ہائے حیات
میری وہ دیوانگی اہلِ خبر کیا ہوئی

نہیں موقع یہ پرسشِ غم کا
دیکھئے دل دکھا ہوا ہے ابھی
کل گزر جائے دل پہ کیا معلوم
عشق سادہ سا واقعہ ہے ابھی

تصویر ہیں تیری آرزو کی
بگڑے بھی تو شاہکار ہیں ہم
اک رسم تھی زندگی سو ہولی
نازاں ہیں نہ شرمسار ہیں ہم

کتنی تعبیروں کو آنکھوں میں بسا رکھا ہے
زندگی تیرا ہر اک خواب ادھورا ہی سہی
رہنے والے ہیں اسی شہر کے ہم بھی لوگو
آن بیٹھے ہیں تو رسم و رہِ دنیا ہی سہی

چھوڑ کے وحشت گھر بیٹھے تھے لوگوں کے سمجھانے سے
چار ہی دن میں گھر کی صورت ملنے لگی ویرانے سے
آنکھ چرا کر بزم میں اس نے دل کا پتہ تو بتلایا
جانے کیا کیا راز کھلیں گے اس کے آنکھ ملانے سے
دل میں نہیں اک بوند لہو کی آنکھ سے آنسو ٹپکے کیا
خاک اڑے جب میخانے میں کیا چھلکے پیمانے سے

جس اندازِ شگفتِ گل پہ دنیا جان دیتی ہے
وہ اندازِ شگفت گل مجسم ہے جہاں ہم ہیں

بنیں گے سینکڑوں قصے اس اجنبی پن کے
کبھی کبھی مجھے پہچان بھی لیا کیجے
چھڑی ہوئی تھیں چمن میں بہار کی باتیں
صبا گزرتے ہوئے کہہ گئی لسنا کیجے

ایک ہے حسن و عشق کا عالم
شعلہ شعلہ شبنم شبنم
ایک ہی رنگ رخ ہے فروزاں
آنچل آنچل پرچم پرچم
اہلِ ستم کیا سوچ رہے ہو
زخم تو نکلا زخم کا مرہم

کون سر پھوڑ کے مرتا ہے کسی کے در پر
ختم ہو جائے گی تہذیبِ وفا میرے بعد

کس جرم آرزو کی سزا ہے یہ زندگی
ایسا تو اے خدا میں گنہگار بھی نہیں

تو بھی مسافر، میں بھی مسافر
اے خضرِ منزل بس خضرِ منزل

صرف حسرت نہ ہوا ایسا کوئی ارمان نہیں
زندگی ہم پہ ترا ایک بھی احسان نہیں

کبھی تو آئیں گی شامیں جمال صبح لیے
یہ پھیلتے ہوئے سائے ڈرائیں گے کب تک

ختم کب ہوئیں ابھی ظلمتیں حیات کی
یہ تو آپ آ گئے، روشنی سی ہو گئی

کہاں تک ہم سے کترائے گی دنیا
جہاں ہم ہیں وہیں آئے گی دنیا

وہ زندگی تھی آپ تھے یا کوئی خواب تھا
جو کچھ تھا ایک لمحہ کو بس سامنا ہوا

وہ آ رہے ہیں دیکھنے خود زخمِ دل کو آج
یوں ہے تو پھر خدا انھیں میری نگاہ دے

کوئی ہو بزم ترا ذکر چھیڑ دیتا ہوں
ترے بغیر ادھورے ہیں میرے افسانے

دیکھے ہوئے ہوں کتنے میرے ارمانوں کے خواب
آج تو ہر آرزو سے زندگی شرمائے ہے

کاروبارِ زیست میں دل سے تعلق ہو نہ ہو
یہ مگر سچ ہے کہ تجھ بن جی بہت گھبرائے ہے

تو نہیں تیرا تصور بھی نہیں پھر کون ہے
یہ جو شمعِ زندگی کی لو بڑھاتا جائے ہے

کچھ بھی نہ تعلق ہونے پر دل سے یہ تعلق باقی ہے
کچھ بھولی ہوئی سی آوازیں آتی ہیں برابر کانوں میں

کیا جانئے اہلِ درد ترے کس دشتِ جنوں میں رہتے ہیں
دیکھے نہ گئے گلزاروں میں پائے نہ گئے ویرانوں میں

نہ عشق جرم ہے کوئی نہ آرزو گناہ ہے
مجھے فریب دیجئے نہ خود فریب کھائیے

ہمیشہ آپ ہی کی جیت کیوں ہو دل کے کھیل میں
کبھی شکست دیجئے کبھی شکست کھائیے

مٹا دیے ہیں ترے غم نے تفرقے کیا کیا
اجل کو اہلِ محبت حیات کہتے ہیں

کلی کے بعد کلی مسکرانے لگتی ہے
اسی کو ہستیِ گل کا ثبات کہتے ہیں

کیا کہہ دیا میری خامشی نے
چپ ہو گئے دل دکھانے والے

سرسراہٹ یہ گزرتے ہوئے لمحات کی ہے
راہ تکتی ہے یہاں کوئی نہ آیا نہ گیا

نہ اٹھی میری نواؤں سے قیامت نہ سہی
ایک آہٹ تو ہوئی ایک دریچہ تو کھلا

یہ ایک عالمِ خواب سا ہے بھرم اسی سے ہے زندگی کا
جو آنکھ کھل جائے اتفاقاً تو دم نکل جائے آدمی کا

رہے جو روشن تو رہنما ہیں جو بجھ گئے تو سحر نشاں ہیں
چراغ کی طرح جل رہے ہیں جنھیں سلیقہ ہے زندگی کا

اپنے دلِ پرخوں کی گلابی ہی بہت ہے
اوروں کے سمندر سے پیالے نہیں بھرتے

کچھ اور نہ تھا پاس تو زخموں کی قبا تھی
آتی جو ادھر فصلِ جنوں ہم بھی سنورتے

وہ قتل گہِ جاں میں کیا دادِ وفا چاہے
جو ٹوٹے ہوئے دل کو انعامِ وفا جانے

آغازِ تبسم سے انجامِ تبسم تک
کھلنا ہے کہ مرجھانا کلیوں کی بلا جانے

فروغِ صبح کی تا صبح گفتگو تو رہے
رہیں نہ ہم مگر ایک شمعِ آرزو تو رہے

نظر فریبیٔ گلہائے نقشِ پا معلوم
تمام عمر مگر تیری جستجو تو رہے

دل کو کیا روئیے اس خاک میں رکھا کیا تھا
کچھ نہیں کچھ بھی نہیں کشمکشِ عشق کا راز

اب اتنا بھی نہ اتراز زندگی اپنی اداؤں پر
زمانہ ہو گیا اس راہ سے گزرے ہوئے تجھ کو
خبر کیا تھی کہ دل کی ایک اک رگ ٹوٹ جائیگی

اے جانِ چمن روحِ چمن میرے وطن جاگ

متاعِ حسن گراں عشق بے سر و ساماں

یہ حیات مختصر اور یہ ہماری تیز گامی

بدل چکی رت مگر ابھی تک فضا میں کچھ دھوپ چھاؤں سی ہے

وہی اک آرزو جو کارفرمائے غمِ دل ہے
بیاں کیا ہو کشاکش زندگی کی مختصر یہ ہے

ہم نے دیکھا ہے پر آشوب مآلِ دل کا
کیا ملا دیدۂ مشتاق کو اے دستِ جنوں

سعئ ز فا اتنی بھی کیا رائگاں
یوں تو اندھیرا ابھی قیامت کا ہے
اس کی گلی بھی ہے بس اک رہ گزر

جو موت کے سنگین پہرے سے اک عزمِ جواں ٹکرا ہی گیا
اندازِ تغافل دیکھ کے ہم اٹھ آئے تری محفل سے مگر

جب سے ہم نے کھولیں آنکھیں نیند گئی آرام گیا
راہ بتائی مجھ کو سب نے اپنوں نے بیگانوں نے

بچھڑنا اک قیامت ہو گیا
جہانِ رنگ و بو میں کیا رکھا ہے

چلے تھے لئے سر میں سودائے منزل

ایک شعلے کے سوا چند شراروں کے سوا
نگہِ ناز کے مبہم سے اشاروں کے سوا

بہت نزدیک سے دیکھی ہیں سب رعنائیاں تیری
مجھے گھیرے ہوئے ہیں آج تک پرچھائیاں تیری
بظاہر کس قدر معصوم تھیں انگڑائیاں تیری

تو گلشن خوابیدہ ہے ویرانہ نہیں ہے

وہی ہوا کہ ہم اپنا تمھیں بنا نہ سکے

ابھی صبح تھی کہانی ابھی شام ہے فسانہ

حسین مکھڑوں کی چاندنی سے سیاہ زلفوں کی برہمی سے

کہیں نغمہ، کہیں نالہ، کہیں شورِ عنادل ہے
میں جینا چاہتا ہوں اور جینا سخت مشکل ہے

اے محبت کی نظر پھر وہی فتنہ نہ اٹھا
ہم نہ کہتے تھے کہ رہنے دے یہ پردہ نہ اٹھا

دوست ہے دشمن سے سوا بدگماں
ہائے مگر رات کی تنہائیاں
راہ روِ شوق کی منزل کہاں

مر مر کے بالآخر انساں کو جینے کا سلیقہ آ ہی گیا
پلکوں سے ٹپک کر اک آنسو تاریخِ وفا دہرا ہی گیا

حاصلِ زیست وہی تھی شاید عمر کٹی جو غفلت میں
لیکن اختر ساتھ نہ آیا کوئی کبھی راہِ غربت میں

بہت نزدیک آنا بھی برا ہے
مگر دیکھو تماشا مفت کا ہے

خدا جانے کس راہ میں کھو گئے ہم

چمکتے ہیں اب بھی ستاروں میں اختر　　وہ آنسو جو اس خاک میں بو گئے ہم

دل کو جنّت کے تصور سے بھی بہلایے کیا　　وہ بھی بگڑی ہوئی اک شکل ہے ارمانوں کی

اگر شعورِ وفا ہے ان کو تو اک نہ اک دن وہ جان لیں گے　　سکوت بے مدعا نہیں ہے زبان بے التجا نہیں ہے

دیکھا تو زحمتِ زیست سے بڑھ کر کوئی بیداد　　سمجھے تھے کہ جینے کی سزا اور ہی کچھ ہے

تم نے نباہ کیوں نہ کی تم سے سوال کیا کریں　　فکرِ مآل تھا کسے رنجِ مآل کیا کریں

کس پیکرِ جمال کی ہے دل کو جستجو　　تصویر ذہن میں ہے نہ صورت نگاہ میں
زعمِ خرد، بساطِ جنوں، ہمتِ نگاہ　　دیکھا ہے ہم نے سب کو تری جلوہ گاہ میں

متاعِ ہستی لٹا رہا ہوں ہنوز اس تیرہ خاکداں میں　　جہاں لہو قیمتِ جگر ہے نہ اشک آنکھوں کی آبرو ہے
مثالِ سبزہ چمن میں روندے گئے ہیں ہم بار بار لیکن　　جو تھا وہی عزمِ زندگی ہے، جو تھی وہی گرمیٔ نمو ہے

تم سے شکوہ تو نہیں مجھ کو مگر غور کرو　　تم ہنسو توڑ کے دل اور میں رو بھی نہ سکوں

ہنسی رکتی نہیں اہلِ قفس کی　　سلام اے خندۂ صبحِ گلستاں
بہت نزدیک سے گزرا ہے کوئی　　شرار جستہ ہے خونِ رگِ جاں

دیکھوں تو قفس کی تیلیوں سے　　آئے کہ گئے بہار کے دن

اب کھلا جب بھولنے بیٹھا ہوں اک بے مہر کو　　کتنا یاد آتا ہے وہ جس کو بھلایا جائے ہے
پھر کوئی دامن ہو یا اپنا گریباں ایک ہے　　آدمی جب انتہائے غم سے گھبرا جائے ہے

ہوا نہ ختم اندھیرا مگر یہ کیا کم ہے　　گزرنے والے شبِ غم سے شمع سا گزرے
انہیں کی یاد سے کچھ روشنی رہی دل میں　　جو لمحے تیری محبت میں رائگاں گزرے
بچا بھی لائیں جو ہم جلوہ گاہِ جاناں سے　　یہ چوٹ کھائی ہوئی زندگی کہاں گزرے

ترا جمال کہ خوابیدہ روح جاگ اٹھی　　ترا شباب کہ آنکھوں میں نیند بھر آئی

جب بھی ہم تجھ سے نہ ملنے کی قسم کھاتے ہیں　　اور بھی کچھ ترے نزدیک نظر آتے ہیں
ان سے چھٹ کر دلِ بیتاب کا عالم مت پوچھ　　کوئی آتا ہو، سمجھتا ہے کہ وہ آتے ہیں

کہیں لے جائے مجھے گردشِ دوراں لیکن　　زندگی کھینچ کے در پر ترے لے آتی ہے

جو کبھی پورے نہیں ہوتے ہیں
خواب وہ بھی تو حسیں ہوتے ہیں
آگ کچھ ایسی لگی ہے دل میں
جلتے ہیں خاک نہیں ہوتے ہیں

بزم فلک سے ٹوٹ کے تارے کن آنکھوں میں ڈوب گئے
جب تک تم نہ اٹھاؤ نظریں بھید یہ کیسے پائیں ہم
فصل بہار میں شاخ گل بھی اپنا عالم رکھتی ہے
لیکن تم تو اور ہی کچھ ہو کس سے تم کو ملائیں ہم

چلیں کہ بیٹھ رہیں شرم نارسائی سے
زمیں رکے گی نہ اپنی شکستہ پائی سے
کھلی فضا بھی کوئی سیر کے لیے ہوگی
نکل کے دیکھ نہ لیں آپ کی خدائی سے
سخن شناس نہ ہو آشنائے راز تو ہے
وہ آنکھ ہو گئی نم میری بے نوائی سے

وہ چراغ وہم و خیال تھے جو جلا جلا کے بجھا دئے
یہ چراغ دل ہیں ستمگرو جو جلا دئے سو جلا دئے
جو ہوس کے نام پہ زندگی نے لکھے تھے میرے حساب میں
تری اک نگاہ نے مسکرا کے وہ سارے قرض چکا دئے
کسی اور وضع کے پیرہن سے سجاؤ قامت عشق کو
جو ملے تھے ہم کو وراثتہً وہ لباس ہم نے جلا دئے

گونجتی ہے خود اپنی ہی آواز
نہ کوئی ساز ہے نہ پردۂ ساز

جب وہ گھر چھوٹ گیا قید رہی کس گھر کی
اب جہاں چاہے مجھے گردش دوراں لے جائے

گل بداماں موسموں کو کچھ ہمیں سے لاگ ہے
جب ہوا سنکی چمن میں زخم دل کا چھل گیا

اب نہ اپنی ہے نہ کچھ ان کی خبر کیا کہنا
زندگی تیری یہ دزدیدہ نظر کیا کہنا

ہم کو ہر رنگ میں ہر حال میں جینا آیا
عشق بن کس کو بتاؤ یہ قرینا آیا

حشر پہ موقوف ہے پھر کس لیے ہر فیصلہ
تو زمیں کا بھی خدا ہے آسمانوں کے خدا

کوئی نغمہ کوئی خوشبو، کوئی تارہ کوئی پھول
اک نہ اک چیز تری یاد دلا دیتی ہے

شبنمی یادیں، سلگتے خواب، لو دیتے خیال
دل کے سب قصے تری چاہت کا عنواں ہو گئے

خموش رہیے تو کیا کیا صدائیں آتی ہیں
پکاریے تو کوئی مڑ کے دیکھتا بھی نہیں
کسی کے تم ہو کسی کا خدا ہے دنیا میں
مرے نصیب میں تم بھی نہیں خدا بھی نہیں

کون پس نقاب ہے تو ہے کہ میری آرزو
اب یہ نقاب تو اٹھا یا مجھے اختیار دے

اک ذرا دیکھ مری آنکھوں میں
زندگی تیری حقیقت کیا ہے

ہم میں یا اور دانش ماضی کا عذاب — عہدِ نو تیری بشارت کیا ہے

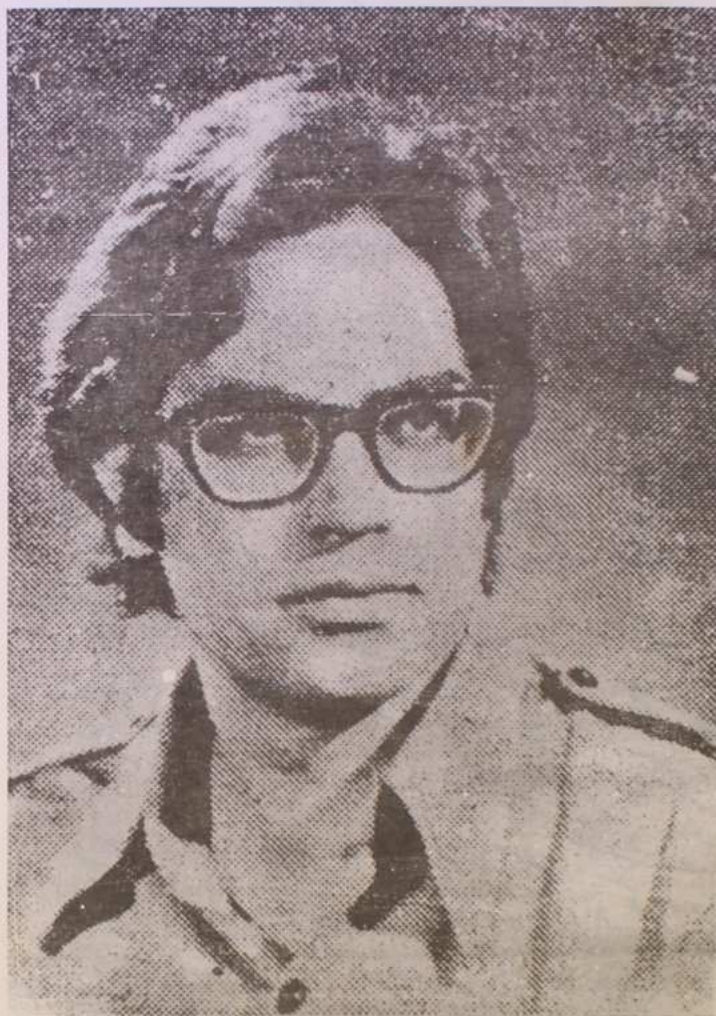
عشق میں ترکِ رسمِ جنوں پر لوگ نہ دیں الزام بہت — ان کے بھی کچھ اپنے غم تھے ہم کو بھی تھے کام بہت

بہت طویل سفر تھا یہ طے ہوا کیسے — ترے بغیر یہاں تک میں آگیا کیسے

بلا تھی ساعتِ اوّل سے انتظار کی شام — نہ جانے آخرِ شب دل ٹھہر گیا کیسے

••

افتخار عارف



افتخار عارف (پ۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۳ء)

عکسِ تحریر



یہی مشقِ تیر و سنان و سنگ بہانہ کر
گلِ کلاہِ امیرِ شہر نشانہ کر
یہی دبدبہ یہی طنطنہ یہی طمطراق
اسی طمطراق کی ٹھوکروں میں روانہ کر
ترے سر پہ خاک جو از راہِ سفر نہ ڈھونڈ
تجھے موت آئے دل اسقدر بھی برا نہ کر
وہ بات جس سے نزار ہے تری جان زار
وہی بات کہہ کے کہ ادائے فرضِ زمانہ کر
وہی خوف جس سے لرز رہا ہے ترا وجود
اسی خوف کو ہدفِ دعائے شبانہ کر
ترا رزق جو سببِ مرض ہے تو اب کے بار
ذرا جسم کے ردّ و بالِ درہم و دانہ کر

افتخار عارف

افتخار حسین عارف ولادت ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء وطن لکھنؤ۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ فرنگی محل میں ہوئی پھر دو ایک برس شیعہ اسکول لکھنؤ میں، پھر جوبلی اسکول اور جوبلی کالج میں، یہ کالج اپنے زمانے میں اچھا سمجھا جاتا تھا، علامہ اختر علی تلہری، حامد اللہ افسر میرٹھی، علی عباس حسینی جیسے اساتذہ اس ادارے سے وابستہ رہ چکے تھے، پھر لکھنؤ یونیورسٹی ۔ وہیں سے ایم ۔ اے ۔ ایس بھگتایا، بچپن کا لکھنؤ بڑے معرکے کا شہر تھا مسعود حسن ادیب اور احتشام حسین کا لکھنؤ، آرزو اور یگانہ اور مجاز کا لکھنؤ، ابن حسن نونہروی، مولانا سید علی نقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا کلب حسین، مولانا عبدالباری کا لکھنؤ، علماء، علماء اور محققین میں کس کس کا ذکر کیا جائے شاید ہی کوئی اور شہر اس عہد میں ایسا ہے کہ جہاں بیک وقت اتنے مختلف شعبوں میں اتنی تعداد میں شخصیتیں موجود ہوں ممکن ہے لاہور دہلی مستثنیٰ ہوں، شعر و حرف کا مجلسوں کے راستے سے لگا، مرثیے کی مجلسوں نے ذہنی تربیت گاہوں کا کام کیا، اس کا فیضان ابھی تک جاری ہے۔

۱۹۶۵ء میں پاکستان کو وطن کیا، ریڈیو پاکستان پھر ٹیلی ویژن سے وابستگی ہوئی۔ سینئر پروڈیوسر پھر پاکستان کے اسکرپٹس ایڈیٹر کی حیثیت سے۔ ۱۹۷۷ء میں مستعفی ہوا، تب بی۔ سی۔ سی۔ آئی کے ادارے سے وابستہ ہوا اور اب بھی ان کے ایک ذیلی ادارے میں کام کرتا ہوں۔ اردو مرکز لندن کا اعزازی سکریٹری ہوں اور یہاں برطانیہ میں بی۔ بی۔ سی ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے اردو کے پروگرام کبھی کبھار کرتا رہتا ہوں۔ EMI کی ریکارڈنگ کمپنی نے ۱۹۷۷ء میں میری ان غزلوں اور گیتوں کا لانگ پلے جاری کیا تھا جو پاکستان کے ممتاز موسیقاروں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے گائے تھے۔

"مہر دو نیم" کے نام سے پہلا شعری مجموعہ پہلے کراچی سے پھر لندن اور دہلی سے شائع ہوا، اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب پر پاکستان میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے 1984 کی بہترین کتاب کا ایوارڈ ملا تھا پھر 1988 میں ہندستان میں عالمی اردو کانفرنس کی جانب سے فیض احمد فیض ایوارڈ ملا اور لکھنؤ میں فیض عالمی سیمینار کے موقع پر بھی اسی طرح کا اعزاز۔ کلام کا انگریزی ترجمہ THE TWELFTH MAN کے نام سے برلینڈا واکر نے کیا ہے جو لندن سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

بدیسی شاعری کے کچھ ترجموں کی کتاب بھی بن رہی ہے۔

انتخاب کلام:

سمندر اس قدر شوریدہ سر کیوں لگ رہا ہے
کنارے پر بھی ہم کو اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے
کاروبار جنوں عام تو ہے مگر اک ذرا مختلف ہے

ہم نے اک کتاب سادات ایک اک ورق پڑھ کے دیکھی
متن میں جانے کیا کچھ لکھا ہے مگر حاشیہ مختلف ہے

نئے سکندر ہیں اور ظلمات کا سفر بھی نیا نیا ہے
فریب کی منزلوں میں انداز حیلہ گر بھی نیا نیا ہے

کڑی کمانوں کے تیر بے اعتبار ہاتھوں میں آ گئے ہیں
دعا نہ تھی سو اب یہ خمیازۂ اثر بھی نیا نیا ہے

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

یہی مشقِ تیر و سنان و سنگ بہانہ کر
گہر کلاہِ امیرِ شہر نشانہ کر

حسین تم نہیں رہے تمہارا گھر نہیں رہا
مگر تمہارے بعد ظالموں کا ڈر نہیں رہا

حضور شافعِ محشر علی کہیں کہ یہ شخص
گناہگار بہت ہے مگر حسین کا ہے

خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

تم سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان! بہت شرمندہ ہیں

سخنِ حق کو فضیلت نہیں ملنے والی
صبر بے دادِ شجاعت نہیں ملنے والی

راس آنے لگی دنیا تو کہا دل نے کہ جا
اب تجھے درد کی دولت نہیں ملنے والی

ہم تو سدا کے بندۂ زر تھے ہمارا کیا
نام آورانِ عہدِ بغاوت کو کیا ہوا

اک چہرہ منکشف ہوا ایسا کہ ساری عمر
آئینے پوچھتے رہے حیرت کو کیا ہوا

ہم اہلِ دل میں محبت کی نسبتوں کے امین
ہمارے پاس زمینوں کا گوشوارہ نہیں

شہرِ گل کے خس و خاشاک سے خوف آتا ہے
جس کا وارث ہوں اسی خاک سے خوف آتا ہے

خاک میں شوکتِ پندارِ انا ملتی ہے
اپنی مٹی سے بچھڑنے کی سزا ملتی ہے

حریمِ لفظ میں کس درجہ بے ادب نکلا
جسے نجیب سمجھتے تھے کم نسب نکلا

سیاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگارِ شب نکلا

ہم اہلِ جبر کے نام و نسب سے واقف ہیں
سروں کی فصل جب اتری تھی تب سے واقف ہیں

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے
بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے

اسی کو بات نہ پہنچے جسے پہنچنی ہے
یہ التزام بھی عرضِ ہنر میں رکھا جائے

اب بھی توہینِ اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

ایک اور تازیانۂ منظر لگا ہمیں
آئے ہوائے تازہ نئے پر لگا ہمیں

ندی چڑھی ہوئی تھی تو ہم بھی تھے موج میں
پانی اتر گیا تو بہت ڈر لگا ہمیں

گڑیوں سے کھیلتی ہوئی بچی کی آنکھ میں
آنسو بھی آ گیا تو سمندر لگا ہمیں

یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

کسی اہل ہجر کی بد دعا ہے کہ خود سری کا قصور ہے
یہ جو بات بن کے بگڑ رہی ہے تو کوئی بات ضرور ہے
میں چراغ لے کے ہوا کی زد پہ جو آ گیا ہوں تو غم نہ کر
میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ہاتھ پہ ایک ہاتھ ضرور ہے

لوگ پہچان نہیں پائیں گے چہرہ اپنا
اب نہ بدلے تو بدل جائے گا نقشہ اپنا

کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا
جہان رزق میں توقیر اہل حاجت کیا
شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

یہ تیرے میرے چراغوں کی ضد جہاں سے چلی
وہیں کہیں سے علاقہ ہوا کا لگتا ہے

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اسکو گھر کر دے

وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے
صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

سارے شہر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں

قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
سیروں کو خیال بال و پر شاید نہ آئی

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیہ کے ساتھ
رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

ایک ذرا سی موت کے بل پر اندھیاروں سے بیر
پاگل دیئے ہواؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
ہم نے چپ رہنے کا عہد کیا ہے اور کم ظرف
ہم سے فن آرائی جیسی باتیں کرتے ہیں

بادل بادل گھومے پر گھر لوٹ کے آنا بھولے ناں
اللہ سائیں ڈار سے بچھڑے کونج ٹھکانہ بھولے ناں
جب کبھی اجلے اجلے دن پر ٹوٹ کے برسے کالی رات
ایک اپنی بستی کے نام کا دیا جلانا بھولے ناں
باغ بغیچے میرے جب جب نذر لہو کی چاہیں (؟)
میری برکت والی مٹی مجھے بلانا بھولے ناں

یہ بستی جانی پہچانی بہت ہے
یہاں وعدوں کی ارزانی بہت ہے
شگفتہ لفظ لکھے جا رہے ہیں
مگر لہجوں میں ویرانی بہت ہے
سبک ظرفوں کے قابو میں نہیں لفظ
مگر شوق گل افشانی بہت ہے

شکستہ پر جنوں کو آزمائیں گے نہیں کیا
اڑانوں کے لیے پر پھر اٹھائیں گے نہیں کیا

ہوائیں مہرباں تھیں منتقم کیوں ہو گئی ہیں
نگہ دارانِ ساحل کچھ بتائیں گے نہیں کیا

کوئی ہنستا ہوا سورج پسِ دیوارِ تاریک
فروزاں ہو تو دیواریں گرائیں گے نہیں کیا

دہی پہلی سی ارزانی سرِ بازارِ پندار
نظر آئے تو ہم قیمت بڑھائیں گے نہیں کیا

سوادِ تشنگی کے پار اک مواجِ دجلہ
غزل خواں ہو تو پھر تیشہ اٹھائیں گے نہیں کیا

بدلتے موسموں کی دھول ہوتے راستوں کو
تھکے ہارے مسافر یاد آئیں گے نہیں کیا

غمِ جہاں کو شرمسار کرنے والے کیا ہوئے؟
وہ ساری عمر انتظار کرنے والے کیا ہوئے؟

بہم ہوئے بغیر جو گزر گئیں وہ ساعتیں
وہ ایک ایک پل شمار کرنے والے کیا ہوئے؟

دعائے نیم شب کی رسم کیسے ختم ہو گئی!
وہ حرفِ جاں پہ اعتبار کرنے والے کیا ہوئے؟

کہاں ہیں وہ جو دشتِ آرزو میں خاک ہو گئے
وہ لمحۂ ابد شکار کرنے والے کیا ہوئے؟

طلب کے ساحلوں پہ جلتی کشتیاں بتائیں گی!
شناوری پہ اعتبار کرنے والے کیا ہوئے؟

مرا ہر لفظ بے توقیر رہنے کے لیے ہے
مرا ہر خوف دامن گیر رہنے کے لیے ہے

میں جس شہرِ جمال آثار کا مارا ہوا ہوں
وہ سارا شہر بے تعمیر رہنے کے لیے ہے

میں ایسے خواب کی پاداش میں معتوب ٹھہرا
جو ساری عمر بے تعبیر رہنے کے لیے ہے

ذرا سی دیر میں بجھ جائیں گے سب مہر و مہتاب
یہ دعویٰ کیا کہ ہر تنویر رہنے کے لیے ہے

ذرا سی دیر میں دھندلا کے رہ جائیگا ہر نقش
گماں یہ تھا کہ ہر تصویر رہنے کے لیے ہے

نہ یہ آب و ہوائے شہرِ جسم و جاں دوامی
نہ میرے درد کی جاگیر رہنے کے لیے ہے

نہ اقلیمِ ہنر میں عظمتِ غالب سلامت
نہ اعجازِ کلامِ میر رہنے کے لیے ہے

کہیں محفوظ ہے لوحِ فنا پر ایک تحریر
بالآخر اک وہی تحریر رہنے کے لیے ہے

امید و بیم کے محور سے ہٹ کے دیکھتے ہیں
ذرا سی دیر کو دنیا سے کٹ کے دیکھتے ہیں

بکھر چکے ہیں بہت باغ و دشت و دریا میں
اب اپنے حجرۂ جاں میں سمٹ کے دیکھتے ہیں

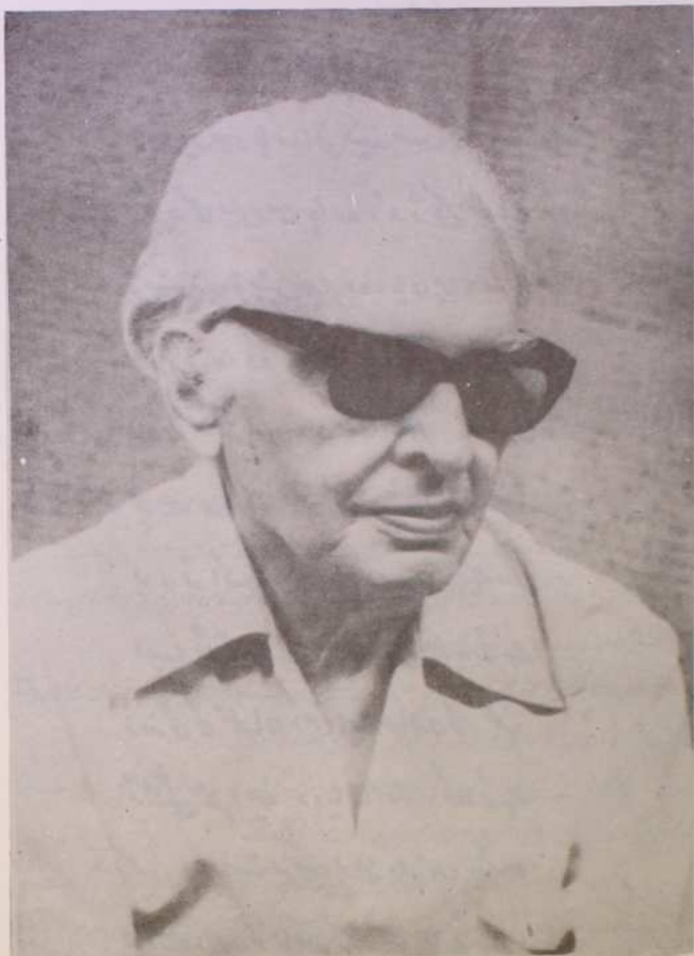
تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات
سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں

پھر اس کے بعد جو ہونا ہے ہو رہے سرِ دست
بساطِ عافیتِ جاں الٹ کے دیکھتے ہیں

وہی ہے خواب جسے مل کے سب نے دیکھا تھا
اب اپنے اپنے قبیلے میں بٹ کے دیکھتے ہیں

سنا ہے کہ سبک ہو چلی ہے قیمتِ حرف
سو ہم بھی اب قد و قامت سے گھٹ کے دیکھتے ہیں ••

غلام ربانی تاباں



غلام ربانی تاباں　　　پ: ۱۵ر فروری ۱۹۱۴ء

عکسِ تحریر

غزل

رہگزر ہو یا مسافر نیند سب کو آئے ہے
گرد کی میلی سی چادر اوڑھ کے سو جائے ہے

قربتیں ہی قربتیں ہیں دوریاں ہی دوریاں
آرزو جادو کے صحرا میں مجھے دوڑائے ہے

میری آشفتہ سری وجہِ شناسائی ہوئی
مجھ سے ملنے روز کوئی حادثہ آجائے ہے

یوں تو اک حرفِ تسلی بھی بڑی شے ہے مگر
ایسا لگتا ہے وفا بے آبرو ہو جائے ہے

زندگی کی تلخیاں دیتی ہیں خوابوں کو جنم
تشنگی صحرا میں دریا کا سماں دکھلائے ہے

کس طرح دشتِ ہنر میں بو دیئے گئے ہیں ڈنک
درد کے ماروں کو تاباں کون سمجھا پائے ہے

(غلام ربانی تاباں)

غلام ربانی تاباں

اتر پردیش کے ضلع فرخ آباد کی ایک تحصیل ہے قایم گنج۔ میرے بچپن میں یہ سماجی اور معاشی اعتبار سے پچھڑا ہوا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اب اُس نے خاصی ترقی کرلی ہے اور ہندستان کے صنعتی نقشے پر اپنی جگہ بنا چکا ہے۔

قایم گنج سے تھوڑی دور واقع گاؤں پتورا کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے میں ۱۵ر فروری ۱۹۱۴ء کو میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں پائی۔ کرسچین ہائی اسکول، فرخ آباد سے میٹرک کیا۔

میرے گھر میں پڑھنے لکھنے کا زیادہ چرچا نہیں تھا۔ میرے دونوں بڑے بھائی کالج نہیں گئے تھے۔ اس کے علاوہ دیہات میں بچپن کی شادی کا رواج تھا۔ ابھی میں میٹرک بھی نہیں کر پایا تھا کہ میری شادی کردی گئی۔

پھر بھی لڑ جھگڑ کے میں کالج چلا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ، سینٹ جانس کالج آگرہ سے بی۔ اے اور آگرہ کالج، آگرہ سے ایل ایل۔ بی کیا اور ۱۹۴۰ء میں فتح گڑھ میں وکالت شروع کردی۔

چوتھی دہائی میں کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی لیکن اس کے کچھ کارکنوں نے طالب علموں سے روابط قائم کرلیے تھے۔ وہ ہاسٹل آتے تھے اور ہمیں کتابیں وغیرہ پہنچاتے رہتے تھے۔ وہ لوگ ایک خفیہ اسٹڈی سرکل بھی چلاتے تھے، جسمیں اکثر میں جایا کرتا تھا۔

پانچویں دہائی کے ابتدائی برسوں میں پارٹی پر سے پابندی ہٹا دی گئی اور فتح گڑھ میں بھی ایک چھوٹا سا پارٹی یونٹ بن گیا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ عملی سیاست میں حصہ لینے لگا۔ ۱۹۴۶ء میں کسان سبھا گڑھ کے سلسلے میں کچھ اور دوستوں کے

ساتھ میں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن انگریزوں کا چل چلاؤ تھا۔ دو چار پیشیوں کے بعد مقدمہ واپس لے لیا گیا اور ہم سب بری کر دئے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں مجھے دوبارہ گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ جب جیل سے رہا ہوا تو میرے والد نے کہا کہ فتح گڑھ میں رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ دِقت یہ تھی کہ میری وکالت چلتی نہیں تھی۔ سچ پوچھئے تو مجھے اُس میں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ گھر سے پیسے مل جاتے تھے جس سے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ والد کی مالی مدد کے بغیر فتح گڑھ میں رہنا ممکن نہ تھا۔ گاؤں میں رہنے پر میں خود کو آمادہ نہ کر سکا۔ چنانچہ گھر چھوڑ دیا۔ کچھ دن اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد دہلی پہنچا اور مکتبہ جامعہ میں ملازمت کر لی۔ جامعہ ملیہ کا ماحول کچھ ایسا راس آیا کہ یہیں کا ہو گیا۔ ۱۹۵۷ء میں مکتبہ جامعہ کا جنرل منیجر بنا دیا گیا اور ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہوا۔ جامعہ نگر سے تھوڑے فاصلے پر ایک نئی کالونی تعمیر ہوئی ہے جس کا نام ذاکر نگر ہے۔ آج کل وہاں رہتا ہوں۔

یوں تو کالج میں پیروڈی لکھنے لگا تھا لیکن میں نے سنجیدگی کے ساتھ شعر کہنا ۱۹۴۱ء میں شروع کیا۔ جیسا کہ شاید سبھی کرتے ہیں میں نے بھی شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ سال دو سال غزلیں کہتا رہا۔ پھر نظم کہنا شروع کر دی۔ میرا پہلا انتخاب "سازِ لرزاں" کے نام سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا جس میں دو تین غزلوں کے علاوہ سب نظمیں ہیں۔ اُس مجموعے کی اشاعت کے بعد میں نے شعر کہنا قریب قریب ترک کر دیا۔ بات یہ ہے کہ میں اپنی نظموں سے مطمئن نہیں تھا۔ ان میں سے کچھ مجھے پسند تھیں اور آج بھی پسند ہیں لیکن فی الجملہ مجھے انتخاب کمزور معلوم ہوا۔ چنانچہ اگلے دو تین سال میں نے کلاسیکی ادب کے گہرے مطالعے میں صرف کئے اور ۱۹۵۳ء کے اواخر سے غزل کہنے لگا۔ میری غزلوں کا پہلا انتخاب ۱۹۶۰ء میں 'حدیثِ دل' کے نام سے شائع ہوا۔ اُس کے بعد ۱۹۷۰ء میں 'ذوقِ سفر' اور ۱۹۷۶ء میں 'نوائے آوارہ' شائع ہوئیں۔

گنگا کے کنارے آباد فتح گڑھ ایک چھوٹی سی صاف ستھری اور خوبصورت بستی ہے۔ اُس زمانے میں جنگ کی وجہ سے چھاؤنی کی آبادی بڑھتی گھٹتی رہتی تھی مگر سول آبادی آٹھ دس ہزار سے زیادہ نہیں تھی جو بیشتر حصہ حکام، وکیلوں، چھوٹے موٹے کاروبار کرنے والوں اور ملازمت پیشہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ وہاں کوئی ادبی انجمن تھی نہ ادب سے دلچسپی لینے والے لوگ۔ کبھی کبھی چھوٹے بڑے مشاعرے ضرور ہو جاتے تھے۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی نو سال کنویں کے مینڈک کی طرح گزارے۔ کچھ رسالوں میں میری نظمیں چھپنے لگی تھیں، کچھ ادیب دوستوں سے مراسلت کا سلسلہ بھی قائم ہو گیا تھا پھر بھی مجموعی اعتبار سے میں گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کا ایک اجتماع ہوا تھا۔ میں نے اس میں شرکت کی تھی لیکن ترقی پسند دوستوں سے متعارف ہونے کا موقع ملا بھوپال کانفرنس میں جو غالباً ۱۹۴۹ء کے اوائل میں منعقد ہوئی تھی۔ دہلی آنے کے بعد میں ترقی پسند تنظیم کا باقاعدہ رکن بنا اور آج تک اس میں شامل ہوں۔ اس وقت میں نیشنل فیڈریشن آف پراگریسو رائٹرز کی مجلس صدارت کا صدر ہوں۔ کئی بین الاقوامی ادبی کانفرنسوں میں شرکت اور سوویت یونین کے علاوہ یورپ اور وسطی ایشیا کے کئی ملکوں کا سفر کر چکا ہوں۔ دو مجموعے

ترتیب دیے (۱) "غمِ دوراں" (۲) "شکستِ زنداں"، جن میں سے "شکستِ زنداں" ضبط کی جا چکی ہے۔
انگریزی میں بھی لکھتا رہتا ہوں۔ انگریزی کے مضامین کا ایک انتخاب POETICS to POLITICS کے نام سے چھپ چکا ہے۔ مندرجہ ذیل کتابوں کا ترجمہ اردو میں کر چکا ہوں:

(1) FREEDOM STRUGGLE

(2) THE ROLE OF CENTRAL LEGISLATURE IN FREEDOM STRUGGLE

(3) THE RISE AND GROWTH OF ECONOMIC NATIONALISM IN INDIA
By Dr. Bipin Chandra

(4) ECONOMIC HISTORY OF INDIA, PART I AND PART II
By R.C.Dutt

(5) THE GAZÁTEER OF INDIA, VOL.II (HISTORY AND CULTURE)

(6) SOME ASPECTS OF MUSLIM ADMINISTRATION
By Dr.R.P.Tripathi

(7) HISTORY OF FREEDOM MOVEMENT IN INDIA, VOL.II
By Dr.Tara Chand

(8) NATIONALISM AND COMMUNAL POLITICS IN INDIA
By Dr.Musheerul Hasan

۱۹۷۱ء میں صدر جمہوریہ نے پدم شری کے اعزاز سے نوازا لیکن ۱۹۷۸ء میں جنتا حکومت کی منفی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر میں نے پدم شری واپس کر دیا۔ ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۶ء میں بالترتیب "ذوقِ سفر" اور "نوائے آوارہ" پر اردو اکیڈمی کے پہلے انعام ملے۔ ۱۹۷۳ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا۔ ۱۹۷۹ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا، ۱۹۸۲ء میں مودی غالب ایوارڈ ملا، ۱۹۸۳ء میں یوپی اردو اکیڈمی کا اسپیشل ایوارڈ ملا، ۱۹۸۶ء میں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ ملا۔ ۱۹۸۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کا ممبر منتخب ہوا۔

انتخابِ کلام

کوچۂ شوق رہِ فکر و نظر سے گزرے
نقشِ پا چھوڑ گئے ہم تو جدھر سے گزرے

چمن میں کس نے کسی بے نوا کا ساتھ دیا
وہ بوئے گل تھی کہ جس نے صبا کا ساتھ دیا

تجھے خبر بھی نہیں ہے کہ دل کی دھڑکن نے
کہاں کہاں تری آوازِ پا کا ساتھ دیا

یہ سوچتا ہوں کہ دستورِ آشیاں بندی
پیامِ مرگ نہ بن جائے بال و پر کے لیے

رات زلفوں سے کرے شوخ اندھیروں کا سوال
روشنی موجِ جبیں سے مہِ تاباں مانگے

اک چراغ اور سرِ رہگذر بادِ صبا
چار تنکوں کے لیے کون گلستاں مانگے

زلف اڑتی ہوئی رخسار فروزاں کے قریب
رات دیکھا تھا دھواں شعلہ تاباں کے قریب

تشنہ کاموں کو خبر دو کہ مرے ساقی نے
میکدہ کھول دیا گلشنِ مژگاں کے قریب

سحر سے مل تو گیا سلسلہ اُجالے کا
حیاتِ شمع نے بجھنے کو عارضی پائی

راہ میں کتنے رفیقانِ سفر چھوٹ گئے
دور تک یادِ رفیقانِ سفر ساتھ چلی

ہر اک موڑ پہ جلتے ہیں منزلوں کے چراغ
تھکا ہوا یہ مسافر کدھر کدھر جائے

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

منزلوں سے بیگانہ آج بھی سفر میرا
رات بے سحر میری، درد بے اثر میرا

دورِ کم عیاری ہے کچھ پتا نہیں چلتا
کون میرا قاتل ہے، کون چارہ گر میرا

کچھ بتاؤ تو آخر کیا جواب دوں اُس کو
اِک سوال کرتا ہے، روز مجھ سے گھر میرا

جب دل پہ پڑا ہے تری آواز کا سایہ
کچھ دیر کو آلامِ جہاں بھول گیا ہوں

کیوں سجائے بیٹھے ہو انتظار کی محفل
کس کو اتنی فرصت ہے کون روز آتا ہے

یہ چار دن کی رفاقت بھی کم نہیں اے دوست
تمام عمر بھلا کون ساتھ دیتا ہے

پھر آج دل سے مخاطب ہے شب کا سناٹا
پھر آج صبح تلک اُن کی گفتگو ہوگی

جنوں کا شغل سلامت، رفو کی فکر نہ کر
کسے خبر ہے کہ کب فرصتِ رفو ہوگی

قریب آگیا دامن تو ہاتھ کھینچ لیا
بدل بدل دیے آدابِ آرزو میں نے

نزدیک سے کھلتے نہیں تصویر کے جوہر
دیدار کی حسرت ہے تو ہو جاؤ ذرا دور

عام حالات میں کچھ بھی نہیں اک قطرۂ آب
آنکھ میں اشک بنے پھول پہ شبنم بن جائے

میں کہ جس راہ سے گزروں وہ بنے راہ صلیب
تو کہ جس سنگ کو چھو دے بتِ مریم بن جائے

جدھر بھی جاؤ گے ڈوبیں گے شب کے سناٹے
کہاں کا قصد ہے ہر راہ سو گئی ہوگی

یہ تشنگی جسے ہونٹوں کی آبرو کہیے
نجانے کتنوں کو ظالم ڈبو گئی ہوگی

میں کہ آوارہ کسی موجِ صبا کی صورت
مجھ سے منسوب کوئی راہگزر بھی نہ ہوئی

آنسوؤں سے کوئی آواز کو نسبت تو نہیں
بھیگتی جائے تو کچھ اور نکھرتی جائے

کس کو پڑی ہے کون بٹائے کسی کا غم　　اپنی صلیب آپ اٹھائے ہوئے ہیں ہم

چند یادوں کے علاوہ چند زخموں کے سوا　　زندگی کی شام میں کیا ہے سحر میں کیا نہ تھا
شورشیں ہی شورشیں تھیں زندگی ہی زندگی　　سوچیے تو ایک مشت بال و پر میں کیا نہ تھا

میں جی رہا ہوں کسی موج تہ نشیں کی طرح　　مرے سکون کو تم اضطراب بھی سمجھو
مسافروں سے بھی نازک ہیں راستوں کے مزاج　　وہ پیچ و خم ہی سہی پیچ و تاب بھی سمجھو

کیا خبر تھی ٹوٹے گا جب طلسم سمتوں کا　　میری طرح آوارہ ہوگی میری منزل بھی

تمام دانش و حکمت کی انتہا معلوم　　سوال الجھے ہوئے ہر جواب میں ہوں گے

رہ و رسم شوق کی قید بھی بڑی خوشگوار سی قید تھی　　مجھے یوں لگا کوئی شاخ گل مرے بال و پر میں الجھ گئی

شکستہ ہوں تو کسی عہد کی زباں بن جائیں　　طلسم و سحر سہی، بام و در سے دور نہیں
سکوت راز کہو یا سکوت مجبوری　　مگر لبوں کی جسارت تھی ناگوار کسے

چمن میں ہوتے ہی رہتے ہیں حادثے ورنہ　　کسی کو ایک نشیمن سے دشمنی کیا تھی
ذرا سی بات کی احباب سے شکایت کیوں　　ہوا کے رخ کی شہادت تھی بے رخی کیا تھی

وسعت عیش فراواں کا تقاضا ہے کسے　　سر چھپانے کے لیے کوئی شجر تو ہوگا
اور کیا دامن صحرا میں ہے وسعت کے سوا　　کوئی منظر سہی تا حد نظر تو ہوگا

چارہ فرماؤں سے کیا عرض جراحت کیجیے　　خار زاروں میں علاج آبلہ پائی بھی ہے

دل کے ویرانے میں کھل جائیں جراحت کے چمن　　اسقدر یاروں سے داد آشنائی تو ملے
مصلحت کے دور میں رہ جائے دل کی آبرو　　حسن کو تاباںؔ خلوص بے وفائی تو ملے

مفت بدنام ہوئی موج شرر گلشن میں　　جس کو جلنا ہے وہ پھولوں سے بھی جل جاتا ہے
اک تصور ہے کہ بے خواب مسافر کی طرح　　رات کی رات بہت دور نکل جاتا ہے

چراغ بن کے جلے دل گلاب بن کے کھلے　　سکوں کی آس کسے ہے ملے ملے نہ ملے
ہوائے دشت بڑی خوشگوار ہوتی ہے　　یہ اور بات ہے پتا کوئی ہلے نہ ہلے
ہے یہ بھی اہل سیاست کا معجزہ تاباںؔ　　کسی کو نیند عطا ہو کسی کو خواب ملے

پھر آج کسی سوچ میں ڈوبے ہیں در و بام　　کیا جانیے کیا حادثہ بستی میں ہوا ہے

بکھری ہے سرِ راہگزر ایک کہانی
ہر میل کے پتھر پہ کوئی نام لکھا ہے

احباب سلامت ہیں تو پھولوں کی کمی کیا
ہر چند بہاروں کا فسوں ٹوٹ چکا ہے

کبھی ایسا لگا ہے درد سے دل نے شفا پائی
کبھی اک تیز نشتر تھا کہ رگ رگ میں اُتر آیا

چمن کی صبح کہئے، میکدے کی شام کہہ لیجے
بڑا دلچسپ نظارہ سرِ مقتل نظر آیا

کبھی یوں بھی ہوا ہے زندگی کے شوخ خوابوں میں
ابد کا رنگ بھرنے کے لیے دستِ ہنر آیا

اسی مٹی کا سب کچھ ہے فرازِ عرش سے تاباںؔ
نہ دل آیا، نہ غم آیا، نہ سر آیا، نہ در آیا

قربتیں ہی قربتیں ہیں دوریاں ہی دوریاں
آرزو جادو کے صحرا میں مجھے دوڑائے ہے

میری آشفتہ سری وجہِ شناسائی ہوئی
مجھ سے ملنے روز کوئی حادثہ آجائے ہے

یوں تو اک حرفِ تسلی بھی بڑی شے ہے مگر
ایسا لگتا ہے وفا بے آبرو ہو جائے ہے

کس طرح دستِ ہنر میں بولنے لگتے ہیں رنگ
مدرسے والوں کو تاباںؔ کون سمجھا پائے ہے



ہر ستم لطف ہے، دل خوگرِ آزار کہاں
سچ کہا تم نے مجھے غم سے سروکار کہاں

دشت و صحرا کے کچھ آداب ہوا کرتے ہیں
کیوں بھٹکتے ہو یہاں سایۂ دیوار کہاں

بادۂ شوق سے لبریز ہے ساغر میرا
کیسے اذکار مجھے فرصتِ افکار کہاں

کیوں ترے دور میں محروم سزا ہوں کہ مجھے
جرم پر ناز سہی، جرم سے انکار کہاں

سوچتے کیا ہو جلاتے رہو زخموں کے چراغ
دیکھئے کیا ہو ابھی، صبح کے آثار کہاں

ابروئے شوق ہے بیگانۂ منزل ورنہ
کوچۂ دار کہاں، کوچۂ دلدار کہاں

یوں تو ہر گام پہ غمخوار ملے ہیں تاباںؔ
جو مرے غم کو سمجھ پائے وہ غمخوار کہاں



لمحۂ درد کو اعجازِ تمنا جانو
ظرف کی بات ہے قاتل کو مسیحا جانو

ایک ہے موجِ صبا موجِ شرر، موجِ نمو
پھول کھل جائیں تو ظالم کا سراپا جانو

تم نے کب دیکھے وہ لمحے جو گزرتے ہی نہیں
درد کی رات کسے کہتے ہیں تم کیا جانو

وقت بے درد سہی، ساقی بے فیض سہی
مے کشو تلخی ایام کو صہبا جانو

یوں تو ہر جلوہ رنگیں کو تماشا سمجھو
ان کی محفل میں مگر خود کو تماشا جانو

عشق کرنا ہے تو آداب وفا بھی سیکھو
زہر پینا ہے تو پینے کا سلیقا جانو

دل میں خون گشتہ تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں
اب یہ تم پر ہے چمن سمجھو کہ صحرا جانو

کیسے گزرو گے مراحل سے سفر کے تاباںؔ
تم کہ منزل سے شناسا ہو نہ رستا جانو

○

ہر موڑ کو چراغ سر رہ گزر کہو
بیتے ہوئے دنوں کو غبار سفر کہو

خون گشتہ آرزو کو کہو شام میکدہ
دل کی جراحتوں کو چمن کی سحر کہو

غم ہائے روزگار کا کچھ احترام بھی
چھلکے جو کوئی جام اسے چشم تر کہو

ہر رہ گزر پہ کرتا ہوں زنجیر کا قیاس
چاہو تو تم اسے بھی جنوں کا اثر کہو

میری متاع درد یہی زندگی تو ہے
نامعتبر کہو کہ اسے معتبر کہو

دانشوران حال کا تاباںؔ ہے مشورہ
ہر منظر جہاں کو فریب نظر کہو

○

آنکھ بے وجہ بھی ہو جاتی ہے نم کیا کیجے
مفت بد نام ہوئے اُن کے ستم کیا کیجے

یوں تو سرمایہ جاں ہے مجھے یاروں کا خلوص
دل دکھا جاتی ہے ہر سعی کرم کیا کیجے

رقص میں قوس بناتی ہوئی باہنوں کی طرح
منزلوں سے بھی حسیں راہ کے خم کیا کیجے

چھو گئی پیار سے ہر درد کی ساعت دل کو
اور دنیا سے تقاضائے کرم کیا کیجے

کون پا سکتا ہم آوارہ مزاجوں کا سراغ
داستاں لکھتے گئے نقش قدم کیا کیجے

حسرت دید کی تسکین کا سامان کہاں
پتھروں میں ابھی سوتے ہیں صنم کیا کیجے

اتفاقات زمانہ ہیں خزاں ہو کہ بہار
جو گزرنا ہے گزر جائے گا غم کیا کیجے

دفعتاً جل اٹھے تاباںؔ کئی یادوں کے چراغ
آج پھر جیت گئی شامِ الم کیا کیجے



کھلیں کھلیں نہ کھلیں پھول دل کے صحرا میں
بڑی کشش ہے مگر انتظارِ فردا میں

مرا وجود کبھی جیسے بچھڑ گیا مجھ سے
عجیب حادثہ گزرا رہِ تمنّا میں

حیات صرف حقیقت نہ صرف افسانہ
کئی سراب بھی حل ہو گئے ہیں دریا میں

یہ اور بات ہے ٹوٹے نہ بے حسی کا طلسم
صدا لگاتے رہو پتھروں کے صحرا میں

خرد کے دور میں دیوانگی غنیمت ہے
بڑا سکون ملا شورشوں کی دنیا میں

کبھی یقیں ہی یقیں ہے، کبھی گماں ہی گماں
کسی کی پیاس نے افسوں بھرے ہیں صہبا میں

نشاط و غم کے تصور بدل گئے تاباںؔ
عجیب لطف تھا آزردگیٔ بیجا میں



داد بھی فتنۂ بے داد بھی قاتل کی طرف
بے گناہی کے سوا کون تھا بسمل کی طرف

منزلیں راہ میں تھیں نقشِ قدم کی صورت
ہم نے مڑ کے بھی نہ دیکھا کسی منزل کی طرف

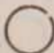
مقتلِ ناز سے گزرے تو گزرنے والے
پھول کچھ پھینک گئے دامنِ قاتل کی طرف

جھلملاتے نہیں بے وجہ تو محفل کے چراغ
اک نظر دیکھ تو لو صاحبِ محفل کی طرف

کتنی بے کیف ہیں ساحل کی فضائیں یارب
کوئی طوفان کا رُخ موڑ دے ساحل کی طرف

یاد آتا ہے وہ اندازِ تجاہل اے دوست
بات اوروں سے مگر روئے سخن دل کی طرف

ذکر آیا تھا حیاتِ ابدی کا تاباںؔ
لوگ کیوں تکنے لگے کوچۂ قاتل کی طرف



نارسائی میں فغاں کی آبرو ہے دوستو
عاشقی پیہم تلاش و جستجو ہے دوستو

آئینہ خانے میں کیا رکھا ہے حیرت کے سوا
جو نظر آتا ہے عکسِ آرزو ہے دوستو

کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا کرتے ہیں لوگ / خامشی بھی ایک طرزِ گفتگو ہے دوستو
تاک میں صہبا، گلوں میں بو، صبا میں پیچ و خم / سب کرشمہ سازیٔ ذوقِ نمو ہے دوستو
دل تو دیوانہ سہی لیکن ہوس کا کیا علاج / ہوش کا دامن بھی محتاج رفو ہے دوستو
ہر قدم پر جل رہے ہیں راہِ الفت میں چراغ / ہر قدم پر نقشِ پائے جستجو ہے دوستو
کوششِ عرضِ ہنر ظاہر ہیں تاباں کی غزل / اور در پردہ کسی سے گفتگو ہے دوستو

○

تھکے ہیں لاکھ مسافر سفر ہے کیا کیجے / ابھی وہی کششِ رہگزر ہے کیا کیجے
جنوں پہ قیدِ طلب بھی بہت گراں ہے مگر / جبیں نواز ترا سنگِ در ہے کیا کیجے
چمن میں کوئی نشیمن رہے رہے نہ رہے / بہارِ موسمِ رقصِ شرر ہے کیا کیجے
بڑا عجیب یہ آوارگی کا رشتہ ہے / غبارِ راہ بھی ہم سفر ہے کیا کیجے
تمام عمر شکستوں سے دل کو کام رہا / خلوصِ شوق رقیبِ اثر ہے کیا کیجے
شکایتِ ستمِ روزگار، لاحاصل / غمِ حیات سے کس کو مفر ہے کیا کیجے
ہنسے تھا عقل کی دیوانگی پہ کل تاباں / مگر وہ خود بھی تو آشفتہ سر ہے کیا کیجے

○

ہدفِ طنز کہ میں موردِ دشنام نہیں / پھر بھی خوش ہوں کہ ترے شہر میں گمنام نہیں
دل گزرگاہِ خزاں ہے نہ گزرگاہِ بہار / ایک بے تابِ سکوں جس کا کوئی نام نہیں
اس حقیقت پہ فسانے کا گماں ہوتا ہے / میکشی عام ہے اور تشنہ لبی عام نہیں
اتنا آساں نہیں میرا مٹانا ظالم / فکر و احساس بھی ہوں حرف ہی اک نام نہیں
اہلِ الفت کو زمانے سے شکایت کیوں ہو / درد پھر درد ہے تہمت نہیں الزام نہیں
بات بھی کرتے ہیں فطرت کے مناظر تاباں / چاندنی کیا ہے اگر چاند کا پیغام نہیں

سنگ و خشت کو تاباںؔ بام و در نہیں کہتے
ربطِ غم نہ ہو جس سے اُس کو گھر نہیں کہتے

دل سے چھین لیں جس نے لذتیں جراحت کی
اُس کو جو بھی کہتے ہوں درگزر نہیں کہتے

بات صرف اتنی ہے زندگی کی راہوں میں
ساتھ چلنے والوں کو ہم سفر نہیں کہتے

کوئی کیسے سمجھائے سادہ دل اسیروں کو
بال و پر کی حسرت کو بال و پر نہیں کہتے

نخلِ دل کی شادابی اک سراب کا عالم
دشت کو بہاروں کی رہ گزر نہیں کہتے

زندگی کا ہر منظر دلفریب و دلکش ہے
جان کے ضرر کو بھی ہم ضرر نہیں کہتے

سب چراغ بستی کے اونگھنے لگے تاباںؔ
وہ کوئی کہانی ہو رات بھر نہیں کہتے

خود نما تو کیا کہیے خود شکن سی ہوتی ہے
زندگی کہ خوابوں کی انجمن سی ہوتی ہے

ہم بھی ڈھونڈ ہی لیتے گوشۂ اماں کوئی
قید کے تصور سے اک گھٹن سی ہوتی ہے

لوگ بے زبانی کو درد کی زباں سمجھے
ورنہ دل کی بیتابی کم سخن سی ہوتی ہے

زندگی کا ہر منظر اجنبی سا لگتا ہے
اب نظر کہیں جائے بے وطن سی ہوتی ہے

دلنواز ہیں کتنی موسمی ہوائیں بھی
نرم نرم جھونکوں میں اک چبھن سی ہوتی ہے

حرفِ مدعا تاباںؔ جب کبھی لب پہ آتا ہے
دیر تک نجانے کیوں کچھ جلن سی ہوتی ہے

بے رخی بے اعتنائی کا گلا لے جائیگی
بزمِ گل سے اور کیا بادِ صبا لے جائیگی

دوست بن کر دل میں آئی تھی سکوں کی آرزو
کس نے سوچا تھا کہ سب رونق چرا لے جائیگی

شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتوں کی آخر کیا بساط
جس طرف چاہے گی جنگل کی ہوا لے جائیگی

راہرو کا ساتھ تو کیا دیگی دن کی روشنی
جاتے جاتے سارے منظر بھی اٹھا لے جائیگی

ایسا لگتا ہے کہ دریا کی کوئی بیتاب موج
ساتھ اپنے کچھ سفینے بھی بہا لے جائیگی

راس آئے یا نہ آئے مصلحت کی زندگی
در بدر رسوا کرے گی، جا بجا لے جائیگی

ذوقؔ کے مصرعے سے تاباںؔ استفادہ کیجیے
زندگی لائی تھی اک دن اور قضا لے جائیگی



سحر کے بعد بھی اکثر سحر نہیں ہوتی
ہوائے دشت بہت معتبر نہیں ہوتی

یہ افتخار بھی کیا کم ہے زندگی کے لیے
وہ بے ثبات سہی بے ہنر نہیں ہوتی

سنے گا کون ہماری کہیں تو کس سے کہیں
کہ گرد راہ دلیلِ سفر نہیں ہوتی

یہ اور بات ہے پھر کوئی حادثہ ہو جائے
مسافروں سے خفا رہ گزر نہیں ہوتی

عجیب بات ہے کس کو یقین آئے گا
اُدھر بھی ہوتی ہے منزل جدھر نہیں ہوتی

چمن میں چشم و چراغ چمن کسے کہتے
اگر سیاست برق و شرر نہیں ہوتی

مزا تو یہ ہے کہ بستی میں بے نواؤں کی
گھروں کو حاجت دیوار و در نہیں ہوتی

جہانِ غم کی روایت کا کیا گلہ تاباںؔ
طلب کی رات رہین سحر نہیں ہوتی



لطف کا ربط ہے کوئی نہ جفا کا رشتہ
دل سے کچھ اور ہے ظالم کی انا کا رشتہ

دست عیسیٰ بھی وہی، بازوئے قاتل بھی وہی
کتنا نازک ہے چراغوں سے ہوا کا رشتہ

جبر حالات کہو، غم کی مکافات کہو
ٹوٹ بھی جاتا ہے ہونٹوں سے نوا کا رشتہ

سوچیے تو سبھی اپنے ہیں کوئی غیر نہیں
حاکم شہر سے ہے جرم و سزا کا رشتہ

منظر زیست میں کچھ رنگ تو بھر دیتا ہے
خار زاروں سے کسی آبلہ پا کا رشتہ

پھول نایاب سہی، زخم تو نایاب نہیں
آج بھی دل سے وہی آب و ہوا کا رشتہ

کیا کریں رسم زمانہ کی شکایت تاباںؔ
درد سے رکھتے ہیں ہم لوگ سدا کا رشتہ

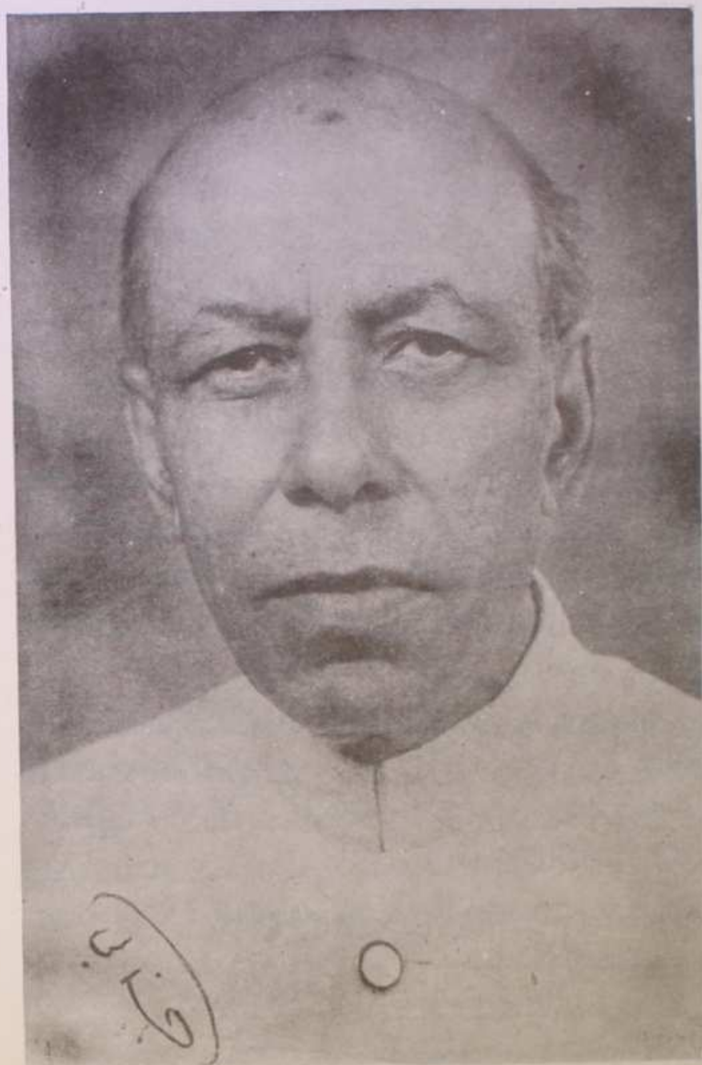


لبوں کی جہد نوا در خور اثر نہ سہی
حدیث شوق بھی کیا کم ہے کارگر نہ سہی

نجانے کس کا لہو سنگ و خشت میں ہوگا — کسی کا گھر تو ہے آخر خدا کا گھر نہ سہی
قدم قدم پہ چمن پھر بھی کھل گئے ہونگے — جنوں کی راہ بہاروں کی رہ گزر نہ سہی
عجیب بات کوئی کر گیا ہے دیوانہ — کہیں تو شمع جلے بام طور پر نہ سہی
وہی حیات کی شورش، نمو کا ہنگامہ — گلوں کی بزم تو ہے ایک مشت پر نہ سہی
کہے ہیں جس کو فسوں سازئ غزل تاباںؔ — کسی کا خواب پریشاں سہی ہنر نہ سہی

دریا تھا یا سراب دھندلکوں میں کھو گیا — ایک آسرا تھا وہ بھی سرِ شام سو گیا
پھر یوں ہوا کہ پھول کھلے دل کے آس پاس — ایسا لگا کہ دشت چمن زار ہو گیا
موجوں کا اضطراب بھی تھا، ناخدا بھی تھا — اب کیا بتائیں کون سفینہ ڈبو گیا
دیوار و در پہ لکھی ہیں کتنی کہانیاں — صدیوں کا درد شہر کی پہچان ہو گیا
لگتا ہے صحن باغ میں رقص شرر کے بعد — ہر مرحلہ بہار کا آسان ہو گیا
تاباںؔ شراب خانے میں کچھ روشنی تو ہے — مسجد بھی سو گئی ہے شوالہ بھی سو گیا

معین احسن جذبی



معین احسن جذبی　　(پ۔ ۲۱؍ اگست ۱۹۱۲ء)

عکسِ تحریر

غزل

یہ میرے شعر، یہ فن کے نکات کچھ بھی نہیں
یہ مختصر سی مری کائنات کچھ بھی نہیں

سرِ حیات جو لرزاں ہیں دو بروؤں کے
دلِ غریب ترے حادثات کچھ بھی نہیں

قریبِ وصل سلامت رہے کہ جس کے طفیل
عذابِ جان غمِ ہجراں کی رات کچھ بھی نہیں

وہ ایک بات میسر جسے نہ حرف نہ صوت
کوئی نہ سمجھے تو شاید وہ بات کچھ بھی نہیں

ترے ستم کی ہم اس انتہا کو دیکھ چکے
کہ جس کے آگے ترا التفات کچھ بھی نہیں

یہ حرفِ لاف بھی اکثر سنا ہے آجزؔ کی
کہ ہم وہاں ہیں جہاں اپنی ذات کچھ بھی نہیں

معین احسن جذبی

۲۱ر اگست ۱۹۱۲ء کو اس دنیا میں آیا۔ وطن دو پشتوں سے لکھنؤ ہے پر دادا مولوی حمزہ علی عالم تھے اور میرٹھ میں رہتے تھے۔ غدر میں میرٹھ چھوڑنا پڑا۔ سارا خاندان تتر بتر ہوگیا۔ پر دادا دانا پور (بہار) چلے گئے۔ لیکن میرے دادا ڈاکٹر عبدالغفور مظہر نے نہ معلوم کیوں دانا پور چھوڑ دیا اور یوپی میں ملازمت کرلی۔ لیکن غدر میں جو خاندان منتشر ہوا تھا اس کا ایک حصہ لکھنؤ میں آکر بس گیا۔ دادا کو پتہ چلا تو آپس میں شادی بیاہ کا سلسلہ شروع ہوا اور اس طرح لکھنؤ وطن بن گیا۔

میرے والد احسن الغفور صاحب نے علیگڑھ سے بی۔اے کیا تھا اور ڈپٹی انسپکٹر آف محمڈنز اسکول کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ یہ ایک خاص پوسٹ تھی جو بعد میں اڑا دی گئی۔ اس زمانے میں ڈپٹی انسپکٹر ایک ضلع کا نہیں بلکہ پورے ڈویژن (جس میں چار پانچ ضلعے ہوتے تھے) کا ہوتا تھا۔

میری تعلیم جھانسی، آگرہ، لکھنؤ اور علیگڑھ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے شعر و ادب سے دلچسپی تھی۔ یہ دراصل گھر کے ادبی ماحول کا نتیجہ تھی۔ ابا (دادا) کو شعر کہتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری مرحومہ پھوپھی خاتون اکرم (جن کی شادی راز ق الخیری ایڈیٹر عصمت سے ہوئی تھی اور جنھوں نے میری ماں کے انتقال کے بعد مجھے پرورش بھی کیا تھا) یا تو پڑھتی رہتی تھیں یا پھر تہذیب نسواں اور عصمت کے لیے مضامین لکھتی نظر آتی تھیں۔ قصہ مختصر یہ ماحول تھا جس میں آنکھ کھولی اور شاعری بلائے بے درماں کی طرح پیچھے لگ گئی۔ ورنہ آج یہ حشر کیوں ہوتا۔ بقول مجاز اچھے خاصے کہیں نائب تحصیلدار ہوتے۔

جس زمانے میں جھانسی اسکول میں پڑھتا تھا وہاں بہت سے ادبی ذوق کے لوگ بھی جمع ہوگئے تھے۔ ان میں دو شاعر بھی تھے۔ حامد شاہجہاں پوری اور ان کے استاد صادق دہلوی۔ اس زمانے میں کسی استاد سے اصلاح لینے کا رواج تھا۔ چنانچہ میں نے بھی ابتدا میں حامد شاہجہاں پوری اور ان کے استاد صادق دہلوی سے اصلاح لی۔ اس کا سلسلہ تین چار سال تک چلتا رہا۔ پھر میرے استاد کا ٹرانسفر ہوگیا اور میرے استاد کے استاد صادق دہلوی بھی وہاں سے چلے گئے۔ اس کے بعد مجھے اپنے پر بھروسا کرنا پڑا۔ پھر میں سینٹ جانس کالج (آگرہ) میں داخل ہوگیا۔ وہاں فانی بدایونی، میکش اکبر آبادی اور دوسرے اساتذہ سے ملاقات رہی۔ کافی دنوں تک یہ سلسلہ چلا۔ ایک دن میں فانی کی خدمت میں پہنچا۔ بہت ہی خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ انھوں نے پوچھا کیا شغل ہے آپ کا؟ میں نے کہا پڑھتا ہوں۔ کہا: کیا سبجیکٹ ہے

میں نے کہا: کمسٹری، فزکس، بائیلوجی وغیرہ۔ کہنے لگے شعر و شاعری سے کچھ شغف ہے آپ کو؟ میں نے کہا: کچھ کہہ لیتا ہوں۔ کہنے لگے کچھ سنائیے تو میں نے غزل سنائی "دل کے جذبات تو نہیں محدود" "یہ فروزاں" کی شاید دوسری غزل ہے۔ انہیں کچھ یقین سا

ٹھہر گیا۔ انھوں نے کہا کچھ اور سنایئے۔ میں نے دوسری غزل سنائی جس کا مقطع تھا:

ضبطِ غم بے سبب نہیں ہے ملالؔ ۔۔۔ خلشِ دل بڑھا رہا ہوں میں

اس زمانے میں ملالؔ تخلص کرتا تھا۔ انہیں نے بہت داد پیش کی۔ بار بار پڑھوایا۔ حالانکہ وہ داد بڑی مشکل سے دیتے تھے۔ پھر کہنے لگے "ملالؔ صاحب! میرے پاس طالب علم قسم کے بہت سے شاعر آئے۔ میں نے یہی کہا کہ خدا کے واسطے اپنی حالت پر اور شاعری کی حالت پر رحم کیجیے لیکن میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس خلش کو نہ چھوڑیے۔ انھوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ میں یہ سوچ کر مؤدب بیٹھا رہا کہ میرے استاد ہیں مجھے داد دے رہے ہیں بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ انھوں نے کہا: ملتے رہا کیجیے۔ پھر دو چار بار ان سے ملا بھی۔ یہ ۲۹ء کا واقعہ ہے۔ پھر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ ۳۴ء میں مجھے گھر چھوڑنا پڑا۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ۔۔۔ چلا گیا۔ وہاں فکرِ معاش ستاتی تھی۔ وہاں معلوم ہوا کہ ایک اسکول میں ٹیچر کے لیے جگہ نکلی ہے جو ۔۔۔۔۔۔ کے قریب ایک ریاست ۔۔۔۔۔ میں واقع تھا۔ میں انٹرمیڈیٹ کر چکا تھا، اپلائی کر دیا۔ تنخواہ پندرہ روپے ماہانہ تھی۔ وہاں کا جو اسٹیشن تھا اس سے ریاست ۶، ۷ میل ہو گی۔ وہاں چیف منسٹر سے ملے۔ ان سے کچھ سوال و جواب ہوئے۔ میرے بارے میں لکھ دیا گیا کہ میں ۔۔۔ کا باشندہ نہیں ہوں۔ وہاں سے مایوس واپس ہوئے۔ چار میل اسٹیشن تھا وہاں پیدل لفٹ رائٹ کرتے ہوئے پہنچا۔ انتہا فرسٹریشن تھا۔ میں ٹرین کا انتظار کر رہا تھا اس وقت شاید یہ شعر ہوئے تھے ؎

کسی سے حالِ دلِ بے قرار کہہ نہ سکا ۔۔۔ کہ چشمِ یاس میں آنسو بھی آکے بہہ نہ سکا

نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں ۔۔۔ یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہہ نہ سکا

یہ گویا ان اشعار کا پس منظر ہے۔ اس کے بعد میں اینگلو عربک کالج، جو اب ذاکر حسین کالج کہلاتا ہے، سے بی۔اے کر رہا تھا۔ اس سے پہلے ایک غزل اتفاق سے ہو گئی تھی، جس میں میرا کوئی دخل نہیں ہے۔ "کون کرے" والی غزل:

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے ۔۔۔ یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی ۔۔۔ اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

اس کو میں نے معمولی غزل سمجھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ اس وقت میری عمر ۱۲ سال کی تھی۔ اس کے بعد میں نے یہ غزل ۳۵ء میں "ہمایوں" کو بھیج دی۔ "ہمایوں" اس زمانے میں بہت وقیع پرچہ تھا اور اس میں چھپنا ایک بڑی بات تھی۔ اس نے بڑی آب و تاب سے اس غزل کو شائع کر دیا اور وہیں سے گویا میری شہرت کا آغاز ہوا۔ پھر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ مجھے گھر بار چھوڑنا پڑا۔ میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے والد کی تنخواہ اس زمانے میں سات یا آٹھ سو روپے تھی، اور

میری قسمت میں یوں سمجھیے کہ سات آٹھ پیسے بھی نہیں تھے۔ ان حالات میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ بنیادی طور پر یہ تحریک کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر تھی۔ ان کی POLICIES تھیں اس کے مطابق وہ شاعری کرنے لگے۔ وہ اپنے مفاد کے مطابق ہم لوگوں سے توقع کرتے تھے۔ اس کا سب سے زیادہ شکار کیفی ہوئے۔ وہ ان کی پالیسی کے مطابق کہتے ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے تھوڑا سا اختلاف رہا۔ کمیونزم کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے میں قبول کرنے کو تیار ہوں لیکن کمیونسٹ پارٹی کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کے ساتھ میں بھی بدلتا رہوں، اس کے لیے میں کبھی تیار نہیں ہوا۔ میں یاد دلاؤں جب آزادی ملی تو کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی یہ تھی کہ یہ آزادی واقعی آزادی ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک شاعر نے آزادی کا قصیدہ لکھا۔ کمیونسٹ شاعر ہیں۔ پارٹی کے ممبر ہیں۔ ۶ ماہ بعد ان کی پالیسی بدل گئی کہ یہ آزادی نہیں ہے بلکہ فریب آزادی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس نظم کا عنوان بدل کر ۔ ۔ ۔ آزادی کر دیا۔ یہ چیز مجھے کبھی پسند نہیں آئی۔ آزادی پر میری نظم "نیا سورج" ہے۔ میں ایک بند آپ کو سنائے دیتا ہوں۔ پہلے بند میں یہ تھا کہ ہمارے کسانوں کی کیا حالت تھی۔ دوسرے بند میں یہ کہ ہمارا جو سرمایہ دار طبقہ تھا آزادی کے بعد اس کا کیا رویہ رہا۔ وہ سمجھے کہ ہم پر اب دولت کے خزانے کھل گئے ہیں تو پہلا بند سنائے دیتا ہوں:

بڑے ناز سے آج اُبھرا ہے سورج　　ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
پہاڑوں کے چشموں کو سونا بنایا　　نئے بل نئے زور ان کو سکھائے
لباسِ زریں آبشاروں نے پایا　　نشیبی زمینوں کے چھینٹے اُڑائے
گھنے اونچے اونچے درختوں کے منظر　　کہ ہیں آج سب آبِ زر میں نہائے

مگر ان درختوں کے سائے میں اے دل
ہزاروں برس کے یہ ٹھٹھرے سے پودے
ہزاروں برس کے یہ سمٹے سے پودے
یہ ہیں آج بھی سرد، بے حال بے دم
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو جھکائے

ارے او نئی شان کے میرے سورج　　تری یاد میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے　　جو ایسے درختوں میں بھی راہ پائے
جو ٹھٹھرے ہوؤں کو جو سمٹے ہوؤں کو　　حرارت بھی بخشے گلے بھی لگائے

میرا خیال ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کا ردِ عمل الگ چیز ہے اور ایک شاعر کا ردِ عمل الگ۔ ہو سکتا ہے شاعر کا ردِ عمل غلط ہو لیکن بہر حال وہ اس کا ردِ عمل ہے۔ مثال کے طور پر میں آپ کو بتاؤں کہ پہلی بار جب کیرالا میں گورنمنٹ بنی تو عام طور پر کانگریس

کا خیال تھا کہ کمیونزم ہندستان میں آرہا ہے۔ اس پر میرا جو ردِ عمل ہوا وہ سنیے:

جب کبھی کسی گل پر اک ذرا نکھار آیا
کم نگاہ یہ سمجھے موسم بہار آیا
اس افق کو کیا کہیے نور بھی دھندلکا بھی
بارہا کرن پھوٹی بارہا غبار آیا
ہم نے غم کے ماروں کی محفلیں بھی دیکھی ہیں
ایک غمگسار اٹھا ایک غمگسار آیا
یوں تو سینکڑوں غم تھے پر غمِ جہاں جذبی
بعد ایک مدت کے دل کو سازگار آیا

لیکن اس کے باوجود میں پارٹی ممبر نہیں تھا اس لیے میں ان کا ترجمان بن کر نہیں رہ گیا۔ ترقی پسند شعرا میں مجاز میرے بہت قریب ہے۔ سینٹ جانس کالج میں وہ فرسٹ ایر میں ہمارے کلاس فیلو تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری میں مجاز جوش کو لے کر اٹھا تھا، کاش وہ اپنے ہوش و حواس میں رہتا تو آگے چل کر وہ اردو شاعری میں بہت کچھ CONTRIBUTE کر سکتا تھا۔ مجھے بڑا افسوس ہے۔ اپنے تمام دوستوں میں جس سے مجھے سب سے زیادہ محبت تھی تو وہ مجاز کی ذات تھی۔ مجاز پر ایک چھوٹی سی نظم میں نے کہی ہے جو تین سال میں مکمل ہوئی۔ جب میں کہنے بیٹھتا تھا تمام یادیں تازہ ہو جاتی تھیں اور میں چاہتا تھا کہ اس کی کیفیت اور شاعری دونوں کو سمو دوں اور یہ ایک DIFFICULT TASK تھا۔ بہرحال میں نے کوشش کی اور تین سال میں کچھ کامیابی ہوئی:

آج ایک جادۂ پُر پیچ کا راہی گم ہے
اک حریفِ المِ لامتناہی گم ہے
ایک سودائی تعمیرِ گلستاں مفقود
ایک آوارۂ طوفانِ تباہی گم ہے
اک دہکتا ہوا شعلہ نہیں مے خانے میں
اک مہکتی ہوئی سرشار نگاہی گم ہے
حسن والوں کی جبینوں کا اجالا ادھبل
عشق والوں کی نصیبوں کی سیاہی گم ہے

آہ اے دشتِ وطن اپنے غزالوں میں تو دیکھ
آسماں مہر وشوں ماہ جمالوں میں تو دیکھ
جن کے سینوں میں ہے تابانیٔ صد ماہ تمام
ظلمتِ دہر ذرا ایسے ہلالوں میں تو دیکھ
پوجے جاتے ہیں جہاں حسن و وفا کے اصنام
اے مرے شیخِ حرم ایسے شوالوں میں تو دیکھ
عیشِ امروز تجھے روحِ طرب کی سوگند
دلِ انساں کے کہن سال ملالوں میں تو دیکھ
دلِ صد پارۂ مظلوم کی آہوں میں تو ڈھونڈھ
شہریاروں کے غضبناک خیالوں میں تو دیکھ
ناخنِ عقل و جنوں آج بھی عاجز جن سے
ایسے عقدوں سے تو پوچھ ایسے سوالوں میں تو دیکھ
اے شبِ تیرہ و تاریک کے مارے جذبی
صبحِ ناپید کے موہوم اجالوں میں تو دیکھ

مجاز کے ساتھ اور دوسرے ترقی پسند شعرا کے ساتھ ہم لوگ گوہر سلطان کے کوٹھے پر بھی جاتے تھے۔ بقول فیض (جو پہلی بار ۱۹۴۱ء میں آئے تھے) : وہاں ترقی پسندوں کی ایک سرپرست ہیں گوہر سلطان عجیب وغریب ہستی تھیں وہ۔ بہت اچھا گاتی تھیں۔ بہت ہی معمولی شکل وصورت کی عورت تھیں لیکن بہت ہی پُرخلوص۔ ان سے ہمارے مجاز بہت متاثر تھے۔ ہمارے ایک اور دوست تھے سید سبط حسن (جو اب پاکستان میں ہیں) وہ بھی ان سے عشق فرماتے تھے۔ پھر ایک محفل میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ سردار جعفری کلنے پوچھا: گوہر سلطان! تم کس سے محبت کرتی ہو؟ اس نے کہا: سید سبط حسن سے۔ مجاز کو سخت فرسٹریشن ہوا۔ اس دور میں مجاز کا عجیب حال تھا۔ وہ جتنے عاشق نہیں تھے اس سے زیادہ پوز کرتے تھے۔ وہ میرے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ گوہر سلطان آگے بڑھ چکی تھیں اور وہ انھیں خاص کرکے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک رنگ جا رہا تھا۔ اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ حضرت آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہہ رہے ہیں' نوجوانی کا زمانہ تھا۔ ۴۰-۳۹ء کا۔ تو یہ سب حماقتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اسی طرح ایک بار ... نے میرے قریب آنے کی کوشش کی لیکن بہت پہلے ان منظروں سے گذر چکے تھے ہم۔ جب انھوں نے خط پر خط بھیجنا شروع کیا اور پریشان کرنا شروع کیا تو وہ نظم وجود میں آئی جس کا مطلع ہے ؎

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں

یہ ۵۰ء کی بات ہے۔ پوری نظم سُن لیجیے ؎

ڈھونڈھیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیِ نظر کی حکایت کہاں سے لائیں

ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بیباکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں

افسردگیِ ضبطِ الم آج بھی سہی
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں

ہر فتح کے غرور میں بے وجہ بے سبب
احساس انفعالِ ہزیمت کہاں سے لائیں

آسودگیِ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں

وہ جوشِ اضطراب سے کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
ناآزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں

سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

۶۵ء کی انڈو پاک جنگ یاد ہے۔ ہمارے ہند و پاک کے شاعروں نے اس لڑائی کے دوران کیسے کیسے زہر اگلے تھے اور اس آگ کو بھڑکانے میں خاص مدد کی تھی میں نے اس زمانے میں ان شاعروں پر ایک نظم کہی تھی۔ "آج کی شام" وہ بھی سن لیجیے:

آج کی شام نہیں رندِ خوش انفاس کی شام — نہ کہیں امن کی شمعیں نہ کہیں امن کا نور
نہ کہیں امن کا ساقی نہ کہیں امن کا جام

آج اس بزم وفا کا کوئی دیکھے انداز — نہ کہیں امن کا مطرب نہ کہیں امن کا ساز
آج ہر نے کی یہ کوشش کہ شرارا بن جائے — موج نے آگ بنے آگ کا دھارا بن جائے

ہائے وہ راگ کہ تھا مرہم و شبنم آسا — آج وہ راگ ہے یا نارِ جہنم کی صدا
کیا سے کیا ہو گئی یا رب لبِ شاعر کی نوا — آج کی شام نہیں جذبۂ احساس کی شام
آج کی شام نہیں رندِ خوش انفاس کی شام

انتخاب کلام

ضبطِ غم بے سبب نہیں جذبیؔ — خلش دل بڑھا رہا ہوں میں
پڑا ہوا ہوں کہاں لے ہوائے مے نوشی — مجھے تو مستیِ صہبا میں ڈوب جانا تھا
اللہ رے بے خودی کہ چلا جا رہا ہوں میں — منزل کو دیکھتا ہوا کچھ سوچتا ہوا
مختصر یہ ہے ہماری داستانِ زندگی — اک سکون دل کی خاطر عمر بھر تڑپا کیے
لے چشمِ خشک تیری تصویر جاگ اٹھی — پھر اٹھ رہی ہیں موجیں دل سے مرے لہو کی
اے حسن ہم کو ہجر کی راتوں کا خوف کیا — تیرا خیال جاگے گا سویا کریں گے ہم
شکستہ ساز بکھرویں اپنی آنکھیں گلفشاں کر لیں — وہ آئیں یا نہ آئیں ہم تو بزم آرائیاں کر لیں
دکھا رہی ہے محبت کے سب نشیب و فراز — بہت عزیز ہے یہ آہ نارسا ہم کو
ہمیں ہیں سوز، ہمیں ساز ہیں، ہمیں نغمہ — ذرا سنبھل کے سرِ بزم چھیڑنا ہم کو
مآل کچھ بھی محبت کا ہو مگر یارب — نہ یاد آئے محبت کی ابتدا ہم کو
جھکی رہی نگہ شوق مجرموں کی طرح — گزر گیا کوئی حیرت سے دیکھتا ہم کو
ہزار بار کیا عزم ترک نظارہ — ہزار بار مگر دیکھنا پڑا ہم کو
اظہار محبت پر اس طرح وہ شرمائے — سب ان کی حیا میری آنکھوں میں اتر آئی

کچھ دل کو محبت میں مٹنے کا خیال آیا — کچھ تیرے تغافل نے کی حوصلہ افزائی
ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ — کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ
خیال مئے کشی مجھ کو نہ ہوش عاشقی مجھ کو — یہ کن راہوں سے یارب لے چلی ہے زندگی مجھ کو
اک طرف لب تک نہیں کھلتے ہیں فرطِ یاس سے — اک طرف جذبیؔ مجھے شوقِ غزل خوانی بھی ہے
دعدے کی وفا تم سے نہ ہوئی وہ جان پہ آخر بن ہی گئی — گر جھوٹا ہوں جھوٹا ہی سہی اب دل کو جھوٹا کون کہے
کسی سے حال دلِ بے قرار کہہ نہ سکا — کہ چشمِ یاس میں آنسو بھی آ کے بہہ نہ سکا
نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں — یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہہ نہ سکا
اک طرف لب تک نہیں کھلتے ہیں فرطِ یاس سے — اک طرف جذبیؔ مجھے شوقِ غزل خوانی بھی ہے

۱۹۴۳ء

○

کیا یہی انقلاب ہے، قلب اِدھر جگر اُدھر — نالۂ بے قرار اِدھر، شورشِ چشمِ تر اُدھر
اف ری سیاستِ چمن، رنگ کو بوئے سو وطن — کو ہے نرگسِ وطن، نور اِدھر نظر اُدھر
ایک تبسمِ فرنگ، ہر دو افق لہو ترنگ — نقش بدوشِ ونالہ رنگ، شام اِدھر سحر اُدھر
کام و دہن کی تلخیاں، کوئی شلائے اب کہاں — وائے بہ حالِ تشنگاں، شیر اِدھر شکر اُدھر
اے وہ عقاب جس سے تھی کوہ و دمن کی آبرو — آج اسی عقاب کے بال اِدھر ہیں پر اُدھر
قلّتِ صلحِ کُل یہاں، قلّتِ صلحِ کُل وہاں — کثرتِ فتنہ گر اِدھر، کثرتِ فتنہ گر اُدھر
اہلِ ہنر کے واسطے، خاک بسر کے واسطے — جور و جفا کا گھر اِدھر، قہر و بلا کا گھر اُدھر
برگ سے بر سے پوچھیے، نخل و شجر سے پوچھیے — کون ہے بار ور اِدھر، کون ہے باثمر اُدھر
ایک مریضِ نیم جاں، ایک مریضِ خستہ جاں — کون ہے چارہ جو اِدھر، کون ہے چارہ گر اُدھر
اہلِ فراق کچھ بتاؤ، اہلِ مذاق کچھ بتاؤ — کون سی شے ہے خوب اِدھر، کون سی خوب تر اُدھر
ہجر کی رات ہے طویل، وصل کی صبح دور ہے — جذبؔ ابھی ہے ناتمام، خام ابھی شعور ہے

۱۹۵۲ء

○

یہاں ہے حفظِ کتب پر مدارِ فضل و کمال — یہاں رسائیِ فکر و نظر کی قیمت کیا

یہاں ہے عقلِ فرومایہ محوِ سنگ زنی — یہاں جنوں کے گراں مایہ سر کی قیمت کیا
یہاں نہ شعر سناؤ، یہاں نہ شعر کہو — خزاں پرستوں میں گلہائے تر کی قیمت کیا
یہاں دکھاؤ نہ اپنی متاعِ خونِ جگر — خزف پسندوں میں لعل و گہر کی قیمت کیا
یہاں ہے طولِ کلامی نثر کا سکہ — یہاں مرے سخنِ مختصر کی قیمت کیا
زمانہ سازی کے انداز سیکھ لو جذبی — یہاں خلوص و گدازِ ہنر کی قیمت کیا

۱۹۵۳ء

○

آہ اے دشتِ وطن! اپنے غزالوں میں تو دیکھ — آسماں! مہر وشوں ماہ جمالوں میں تو دیکھ
جن کے سینوں میں ہے تابانیٔ صد ماہِ تمام — ظلمتِ دہر! ذرا ایسے ہلالوں میں تو دیکھ
پوجے جاتے ہیں جہاں حسن و وفا کے اصنام — اے مرے شیخِ حرم! اپنے شوالوں میں تو دیکھ
عیشِ امروز! تجھے روحِ طرب کی سوگند — دلِ انساں کے کہن سال ملالوں میں تو دیکھ
دلِ صد پارۂ مظلوم کی آہوں میں تو ڈھونڈ — شہریاروں کے غضب ناک خیالوں میں تو دیکھ
ناخنِ عقل و جنوں آج بھی عاجز جن سے — ایسے عقدوں سے تو پوچھ، ایسے سوالوں میں تو دیکھ
اے شبِ تیرہ و تاریک کے مارے جذبی — صبحِ ناپید کے موہوم اجالوں میں تو دیکھ

۱۹۵۸ء

○

جسے آج نغمہ سمجھتی ہے دنیا — وہی نغمہ کل تک فغاں ہو نہ جائے
جسے سازِ دوراں پہ گانا نہ آیا — وہ مطرب کہیں نوحہ خواں ہو نہ جائے
بچا کر جسے رکھ لیا ہے جبیں میں — وہ سجدہ بھی نذرِ بتاں ہو نہ جائے
نہ کلیاں ہی چٹکیں، نہ تارے ہی چمکیں — مرا غم، غمِ دو جہاں ہو نہ جائے

۱۹۳۰ء

○

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے — یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی — اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے — جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے
دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی، ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو — دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دنیا دنیا کون کرے

۳۲ء

○

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارہ کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارا کرتے ہیں

کیا تجھ کو پتا، کیا تجھ کو خبر، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی! ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موجِ بلا! ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

کیا جانیے کب یہ پاپ کٹے، کیا جانیے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

۴۲ء

○

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اِک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں

ڈھونڈھیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیِ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں

ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بے باکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں

افسردگیِ ضبطِ الم آج بھی سہی
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں

ہر فتح کے غرور میں بے وجہ، بے سبب
احساسِ انفعالِ ہزیمت کہاں سے لائیں

آسودگیِ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں

وہ جوششِ اضطراب پہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
ناآزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں

سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

○

یہ میرے شعر، یہ فن کے ہیں داد کچھ بھی نہیں
یہ مختصر سی مری کائنات کچھ بھی نہیں

سرِ حیات تو لرزاں ہیں رہ روان کے
ترے غریب ترے خاکسار کچھ بھی نہیں

وہ ایک بات، میسر جسے نہ حرف نہ صوت
کوئی نہ سمجھے تو شاید وہ بات کچھ بھی نہیں

ترے ستم کی ہم اس انتہا کو دیکھ چکے
کہ جس کے آگے ترا انتخاب کچھ بھی نہیں

یہ حرفِ لاف بھی اکثر سنا ہے اے جذبی
کہ ہم وہاں ہیں جہاں بوتراب کچھ بھی نہیں



اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اور اک جام مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
جانے کب پی تھی ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
آندھیاں چلتی ہیں دنیا ہوئی جاتی ہے غبار
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں
دھندلا دھندلا نظر آتا ہے جہانِ بیدار
آنکھ تو مل لوں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

وہ مرا سحر وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
میں تھکا ہارا تھا اتنے میں جو آئے بادل
اُف وہ رنگین پراسرار خیالوں کے محل
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گا لوں تو چلوں
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
آنسوؤ! تم نے تو بیکار بھگویا دامن
میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور
کیا کیا میں نے زمانے میں نہیں جس کا چلن
اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
ایسے وہموں سے بھی اب خود کو نکالوں تو چلوں

حسن نعیم



حسن نعیم

(پ: ۶ر جنوری ۱۹۲۷ء ـــــ م: ۱۹ر فروری ۱۹۹۱ء)

غزل

مٹ گئے سب داغ، داغِ عشق تنہا رہ گیا
گر گئی دیوار لیکن اس کا سایہ رہ گیا

اک سمندر رو چکا ہوں، ایک صحرا جل چکا
پھر بھی آنکھوں میں کہاں سے ایک دریا رہ گیا

کون مجھ سے پوچھتا ہے روز آ کے پیار سے!
کام کتنا ہو چکا ہے، وقت کتنا رہ گیا

یوں جیا میں آنکھ بھر کے اس طرف دیکھا نہیں
آسماں میری طرف اس عمر تکتا رہ گیا

مر گیا ہوتا بھروسہ کر کے خورشید پر نعیم
غم کی طاقت تھی کہ جس کے بل پہ زندہ رہ گیا

حسن نعیم
بمبئی
۲۲ مئی ۸۵ء

حسن نعیم

میرے دادا سید شاہ غلام قاسم راجگیر کی درگاہ پیر امام الدین کے سجادہ نشین ہونے کے باوجود (یہ درگاہ مخدوم الملک شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے نسبی سلسلے کی تھی) اس دور کے سیاسی حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشی بقا کے لیے مغربی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے' یہاں تک کہ خود بھی انگریزی میں تھوڑی بہت استعداد حاصل کر لی تھی اور بعد میں اپنی سجادگی اپنے چھوٹے بھائی سید شاہ محمد یوسف کے حوالے کر کے کسی شعبے میں وقف رجسٹرار ہو گئے تھے۔

انھوں نے اپنے دو بیٹوں کو بغرض تعلیم لندن بھیجا' میرے والد سید محمد نعیم اور سنجھلے چچا سید عبدالسمیع یکے بعد دیگرے بیرسٹر ہو کر لوٹے' میرے والد شہر بھاگلپور میں پریکٹس کرنے لگے اور سنجھلے ابا پٹنہ ہی میں شادی کر کے بس گئے۔ اپنی کارگزاریوں کے باعث دونوں اپنے علاقے کے عمائدین میں شمار ہونے لگے' دونوں ہی قومی اور ملی مسائل میں دلچسپی لیتے تھے' میرے والد غالباً ۲۶ء کے اواخر میں پٹنہ منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں میں ۶ جنوری ۲۷ء میں پیدا ہوا اور میرا نام سید حسن رکھا گیا۔

ایک طویل علالت کے بعد ستمبر ۲۸ء میں والد صاحب کا کم عمری ہی میں انتقال ہو گیا[1] اور پھر پریشانیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوا' میری والدہ شیخ پورہ (ضلع مونگیر) چلی گئیں جہاں میری دادی کا آبائی مکان تھا اس کے علاوہ کچھ وہاں اور کچھ گیا ضلع میں ان کی جائیداد بھی تھی جس سے گزر بسر ہونے لگی۔ میں سات آٹھ سال کی عمر تک شیخ پورہ ہی میں رہا اور ابتدائی تعلیم وہیں پائی مجھ سے تینوں بڑے بھائی پٹنہ میں زیر تعلیم تھے اور جسٹس سید نورالہدیٰ کے یہاں رہتے تھے جو رشتے میں ہم لوگوں کے نانا ہوتے تھے۔ جج صاحب کے انتقال کے بعد والدہ خود پٹنہ آ کر رہنے لگیں اور ہم سب ساتھ رہنے لگے۔

۳۸ء میں میرا اور میرے سنجھلے بھائی سید علی کا نام رام موہن رائے سمینری پٹنہ میں لکھوا دیا گیا' اسکول میں داخلے کے وقت ہم دونوں نے اپنے اپنے ناموں کے ساتھ 'نعیم' جوڑ لیا' بہت دن بعد منجھلے بھائی سید محمد نے بھی یہی کیا (بڑے بھائی تاعمر سید احمد ہی رہے لیکن اپنے بچوں کے نام کے ساتھ 'نعیم' کا اضافہ کر دیا)

---

1 میرے سنجھلے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ میرے والد کا انتقال ستمبر میں نہیں نومبر ۱۹۲۸ء میں ہوا تھا۔

مشکل سے تین برسوں تک ہم سب بھائی والدہ کے ساتھ قدرے سکون سے رہے، پھر اگست ۹ ۳ ۱۹ء میں والدہ صاحبہ کا اچانک انتقال ہوگیا اور ہم سب یوں بکھرے کہ کبھی اکٹھے رہنا نصیب نہ ہوسکا۔

میں ۴۰ ۱۹ء میں اپنی چھوٹی پھوپھی بیگم یوسف حسین کے ساتھ رہنے کے لیے قلعہ ٹیڑھی گھاٹ پٹنہ سیٹی چلا گیا اور وہاں ۴۱ ۱۹ء میں میرا داخلہ محمڈن اینگلو عربک اسکول میں ہوگیا۔ وہیں سے ۴۳ ۱۹ء میں میٹرک پاس کرکے پہلے پٹنہ سائنس کالج پھر ایک سال بعد بی۔ این۔ کالج پٹنہ میں داخل ہوا جہاں سے ۴۵ ۱۹ء میں آئی۔ ایس سی پاس کیا۔

ٹیڑھی گھاٹ کے قیام کے دوران ہی مجھے اُردو شاعری سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا، یہ محلہ دراصل صرف تین قلعہ نما مکانوں پر مشتمل گنگا کے کنارے آباد تھا جس میں ایک ہی خاندان کے افراد مقیم تھے، اس خاندان کے سربراہ اس وقت نواب ابراہیم حسین تھے جو میرے نئے اسکول کے سکریٹری ہونے کے علاوہ ’انجمن ترقی اُردو لائبریری‘ پٹنہ سیٹی کے بانی بھی تھے، ان کی شادی بھی میرے والد کی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی تھی۔ خود انھیں تو شاعری سے معمولی دلچسپی تھی لیکن ان کے صاحبزادے سید اکبر حسین کو (جو بعد میں جسٹس اکبر حسین بنے) شاعری کا نہ صرف شوق تھا بلکہ خود بھی صاف ستھری غزلیں لکھ لیا کرتے تھے۔ چھوٹی پھوپھی کے دونوں لڑکوں، سید اصغر حسین اور سید احمد حسین کا مذاقِ سخن بھی اعلا تھا اور اساتذہ کے بہت سارے اشعار یاد تھے۔

وہاں اکثر طرحی اور غیر طرحی نشستیں منعقد ہوتیں جن میں عظیم آباد کے برگزیدہ شعرا بھی شرکت کرتے۔ ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی کی غزلوں کی اس زمانے تک دھوم باقی تھی، وہ اکثر وہاں قیام فرماتے بلکہ اپنا مجموعہ ’جلوۂ داغ‘ وہیں رہ کر ترتیب دیا، ان کے علاوہ عظیم آباد کے نامی گرامی شعرا میں بسمل عظیم آبادی (سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے)، بدر عظیم آبادی، محمود علی خاں صبا (شاگرد شاد) وغیرہ اکثر تشریف لایا کرتے، ممتاز احمد بسمل جو دانا پور کے ایک خوش گو شاعر تھے اور زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ میگزین کے مدیر رہ چکے تھے وہاں میرے جانے سے پہلے مستقلاً رہا کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا احسن مارہروی سے تلمذ حاصل کیا۔ سید شاہ رضی احمد (مجموعہ: کشتِ خیال) تو خیر سے گھر کے داماد تھے اور وہیں قیام پذیر تھے۔

غرض ٹیڑھی گھاٹ کا شعری ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ میرا شاعری سے رُخ بدلنا محال تھا، ویسے بڑے بھائی سید احمد بھی نوجوانی میں شعر کہا کرتے تھے، تپش ان کا تخلص تھا اور نہایت دل کش ترنم میں شعر پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے پروفیسر عبدالمنان بیدل اور ضمیرالدین عرش گیاوی (مصنف: حیاتِ مومن) سے مشورۂ سخن بھی کیا تھا۔

غرض پانچ چھ برسوں کے قیام کے بعد جب ۴۶ ۱۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچا تو میرے پاس دس بارہ

پابند اور آزاد نظموں کے علاوہ پانچ سات مکمل اور نامکمل غزلیں بھی تھیں۔ لیکن ان کی موجودگی کا علم صرف چند احباب کو تھا۔

علی گڑھ شروع ہی سے اُردو شعر و ادب کا مرکز رہا ہے چنانچہ میرے زمانے میں بھی مستند اور مشہور لوگوں کے علاوہ تازہ فکر اور نوخیز ادیبوں شاعروں اور ناقدوں کا ایک قافلہ موجود تھا یہی لوگ بعد میں عصری ادب کے ستونوں میں شمار ہوئے ان دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے باقاعدگی سے ہوا کرتے تھے جس میں اکثر میں بھی شریک ہوتا تھا' ہنگامی جلسوں کی بھی کمی نہ تھی' ایک ایسے ہی جلسے میں میں نے اپنی ایک نظم 'تشویش' پڑھنے کی جسارت کی' جس میں جاں نثار اختر اور معین احسن جذبی بھی شریک تھے خلاف توقع اس کی بہت معمولی نکتہ چینی ہوئی' بلکہ اس نظم کو ڈاکٹر مختار الدین احمد نے یونیورسٹی میگزین کے سالنامہ ۴۸ء میں شامل کر لیا' یہ میری پہلی تخلیق تھی جو شائع ہوئی۔

علیگڈھ کے دوران قیام میں نے تازہ کچھ نہیں لکھا' صرف قدیم و جدید ادب کا مطالعہ کرتا رہا اور ادبی بحثوں میں حصہ لیتا رہا' باقی وقت ٹیبل ٹینس کھیلنے اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی سرگرمیوں میں صرف ہوا۔

ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی اس وقت بی۔ اے کے طالب علم تھے لیکن بطور شاعر اور نقاد ادب میں متعارف ہو چکے تھے' انھوں نے ایک بار رائے دی کہ میں غزلوں کی طرف خصوصی توجہ دوں اس لیے کہ ان کا اسلوب و مواد انھیں کچھ نیا نیا سا لگا' ان کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی۔ باقر مہدی اور شہاب جعفری سے بھی ان ہی دنوں کی ملاقات ہے اور تب سے آج تک تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ ۴۸ء میں علیگڈھ سے بی۔ ایس سی کرنے کے بعد جب واپس پٹنہ لوٹا تو دوبارہ چند غزلیں کہیں جو وہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہوئیں لیکن میرے ذہن میں کچھ تخلیقی مسائل بار بار سر اٹھاتے تھے اور مجھے اپنے کلام سے بدگمان کرتے تھے' بات یہ ہے کہ اچانک جو تبدیلیاں ہمارے سماج مزاج اور اخلاقی اقدار میں ۴۷ء کے بعد آئی تھیں انھیں ہم محسوس تو کرتے تھے لیکن ان کا اظہار مروجہ غزلوں کے اسالیب اور لہجوں میں بے جان اور غیر حقیقی سا لگتا تھا' عصری صداقتوں سے غزل کو ہم آہنگ کرنے کیلیے ایک ایسی تخلیقی زبان کی ضرورت تھی جس میں الفاظ' استعارات' پیکر اور علائم جیتے جاگتے نظر آئیں' یہ کوئی آسان مرحلہ نہ تھا' اسکے لیے غزل کی کل روایات کا تجزیاتی مطالعہ ناگزیر تھا کہ انحراف بھی اس عظیم روایت کا ہی حصہ نظر آئے۔

اس بار میرا قیام اپنے خالو رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ کے دولت کدے پر ہوا' وہ نہایت ذی علم خوش اخلاق اور شگفتہ مزاج انسان تھے' وہ بیدل و غالب کے پرستاروں میں تھے اور ان دنوں غالب کے فکر و فن سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کر رہے تھے' ان کے گھر میں اکثر شام کے وقت شہر کے ممتاز دانشوروں شاعروں اور سیاسی شخصیتوں کا مجمع لگتا تھا اور گھنٹوں گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں' علامہ جمیل مظہری ان کے

گہرے دوستوں میں تھے اور ان دنوں وہیں قیام فرماتے تھے، وہیں جناب فصیح الدین بلخی سے شرفِ نیاز حاصل ہوا، وہ ایک درویش صفت مورخ اور محقق تھے "تاریخ مگدھ" کے مصنف کی حیثیت سے تو وہ مشہور تھے۔ لیکن ان کے تنقیدی کتابچے "انشادِ شاد" کی خبر صرف صاحبانِ نظر کو تھی۔ ان سے گفتگو کرنے پر مجھے محسوس ہوا کہ اُن کی نگاہ اُردو شاعری کے کلاسیکی سرمایہ، خاص کر غزلیہ شاعری اور اس کے رموز و نکات پر گہری اور معروضی ہے چنانچہ ۴۹ء میں سات آٹھ مہینوں تک ان کے خزانۂ علم سے فیض یاب ہوتا رہا اس وقت تک کی بیشتر شاعری کو رد کرتے ہوئے گویا ۱۹۵۰ء سے میں نے نئے شعری سفر کا آغاز کیا تب سے مسلسل لکھ رہا ہوں۔

۱۹۵۰ء میں میری شادی حشمت آرا بیگم سے ہوئی جنھوں نے "شاہدہ یوسف" کے نام سے کئی اچھے افسانے لکھے ہیں، میری دونوں لڑکیوں میمونہ اور شہیرہ کی شادی ہو چکی ہے دو بیٹے ہیں ارشاد اور اشعر۔ ان میں سے ایک برسرِ روزگار ہے اور دوسرا ایم۔ اے کر چکا ہے۔

۵۱ء میں پرویز شاہدی جو میرے خلیرے بھائی بھی تھے مجھے اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے جہاں لگ بھگ ایک سال تک سی۔ ایم۔ او اسکول میں سائنس ٹیچر رہا۔ پرویز شاہدی ہی اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور مظہر امام بھی ان دنوں اس اسکول میں اُردو کے استاد تھے۔

جون ۵۳ء میں کلکتہ کو چھوڑ کر قسمت آزمائی کی خاطر دلّی آ گیا۔ اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر سید محمود جو مجھ سے اچھی طرح واقف تھے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ بورڈ کے چیرمین تھے، وہ مجھ پر مہربان ہوئے اور مجھے اپنا سکریٹری منتخب کر لیا۔ ۵۴ء میں جب وہ وزارتِ خارجہ میں وزیرِ مملکت ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ بطور پرائیویٹ سکریٹری وہیں منتقل ہو گیا اور ۱۹۷۰ء تک اسی وزارت سے منسلک رہا۔

دلّی میں نہ صرف میری ادبی نشو و نما ہوئی بلکہ میری زندگی کے بہترین ایام وہیں بسر ہوئے، دلّی ہی دراصل وہ شہر ہے جس کی تہذیبی روایت سے آج کی غزل بھی سب سے زیادہ متاثر ہے۔

۱۹۵۵ء میں ایفرو ایشیائی کانفرنس منعقدہ بنڈونگ (انڈونیشیا) میں بطور ڈیلی گیٹ شریک ہوا اور پھر ۵۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو سعودی عرب تشریف لے گئے تو اوروں کے علاوہ میں بھی ساتھ گیا۔ میرا تبادلہ دوبارہ ہندستان سے باہر ہوا پہلے ساڑھے تین برسوں کے لیے (۵۸ء تا وسط ۶۱ء) جدہ میں ہندستان کا نائب قنصل رہا اور پھر کوئی چار برسوں تک (۶۴ء سے ۶۸ء تک) نیو یارک میں انڈین مشن برائے اقوامِ متحدہ میں بطور آتاشی کام کیا۔ اس کے علاوہ ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے کوئی پندرہ بیس ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران وہاں کی طرزِ زندگی اور تہذیبی اقدار کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس خیال کے تحت کہ کسی ادبی ادارے سے منسلک

ہوکر باقی زندگی صرف علمی اور ادبی کام کردوں وزارت خارجہ سے مستعفی ہوکر ۱۹۷۰ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے بطور ڈائرکٹر وابستہ ہوگیا، میں نے ہی اس ادارے کا باضابطہ دفتر قائم کیا اس کے عمارات کی تکمیل کروائی اور اس کی ادبی سرگرمیاں شروع کروائیں لیکن مجلس عاملہ کے ایک ممبر کی مستقل رخنہ اندازی سے تنگ آکر جولائی ۷۳ء میں اس سے علاحدہ ہوگیا۔ اس کے بعد مختلف ذرائع سے کسب معاش کرتا رہا ہوں اور اپنی شاعرانہ شخصیت کے تحفظ کی خاطر بڑی آزمائشوں سے گذرا ہوں۔

میری غزلوں کا پہلا مجموعہ اشعار ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا، اس کے بعد ۸۰ء میں ہندی رسم الخط میں دوسرا مجموعہ غزل نامہ، شائع ہوا، تیسرا مجموعہ جس میں تقریباً ڈیڑھ سو منتخب غزلیں ہیں 'دبستان' کے نام سے ترتیب پاچکا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ دو تین مہینوں میں شائع ہوجائے گا۔

پابند اور آزاد نظموں کے علاوہ میں نے آٹھ نو مختصر مثنویاں بھی بطور تجربہ لکھی ہیں، جو سب کی سب شائع ہوچکی ہیں انھیں ایک مجموعہ کی شکل میں ترتیب دینا باقی ہے، غزل ہی لیکن میری زندگی کا محور اور MOTIVE FORCE ہے، ادھر تین برسوں سے بمبئی میں مقیم ہوں اور نیشنل غزل سمنیری کے نام سے ایک بڑا ادارہ قائم کرنے میں منہمک ہوں، اس ادارے کے ذریعہ غزل کے سرمائے کو سلسلہ وار دوسری ہندستانی زبانوں میں منتقل کرنے اور غزل گائیکی کو صحیح خطوط پر رواج دینے کا کام کیا جائے گا چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع ہوچکا ہے۔

انتخاب کلام

دانشوروں کے قحط میں سید حسن نعیم ______ بیدل کی باؤلی پہ لگا ئیں سبیل کیا

وہ لوٹ آئے تو اس کی بھی کچھ اتار رکھیو
فصیل قلب کا دروازہ تم کھلا رکھیو
نظر کی آنچ سے کھلتے ہیں پھول وحشت کے
کھلیں یہ پھول تو دامن کو مت بچا رکھیو
دیار فن میں جہاں منزلیں بھی فرضی ہیں
تمام عمر بھٹکنے کا حوصلہ رکھیو
وہ اک غزال ہے کب تک پہاڑ چھانے گا
کنار آب حسن خیمۂ وفا رکھیو

کچھ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے
میں عدو کی جستجو میں تھا کہ اک پتھر لگا
مڑ کے دیکھا تو سناں تانے ہوئے احباب تھے

سانس لیتے ہیں ہزاروں جینے والے چند ہیں
سب دریچے آرزو کے بند دلوں پر بند ہیں

"جاں کا خطرہ ہے کسی نے گر مجھے سچا کہا"
فوج سلطاں چار سو تھی جس نے جو سمجھا کہا

جس کو جانا ہمنوا، وہ کھو گیا بازار میں
بن گیا اک واہمہ جس شخص کو اپنا کہا

ایک دنیا دیکھ کر لوٹا تو اب حیران ہوں
کس بنا پر میں نے ابتک قصۂ دنیا کہا

وقت ہی ناقد ہے ایسا جس کو سب معلوم ہے
حرف کے پردے میں کس نے کیا کہا کیسا کہا

میں پشیماں ہوں کہ اپنی سست فہمی سے نعیم
کیسے کیسے سنگروں کو قبلہ و کعبہ کہا

سُن اس طرح کہ شور بھی نغمہ سُنائی دے
اتنی نہ آنکھ کھول کہ دنیا دکھائی دے

دیکھا نہیں ہو جس نے ترے دل کا آئینہ
کیا قیمتِ نگاہ شب رو نمائی دے

گھیرے ہیں آفتاب کہ مایوسیوں میں آس
جینے کی ہو سبیل تو سب کچھ سُجھائی دے

لپٹی ہے سب کے پانو سے زنجیرِ غم نعیم
کس میں ہے اتنا زور کہ غم سے رہائی دے

مرے کلام میں سب حرف یوں شگفتہ ہیں
شگفتِ گل بھی نیا واقعہ لگا سب کو

نعیم ایک فقیری بچی ہے ورثے میں
اسے بھی مانگتی دنیا تو بخشتا سب کو

کیوں، ذرا سی بات پر چھوڑی وہ بزمِ دوستاں
اب ہجومِ آشنا میں عمر بھر تنہا رہو

ڈھونڈتا ہوں میں پریشاں ہو کے اس درویش کو
جس نے دی تھی یہ دعا "بیٹا سدا زندہ رہو"

ایک چادر ہے خوشی کی، ایک گٹھری غم کی ہے
سر پہ دونوں کو اٹھا کر یا تری بن جائیے

لمحہ لمحہ کون دیتا ہے صدا مجھ کو نعیم
"کیجیے کچھ کام ایسا اک صدی بن جائیے"

نقوش پا جو سنوارے گا، اک نظر دے گا
مگر جو راہ نکالے گا رہگزر دے گا

خبر نہ تھی کہ وہ اس درجہ مہرباں ہے نعیم
مجھی کو آ کے مرے عیب کی خبر دے گا

بسر ہو یوں کہ ہر اک درد حادثہ نہ لگے
گزر بھی جائے کوئی غم تو واقعہ نہ لگے

اب تو میں ہوں خانقہ میں اور یہ ویراں صفیں
ہا و ہو کا دم کہاں ہے سینۂ دم ساز میں

کھو گیا تو آ بجو بھی پانو کی زنجیر ہے
ورنہ ہر شے گرد پا تھی دشت کے آغاز میں

یوں نہ غمگیں ہو کہ آخر میں بھی تیری آس ہوں
جب سے لوٹا ہوں سفر سے دیکھ تیرے پاس ہوں

لے گئے ہمسائے سب اینٹیں در و دیوار کی
روز پردہ میرے ان کے درمیاں اٹھتا رہا

جب سے قبضہ میرے دفتر پر ہوا اک دوست کا
میری چھت گرتی رہی، اس کا مکاں اٹھتا رہا

پرزے سڑکوں سے گلی سے پتھر
تم سے بچھڑے تو اٹھایا کیا کیا

مجھ کو خط لکھنا تو یہ بھی لکھنا
تم نے کھو کے مجھے پایا کیا کیا

سب نے جاں بیچ کے دیکھیں تو حسن
مال و اسباب کمایا کیا کیا

اس سے پہلے کہ دفن ہو جاؤ
وادیٔ فن میں کچھ تو ہو جاؤ

میر و بیدل کی پیروی سے نعیم
کچھ تو دنیا میں تم بھی ہو جاؤ

کچھ نہ تھا اپنی گرہ میں ان کی خوشبو کے سوا
صحرا صحرا ہم گلوں کی بستیاں لے کر چلے

حسن کا دربار بھی بازار دنیا ہے نعیم
اپنے خوابوں کا خزانہ تم کہاں لے کر چلے

جاری ہے حکم قتل بلا مہر و دستخط
سر اپنا ہے قلم تو لہو کی رسید ہے

سب سے حسین ملک ہے خوابوں کی سرزمیں
سب سے قدیم شہر، دماغ جدید ہے

قبضے میں جس کے لفظ کا فانوس ہے نعیم
تہ خانۂ خیال کی گویا کلید ہے

ایک بھی حرف نہ تھا خوش خبری کا لکھا
نامۂ وقت ملا اور کسی کا لکھا

ایسے کتنے نئے لوگ مکان جاں میں
بام و در پر ہے مگر نام اسی کا لکھا

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوک قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

کوئی جدت تو کوئی حسن تغزل سمجھا
مرثیہ جب بھی کوئی اپنی صدی کا لکھا

بات شیریں سی لگی فن کے طرف داروں کو
قصہ ہر چند حسن کوہکنی کا لکھا

ملا نہ کام کوئی عمر بھر جنوں کے سوا
تمام عیش میسر رہے سکوں کے سوا

لگی وہ آگ کہ دیوار و در بھی چل نکلے
کوئی مقیم نہیں گھر میں اب ستوں کے سوا

پڑی وہ دھوپ کہ سب رنگ پڑ گئے پیلے
بچا نہیں ہے کوئی سرخ میرے خوں کے سوا

ہر ایک فن کی بنا مد و جزر دل ہے نعیم
کہ شعر و نغمہ ہیں کیا، موج اندروں کے سوا

کسے بتاؤں کہ وحشت کا فائدہ کیا ہے
ہوا میں پھول کھلانے کا قاعدہ کیا ہے

یہ ہمسروں نے کہا تھا کہ جھوٹ ہارے گا
مگر یہ دیکھیے اپنا مشاہدہ کیا ہے

میں نکل جاؤں گا اپنی جستجو میں ایک دن
بزم یاراں میں خیال آرائیاں رہ جائیں گی

بہار باغ تمنا ہے آرزومندی
وگرنہ چشمہ ویراں ہے دیدۂ تر بھی

اتنی تاثیر تو فریاد کی قسمت ہو نعیم
حاکم وقت بدل جائے جو بہرا ہووے

دیے جلیں کہ بجھیں، آفتاب آئے گا
یقیں کرو نہ کرو، انقلاب آئے گا

شہِ ستم کو اٹھالے گا جو سرِ نیزہ
وہ شہ سوار مرے ہم رکاب آئے گا

نشانِ فتح کسی دن ہوا میں لہراتا
مثالِ خواب، کوئی مردِ خواب آئے گا

نہ پست قد ہے، نہ کوئی بلند قامت ہے
نگاہ شعر میں ہر لفظ اک علامت ہے

چلا تھا میر کے پیچھے سخن کی وادی میں
اسی کی خاک نوازی مری امامت ہے

پہن کے دوست بھی نکلے لباس طرزِ حسن
وہ اپنی آن میں بے قاعدہ ہوا سو ہوا

یہی ایک جی میں ہے وہم سا، یہی ایک سر میں ہے جنوں سا بھی
تجھے اس جنم میں نہ پا سکا تو کسی جنم میں نہ پاؤں گا

تو ہزار مجھ سے الگ رہے، میں ہزار تجھ سے جدا رہوں
کبھی درد بن کے جگاؤں گا، کبھی نیند بن کے سلاؤں گا

ابھی اپنی خاک میں قید ہوں، ابھی تو بھی دامِ بلا میں ہے
تو گلاب بن کے کھلے گا جب، میں صبا کے روپ میں آؤں گا

سچ ہے اب عشق کا وہ منصبِ اعلا بھی نہیں
شاہ شمشاد قداں، افسرِ بالا بھی نہیں

آگ جتنی تھی گئی اشکِ رواں کی صورت
کام کچھ شعلۂ امکاں سے نکالا بھی نہیں

وہ دیارِ جستجو کے قافلے کی جان ہے
اس کی آشفتہ سری اس عہد کی پہچان ہے

کس حوالے سے اُسے پہچانیے، الجھن ہے یہ
صوفیوں کی اس میں خو ہے، گل رُتوں کی شان ہے

پہلے سچ کی صف میں بھی اک فوج رہتی تھی حسن
اب تو میں ہوں اور شہادت کا قوی امکان ہے

سونے میں جو دمک ہے وہی اس کی آبرو
پیتل میں جو چمک ہے، وہی اس کی گند ہے

آتا ہے وقتِ شام سبوچے کی سمت سے
اک ایسا ماہتاب جو بوتل میں بند ہے

غزلوں کا حسن خواب کے لہجے میں گفتگو
دوہوں کا حسن پیار کے لہجے میں پند ہے

میرے لہو کو جس نے جلایا تھا اے نعیم
وہ زہر میرے شعر میں اب جوئے قند ہے

وہ علم ہے جو سخن کو وقار دیتا ہے
وہ دردِ بخشش، جو فن کو نکھار دیتا ہے

یہ کون دل میں جلاتا ہے آتشِ اُمید
وبالِ فکر کو سر سے اتار دیتا ہے

میں اس درخت سے کم تر ہوں مرتبہ میں حسن
جو دھوپ سہہ کے مسافر کو پیار دیتا ہے

کچھ سخن فہم، کچھ سیاسی ہے
اپنا محبوب دلّی باسی ہے

میرے شعروں میں بس گئی آخر
اس کی آنکھوں میں جو اداسی ہے

ہم گئے، جس شجر کے سائے میں
اس کے گرنے کا احتمال ہوا

بس کہ وحشت تھی کارِ دنیا سے
کچھ بھی حاصل نہ حسبِ حال ہوا

جس تعلق پہ فخر تھا مجھ کو
وہ تعلق بھی اک وبال ہوا

دفترِ شعر میں کیا نسل و قبیلہ کی تمیز
نام اونچا ہے بس تازہ خیالوں کا یہاں

تیری تصویر چھپی جب تو مجھے علم ہوا
کتنا مجمع ہے ترے چاہنے والوں کا یہاں

آرزو ممکن ہے، شرحِ آرزو ممکن نہیں
ان سے اب تک والہانہ گفتگو ممکن نہیں

ہائے ہائے کر رہے ہیں زر کی خاطر صوفیا
خانقہ کی اس فضا میں ہاؤ ہو ممکن نہیں

چھڑا کے قید سے پریوں کو لاؤں کیسے نعیم
اڑیں پہاڑ تو پہلے، زمیں ہلے تو سہی

کچھ وفا کی باس، کچھ بوئے جفا کس میں نہیں
ایک دنیا دیکھ لینے کی ہوا کس میں نہیں

وہ سراسر مہر ہے، اخلاص ہے، تہذیب ہے
کچھ اگر اس میں انا ہے تو انا کس میں نہیں

خوش نصیبی ہے ہوا یوں وارثِ سوزِ حسین
ورنہ ماتم کے لیے اک کربلا کس میں نہیں

مجھ میں کیا ہے، مری چادر میں ہیں کتنے موسم
تو بھی مانندِ کفِ خاک، اٹھے تو دیکھے

علم کتنا ہے گراں، روح کی قیمت کیا ہے
کوئی بازار میں ہر روز بکے تو دیکھے

سر پہ رکھ دیتا وہ اک تاج تو مارے جلتے
کم نہیں اس کا کرم، خاک بہ سر رہنے دیا

ایسا دشمن تھا کہ ہر خواب کو پامال کیا
نور سب کھینچ لیا، دیدۂ تر رہنے دیا

کیا مسائل تھے زمانے کے جو دنیا نے حسن
چھین کر ذہنِ رسا، کاسۂ سر رہنے دیا

میرے کام آئی دعائے شب نہ جوشِ بندگی
حادثے جتنے بھی ہونے تھے وہ آخر ہو گئے

میں سمجھتا تھا جسے اک افسرِ دربارِ دوست
آ کے زنداں میں کھلا وہ شخص کس دفتر میں ہے

اگر اڑان ہو اونچی تو بحرِ اعظم بھی
ہرا بھرا سا جزیرہ دکھائی دیتا ہے

وہ شخص جس کو لطیفے ہیں سینکڑوں ازبر
ہنسے تو اور فسردہ دکھائی دیتا ہے

میں اپنی روح میں اس کو بسا چکا اتنا
اب اس کا حسن بھی پردہ دکھائی دیتا ہے

میں غزل کا حرفِ امکاں، مثنوی کا خواب ہوں
اپنی سب روداد لکھنے کے لیے بیتاب ہوں

میں ببولوں کی طرح پھولا پھلا ہوں دشت میں
ابر آئے یا نہ آئے، میں سدا شاداب ہوں

کیا سمجھ کے مجھ سے الجھے ہیں حسن لیل و نہار
آپ اپنا روز و شب ہوں آپ عالم تاب ہوں

مدت ہوئی غزلوں سے گیا شور گلستاں
اب حرف غزل نوکِ سناں موجۂ خوں ہے

اشکوں میں کہاں ڈوب گیا غم کا سمندر
لفظوں میں سما کہاں گم وہ مرا سوزِ دروں ہے

مختصر گوئی بھی اک حسن تمنا خوانی ہے
کیا ضروری ہے حسن ایک جریدہ لکھوں

دل وہ کشت آرزو تھا جس کی پیمائش نہ کی
سیر دنیا کے سوا ہم نے کوئی خواہش نہ کی

اس نے جو بھی روپ دھارا، اس نے جو بھی دکھ دیا
آدمی بننے کی ہم نے اس سے فرمائش نہ کی

یہ ہنر کا بھی ستارا ہے نہایت منحوس
ہم کسے غیر بتائیں، کسے اپنا سمجھیں

رکھنے کا جو گہر تھا اسے دل میں رکھ لیا
بکنے کا تھا جو مال، کتابوں کو دے دیا

اپنے لہو کی بوند بنا کر دم نشاط
اک سوزِ لازوال شرابوں کو دے دیا

موسم سیلاب آیا، ندی نالے بھر گیا
بے وطن سا اک پرندہ اڑ کے واپس گھر گیا

کیسی کالی رات بیتی، کیسا کالا دن چڑھا
جو بگولوں سے لڑا تھا، وہ صبا سے ڈر گیا

وحشت سرائے ذہن میں وہ بھی تھا اجنبی
دل میں رہا مقیم تو اپنے مکاں میں تھا

تہذیب قتل گاہ نے اتنا سکھا دیا
مرنا کہاں کمال ہے، جینا ہے فن کہاں

دل کہ اب ہے جسم کا بے آب سا گوشہ نعیم
چاند کا آئینہ خانہ، بادلوں کا گھر بھی تھا

مجھے بھی ابر کسی کوہ پر گنوا دیتا
میں بچ گیا کہ سمندر کا میں خزانہ تھا

پتا چلا یہ ہواؤں کو سر پٹکنے پر
میں ریگ دشت نہ تھا، سنگ صد زمانہ تھا

کچھ خطوط دست میں تھا، کچھ کتاب نجم میں
جو نہ ہونا تھا وہ اپنے پاس تھا لکھا ہوا

اس کی اپنی طول عمری کس قدر بے کیف تھی
وہ مرا تو کن دھنوں میں رات بھر باجا بجا

جب ہوا میں رقص کرتی جا رہی تھی اک پتنگ
جانے کس کے دل کا ٹکڑا چھت سے گر کر مر گیا

سنے گا ہند تو اس سے کہوں گا درد وفا
مرے جنوں سے غرض کیا عراق و شام کو اب

عجیب پیار سے اس نے حسن کہا تھا نعیم
میں کس طرح سے بھلاؤں گا اپنے نام کو اب

کھڑا ہوا ہوں مثال گیاہ طوفاں میں
کوئی درخت نہیں ہوں کہ وہ گرا دے گا

یہی ہجوم جو گھر کو جلانے آیا ہے
لگا کے آگ مجھے تمغۂ وفا دے گا

ایک دریا پار کرکے آگیا ہوں اس کے پاس
ایک صحرا کے سوا اب درمیاں کوئی نہیں

شبیہِ ماہ لیے آسماں سے اترا ہے
جدھر بھی جاؤں وہی دل نواز چہرہ ہے

جو تم ملو تو یہ دنیا ہے آبشار و چمن
ملو نہ تم تو یہ دنیا سراب و صحرا ہے

نہ گفتگو، نہ عنایت، نہ کوئی، رخصتِ جہاں
سرائے دل میں عجب شخص آکے ٹھہرا ہے

گذر ہی جائے گی آفات کی گھٹا بھی حسنؔ
حیات خود ہی گھڑی دو گھڑی کا لہرا ہے

ایک دنیا میں اپنے اندر ہوں
اس قفس کی فضا سے باہر ہوں

حاصلِ صد سفر ہے بے تابی
پہلے دریا تھا، اب سمندر ہوں

خس کی مانند بے نوا، بے بس
ہر ہوائے سبک سے بے گھر ہوں

سر سے پا تک لہو ٹپکتا ہے
آپ اپنی انا کا منظر ہوں

بہرِ عبرت ہے یہ جنم میرا
اگلے وقتوں کا میں پیمبر ہوں

رشکِ عرفی تھا میں حسنؔ آگے
اس زمانے میں سب سے کمتر ہوں

شعر کے قالب میں کچھ سوزِ دروں رہ جائے گا
جتنا آنکھوں سے بہے گا، اتنا خوں رہ جائے گا

جلتا ہوں بے گناہ میں دنیا کی آگ میں
اب کے حیات مانگ تو دنیا سے دوں نہ مانگ

جس نے بھی جانا عشق کو تفریح، خوش رہا
سنجیدہ ہو کے ہم تو نہایت دکھی رہے

اک کوہ سربلند پہ تنہا کھلا جو پھول
سورج سے وہ نہ آنکھ لڑائے تو کیا کرے

کیا خبر تجھ کو ہوا، نقشِ قدم سے تیرے
کتنے قدموں کے نشاں خاک میں مل جاتے ہیں

اپنے ہی رُخ سے بند ہوئے راستے تمام
بیدل کی ایک چال سے بے چال ہو گئے

اشعار اپنے پاس تھے کاغذ کے روپ میں
ناشر نے جب چھپوا تو زر و مال ہو گئے

سیرِ فلک سے خون کی گردش بڑھی تو ہے
تھکنے لگے تھے پانو زمیں پر کھڑے کھڑے

ہم کو بھی اے بگولو! سوئے دشت لے چلو
ہم خاک ہو چلے ہیں، گلی میں پڑے پڑے

یہ کائنات ہی اس کی ہے، کوہ و دریا کیا
یہاں ایک کنج میں دھونی رما کے بیٹھا ہوں

میں جس کی کھوج میں سب کچھ لٹا کے نکلا تھا
اسی کو جوشِ جنوں میں گنوا کے بیٹھا ہوں

لڑا، تو لشکرِ سلطاں سے جم کے میداں میں
بلا سے مجلسِ خوباں میں بے وفا ٹھہرا

فرازِ کوہ سے آواز دو تو آؤں بھی ۔۔۔ یں ہر مہم میں طلب کی شکستہ پا ٹھہرا
بدل کے بھیس میں آتا رہا ہوں دنیا میں ۔۔۔ تمہیں بتاؤ میں تم سے کہاں جدا ٹھہرا
مری بھی ایک صفت ہے شہابِ ثاقب میں ۔۔۔ سیاہ شب میں وہی شعلۂ نوا ٹھہرا
لکھو گے کیسے حسن خود کو صرف تم زیدی ۔۔۔ تمہارا سارے شہیدوں سے سلسلہ ٹھہرا

جبرِ شہی کا صرف بغاوت علاج ہے ۔۔۔ اپنا ازل سے ایک حسینی مزاج ہے
آگے تو زہرِ عشق میں سب زہر تھے گھلے ۔۔۔ اب شاعری کی جان رگِ احتجاج ہے
کیا دی ہے لب کشائی کی قیمت اسے بھی دیکھ ۔۔۔ اس دفترِ نوا میں سبھی اندراج ہے
اقبال کی نوا سے مشرف ہے گو نعیم ۔۔۔ اردو کے سر پہ میر کی غزلوں کا تاج ہے

جو تشنہ کاموں کو ساتھ لے کر تلاشِ آبِ رواں میں نکلا ۔۔۔ سمندروں سے سوا ہے گہرا وہ پربتوں سے کہیں بڑا ہے
ہزار پہلو سے دیکھتا ہے وہ اپنے شیشے میں آدمی کو ۔۔۔ جو اس کو تھوڑا بھی جانتا ہے وہ ایک دنیا کو جانتا ہے

غم نہیں مسکن احساس جو ٹھہرا ہے دماغ ۔۔۔ دل کے ساغر میں سوا خون کے بھرا ہی کیا تھا
کیا ٹھہرتا کوئی صحرائے تمنا میں حسن ۔۔۔ برگِ ماضی کے سوا اس میں دھرا ہی کیا تھا

ہجر اک یاد کی خوشبو میں ہے بستے رہنا ۔۔۔ وصل اک تازہ گلستاں سے شناسائی ہے

اپنی صفوں میں علم ہے جرأت ہے وقت ہے ۔۔۔ ایسا نہیں کہ سچ کا مقدر شکست ہے
تنکے تمام چن کے بیابیں اڑی چلیں ۔۔۔ ان جھاڑیوں کے بعد سہانا درخت ہے
اپنے جنوں کے دوست ہیں سورج بھی چاند بھی ۔۔۔ مانا حسن نعیم ابھی دھوپ سخت ہے

جہاں پہ ایک بھی ٹیلا نظر نہ آتا تھا ۔۔۔ وہاں سے لوگ اٹھا کر پہاڑ لائے ہیں
کٹے ہیں پانو تو ہاتھوں کے بل چلے برسوں ۔۔۔ مثالِ موج ترے ہم کنار آئے ہیں

ان سے بچھڑے تو مؤذن کی صدا بھول گئے ۔۔۔ جس کو پڑھتے تھے دمِ شب وہ دعا بھول گئے
پتے پتے کی رہی موجِ صبا سے یاری ۔۔۔ پھول کب شاخ سے ہوتا ہے جدا بھول گئے

پانو سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی ۔۔۔ اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں
ہم لہو روئے ہیں برسوں تو کھلی زلفِ خیال ۔۔۔ یوں نہ اس ناگ کو لہرانے کے فن آئے ہیں

نگاہیں دیکھ لیتی ہیں جہاں ہیں درد کے چشمے ۔۔۔ وہ چہرہ ڈوب جاتا ہے نعیم آنسو بہانے میں

کرو نہ دفن کہ مقتل کا نام اونچا ہو ____ لٹادو خاک پہ لاشے کو قبلہ رو کر کے
جب تک شعورِ عشق ہے، پاسِ جمال ہے — زندانِ آرزو سے نکلنا محال ہے
ہر لمحہ اضطراب ہے، ہر لحظہ انتشار ____ دل کا وہی ہے حال جو دنیا کا حال ہے
کوئی تنہا نہیں دنیا میں بجز درد وفا ____ اس کے ہمدم ترے آنسو، نہ مری کوہ کنی
کوئی جیسے نوکِ سناں لیے شب و روز سر پہ کھڑا رہا ____ ہے اذیتوں کے شمار میں یہ اذیتوں کا ہراس بھی
اک مغنی کا وہ گھر تھا جس سے اٹھتا ہے دھواں — جس جگہ یہ مدرسہ ہے حسن کا بازار تھا
سر جھکا لینے سے ٹل جاتیں ہزاروں آفتیں ____ سارے ہنگامے کا باعث اپنا ہی کردار تھا
جاگے تمام عمر کہ ہر سو نگاہ تھی — دنیا مرے حبیب کی آرام گاہ تھی
یاروں کو ہر طرح کا تحفظ عزیز تھا ____ ہم نے چنی وہ راہ جو مردوں کی راہ تھی
نہ وہ ملا، نہ کوئی آرزو ہے اب اس کی ____ مری طلب کو بہر حال رائگاں کہیے
ان وفاؤں کے صلے میں کچھ جفا بھی چاہیے — مجھکو جینے کے لیے تازہ ہوا بھی چاہیے
اس جہانِ آرزو میں زندہ رہنے کے لیے ____ آدمی کو مہرباں سا اک خدا بھی چاہیے
خیال و خواب نے افلاک سے قریں رکھا — زمیں کی سمت بھی لوٹے تو بس ہواہیں رہے
غزل تھی سب کی نوا، بسکہ نام میرا تھا ____ یہ مے نوازشِ دوراں تھی، جام میرا تھا
مری ہی ضد نے کیا بادباں کو چاک مگر ____ بھنور سے بچ کے نکلنا بھی کام میرا تھا
شورِ دریا نہ سنو، کتبۂ ساحل کو پڑھو — ہر سخن کا یہ تقاضا ہے مرے دل کو پڑھو
اس خبرگاہ میں اک دفترِ حیرت ہے وہی — قیمتِ علم لگانی ہے تو جاہل کو پڑھو
کتنے اوراق کھلیں منصف و شاہد کے لیے — قتل ثابت ہے مگر صورتِ قاتل کو پڑھو
ایک طغرا خطِ کوفی میں ہے وہ سب سے جدا ____ آنکھیں روشن ہوں جو اس زہرہ شمائل کو پڑھو
پو پھٹی تھی کہ شبِ وصل کا پیغام ملا — سو گئے خواب کی بانہوں میں جو آرام ملا
ڈھونڈتے رہیے شب و روز امیدوں کے قدم — کوچۂ زیست میں لے دے کے یہی کام ملا
پاپیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی — جھک کے تعظیم سے شہزادۂ ایام ملا
ہم نے بیچی نہیں جس روز متاعِ غیرت ____ اک پیالہ بھی نہ مے کا ہمیں اس شام ملا

سارے جہاں کی سیر کا امکان مل گیا ____ بوئے چمن کو راہ میں طوفان مل گیا
روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب   میں چلا، برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا
گیا بساط خار و خس تھی پھر بھی یوں شب بھر جلے ____ دوش پر بادِ سحر کے دور تک شعلہ گیا
یہ دل کہ قصبۂ گم نام سے مشابہ تھا ____ ترے قدم سے ہے معروف شہر کی مانند
اب تو آجاؤ کہ ہم نے کاٹ لی قیدِ انا   انتظار روشنی میں اپنا دیدہ بہہ چلا
کس طرح اب باندھیے گا عشق کے مضموں نعیم ____ یاں وصال یار بھی ہے "اقتصادی مسئلہ"
خواب کی راہ میں آئے نہ در و بام کبھی   اس مسافر نے اٹھایا نہیں آرام کبھی
اے صبا میں بھی تھا آشفتہ سروں میں یکتا ____ پوچھنا دلّی کی گلیوں سے مرا نام کبھی
اٹھائے منت صرصر کہ ناز بادِ نسیم   ہر ایک حال میں صحرا شکار ہے تنہا
چہل پہل ہے بہت یوں تو میکدے میں نعیم ____ میانِ جام و سبو شیشہ دار ہے تنہا
سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں یہ رات ____ نہیں ہے شرط کہ مجھکو شریک خواب بنا
کوئی وجہ غم نہیں ہے، کسی بات کا ہے غم بھی   اسی درد گم شدہ سے کبھی رو دیے ہیں ہم بھی
وہی طالب ضیا ہو جو اٹھائے ناز ظلمت ____ وہی بوئے سحر لے جو سنوارے شام غم بھی
شاید کہ مثل مہر کوئی آئے صبح دم ____ شام فراق تم بھی جگر کو لہو کرو
جوئے رواں کے پاس ہے سویا ہوا کوئی   جھولی میں زاد راہ نہ منزل کی گرد ہے
حیراں ہے برگ سبز جو سائے میں اس کے آج ____ گم صم کھڑا ہوا کوئی صحرا نورد ہے
پیکر ناز پہ جب موج حیا چلتی تھی   قریۂ جاں میں محبت کی ہوا چلتی تھی
ان کے کوچے سے گزرتا تھا اٹھائے ہوئے سر ____ جذبۂ عشق کے ہم راہ انا چلتی تھی
دل میں اترو گے تو اک جوئے وفا پاؤ گے   موج در موج سمندر کا پتا پاؤ گے
میں تو کھو جاؤں گا تنہائی کے جنگل میں کہیں ____ تم بھرے گھر میں کہاں مجھکو بھلا پاؤ گے
جل کے ہم راکھ ہوئے ہیں کہ بنے ہیں کندن   جوہری بن کے کسی شخص نے پرکھا ہی نہیں
گرد شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا ____ کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں
تو نے خزانہ دیکھ کے سر کیوں جھکا لیا ____ رہتا ہے سربلند جہاں شیش ناگ بھی

میرے قدموں کے نشاں راہ سے کچھ دور سہی ___ تم سے میں دور نہیں ہوں، مجھے آواز تو دو
یہی رشتہ درد کا کم نہیں کہ شکایتوں میں سکوں ملے   صفِ دل براں کا وہ تاج ور مری گفتگو سے خفا تو ہے
گلِ سایہ بن کے جیا تو ہے کوئی دن کے یورشِ نور میں ___ کوئی صحنِ شب میں تمام شب رُخِ یار بن کے جلا تو ہے
کوئی دشت مہرباں ہو تو سفر آسان ہے ___ ورنہ ہر پتھر ہے بھاری، ہر کنواں ویران ہے
مژدۂ صبح بیاں ہے، میری غزلوں کا ظہور   لمسِ معنیٰ، بوسۂ شعلہ رخاں سے کم نہیں
ایک طوفاں ساحلوں سے دور رکھتا ہے مجھے ___ اس سفر میں تارِ دامن بادباں سے کم نہیں
اک دوسرے کو دیکھ کے حسرت سے رہ گئے ___ دونوں کے ارد گرد روایت کا جال تھا
ہر سخن سے گرم تر ہے سینۂ مہر و خلوص ___ بے ہنر لوگوں کو سینے سے لگا کر دیکھیے
دل میں نہ جانے کیا رہا، مثلِ شرارِ جستجو   جوشِ طلب کے وقت بھی، ترکِ طلب کے بعد بھی
تجھکو بتائیں کیا صبا، ہم نے جلایا کیوں چراغ   آمدِ خور کے باوجود، رخصتِ شب کے بعد بھی
سر میں اگر جنوں نہ ہو ملتا نہیں ہے تاجِ فن ___ فکر و نظر کے باوجود، نام و نسب کے بعد بھی
بامِ خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح ___ خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے
اتنا دلِ نعیم کو ویران نہ کر حجاز ___ روئے گی موجِ گنگ جو اس تک خبر گئی
یہ کشتیاں، یہ ہوائیں، یہ بادباں سب ہیچ ___ افق کے پار کوئی اور ہی اتارے گا
کچھ قربتوں میں لطف، تو کچھ دوریوں میں ہے ___ یاروں سے رہ قریب بھی، یاروں سے بھاگ بھی
کہاں میں، ہجرت کے مرحلوں میں اُٹھائے پھرتا غمِ مکاں کو
خلا سے رشتہ جڑا تو دیکھا نہ مُڑ کے ساحل نہ بادباں کو
ملا نہ کوئی جو ہم نفس ہو سکوتِ جنگل میں ہم قدم ہو
کہیں تو لیکن ہے کوئی ایسا جو آس دیتا ہے قلب و جاں کو
کتنے برسوں میں لہو آنکھ سے ٹپکا شب بھر   قرض تھا مجھ پہ بہت کاسۂ دل داری کا
میں نے الزام کی تردید میں حق گوئی کی ___ نام اونچا نہ ہوا مجھ سے رواداری کا
کوئی پہاڑ نہیں تھا جو ہم نے سر نہ کیا   ملے وہ خواب کہ آرام عمر بھر نہ کیا
یہ کیوں ہوا کہ سدا اجنبی دلوں میں بسے ___ اسی کا دل تھا حسن جس میں تم نے گھر نہ کیا

بس یہی فکر کرو جلتی رہے آتش فن — آتش رشک سے محفل میں دھواں ہے تو رہے

نہ میرے خواب کو پیکر، نہ خد و خال دیا — بہت دیا تو مجھے موقع وصال دیا
ملا نہ روح نہ دل کا کوئی حساب مگر — یہ کار زیست کسی طور سے سنبھال دیا
مرے عیوب کی تصویر اس طرح کھینچی — مرے ہنر کو پس پشت اس نے ڈال دیا

قصیدہ تجھ سے، غزل تجھ سے، مرثیہ تجھ سے — ہر ایک حرف ہوا صاحب نوا تجھ سے
زباں کشائی غم سے کھلی کتاب خیال — ورق ورق پہ کھلا برگ مدعا تجھ سے
زمیں سے پھوٹ پڑا چشمۂ جنوں ساماں — گلوں میں سرد پڑی آتش قبا تجھ سے
کہاں سے زود فراموشیوں کی خو سیکھی — جو دیکھیے تو نہ تھی برق آشنا تجھ سے
پہنچ تو جاتا سر خیمۂ وفا آباد — مگر ہے سست قدم عمر تیز پا تجھ سے

قصبہ و شہر میں ہے آگ کا طوفاں برپا — کون سی شاخ پہ چڑھ کر یہ نظارا دیکھوں
کوچہ ویراں ہے ستوں سوچ رہا ہے کب سے — کیا دھرا ہے جو مکینوں کا میں رستا دیکھوں
مجھ کو ہر رنگ میں وہ شخص بھلا لگتا تھا — اس کو غم دیدہ و خاموش کہ ہنستا دیکھوں

قطرۂ مے سے دبا رات نہ طوفان طلب — مجھ پہ کیا بیت گئی رات سنا تو ہوگا
یہ بھی تسلیم کر تو مجھ سے بچھڑ کے خوش ہے — تیرے آنچل کا کوئی تار ہنسا تو ہوگا

میرا محبوب ہے وہ شخص جو چاہے تو نعیم — سوکھی ڈالی کو بھی گلشن میں بدل سکتا ہے

پتا نہیں کہ وہ چہرے کا رنگ تھا، کیا تھا — لہو نچوڑ کے جینے کا ڈھنگ تھا، کیا تھا
نکل پڑی ہے مری روح کیوں برہنہ پا — لباس عشق بہت دل پہ تنگ تھا، کیا تھا
پڑی ہے خاک پہ اک لاش تو چلو دیکھیں — یہ اپنے ملک کا باسی ملنگ تھا، کیا تھا
نعیم کتنے چمن اور کھل اٹھے دل میں — وصال یار رہی خوشبو تھا، رنگ تھا، کیا تھا

مکتوب یار ہوتا تو حرف حرف پڑھتے — تحریر وقت پڑھ لی، ہم نے ادھر ادھر سے
جیسے ہی شام آئی، جوڑا بطوں کا اترا — جس پیڑ کے تلے تھا، اک شخص دوپہر سے

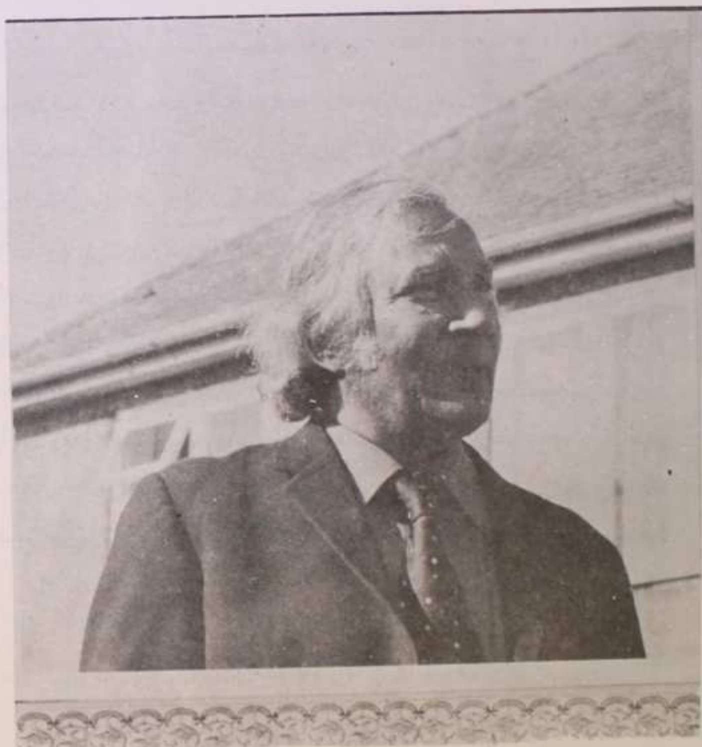
کسے بتائیں کہ غم کے صحرا کو خلد دانش بنایا کیسے — کہاں سے آب رواں کو موڑا کہاں سے باد بہار لائے

ڈھونڈو تو صرف آنچ ہے، شعلہ کہیں نہیں — جلتا ہے دل کہ غم کا سراپا کہیں نہیں

شاعر کا ہے وہ خواب، رسولوں کی آرزو   تم جس کو ڈھونڈتے ہو، وہ دنیا کہیں نہیں
سامان صد چمن تھا اٹھائے ہوئے نسیم ____ وہ کاروانِ ابر جو اترا کہیں نہیں
میں کس ورق کو چھپاؤں، دکھاؤں کون سا باب   کسی حبیب نے مانگی ہے زندگی کی کتاب
گیا تھا دشت سے اٹھ کر سمندروں کی طرف ____ وہاں بھی تشنہ نصیبی، وہاں بھی مرگ سراب
رکھیے بچا کے اپنا دفینہ حسن نعیم   غم کو لٹائیے نہ زر و مال کی طرح
اب خدا جانے تجھے بھی ہے تعلق کہ نہیں ____ لوگ لیتے ہیں مرا نام ترے نام کے بعد
دشت پیمائی ہے میری عہد حاضر کا جنوں ____ بن چکے ہیں مجھ سے پہلے میرے قدموں کے نشاں
کتنے اشکوں کے دیے جلتے رہے بجھتے رہے ____ یوں بظاہر چین سے میں رات بھر سوتا رہا
سچ تو یہ ہے کہ ابھی دل کو سکوں ہے لیکن   اپنے آوارہ خیالات سے جی ڈرتا ہے
اتنا رویا ہوں غم یار ذرا ہنس کر   مسکراتے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے
جو بھی کہنا ہے کہو صاف شکایت ہی سہی ____ ان اشارات و کنایات سے جی ڈرتا ہے
وہاں یقین کہ خود ہی کہیں گے حرف جنوں ____ یہاں یہ فکر فضا سازگار ہو تو کہیں

●●

خورشیدالاسلام



خورشید الاسلام (پ) ۱۹۱۹ء

عکسِ تحریر

خورشید الاسلام

مَیں ۱۹۱۹ء میں ریاست رام پور میں پیدا ہوا۔ جہاں میرے والد اختر جمیل صاحب مرحوم، ایک اچھے عہدہ پر مامور تھے۔ گھر میں زمینداری تھی اور میں اکلوتا لڑکا تھا۔ لیکن ابھی ۵ برس ہی کا تھا کہ ابّا کا انتقال ہوگیا۔ یہ صدمہ میرے لیے آج بھی تازہ ہے۔ دادا دو سال تک اور اس دنیا میں رہے، فارسی کے عالم تھے، ان کی وجاہت جلال اور شفقت کا دل پر بہت گہرا اثر ہے۔ انھیں پڑھنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ ابّا کے انتقال کے بعد انھوں نے جس طرح میری تربیت کی، میں اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں خلیفۃ المسلمین ہونے والا ہوں۔ مجھے ان کی محبت اور ڈسپلن دونوں سے وحشت ہونے لگی۔ جی چاہتا تھا کہ بچوں کے ساتھ کھیلوں، ہنسوں یا روؤں لیکن تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ بہر حال سات برس کی عمر تک میں نے قرآن شریف کے علاوہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی کتابیں اور گلستاں، بوستاں اور حکایاتِ لطیف پڑھ ڈالیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مجھے علم یا ادب سے کوئی شغف ہے یا میرے اندر کوئی ذوق ہے تو وہ سب میرے دادا کی دین ہے۔ گیارہ برس کی عمر تک، پتہ نہیں کیا کیا پڑھ ڈالا۔ تین کتابیں بے حد پسند آئیں، باغ و بہار، آرائش محفل اور قصص الانبیاء۔ راز کی بات یہ ہے کہ زہرِ عشق بھی پڑھ ڈالی۔ سمجھا تو کیا خاک، لیکن یہ حصہ حفظ ہوگیا کہ 'جائے عبرت سرائے فانی ہے' یہ شعر رہ رہ کے نہ جانے کیوں دل میں چبھتا تھا کہ

یاد اپنی تمھیں دلاتے جائیں　　　پان کل کے لیے لگاتے جائیں

اسی زمانہ میں ایک روز الہام ہوا اور بفضلہٖ ایک غزل سرانجام ہوئی جس کا ایک شعر اب بھی یاد ہے اور وہ یہ ہے ؎

حالِ دل پوچھتے ہیں جب وہ مرا　　　عرض کرتا ہوں مہربانی ہے

کیا زمانہ تھا۔ اب جو اگلی زندگی کی تصویریں یاد آتی ہیں تو ابّا کا کتابی چہرہ اور پُرسکون مگر بولتی ہوئی روشن آنکھیں، دادا کا براق لباس اور طنطنہ اور کتب بینی، ماں کی غیر معمولی خود داری، ایثار اور سرخ و سپید چہرہ — یہ سب

یوں نظر آتے ہیں جیسے نہ میں بدلا ہوں، نہ زمانہ بدلا ہے، نہ یہ لوگ کہیں گئے ہیں۔ یہیں تھے، یہیں ہیں۔

ابا کے انتقال کے بعد والدہ نے قسم کھائی کہ آج سے نہ کسی عزیز کے یہاں جائیں گی، نہ کسی تقریب میں شریک ہوں گی۔ میرا خاندان، قاضیوں کا ہے جو بجنور میں ہر اعتبار سے محترم رہا ہے۔ ان اعتبارات میں خوش حالی بھی ہے۔ لیکن ہماری ماں نے، ہمارے اندر کوئی ایسی بات پیدا کر دی کہ خواہش، عفت پر قانع ہو گئی۔ میں ادب کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ زندگی بھر، نہ کسی امیر سے مرعوب ہوا ہوں اور نہ کسی کی امارت کو خاطر میں لایا ہوں۔ غربت کی صعوبتیں جھیلی ہیں اور فراغت میں کبھی وہ سیری نہیں ہوئی کہ دل سخت ہو جائے اور مسکین نظر میں حقیر ہو جائیں۔ گیارہ برس کی عمر میں دلی پہنچا۔ ایک سال تکلیف اور تنہائی کا ایسا دیکھا کہ دنیا نظر میں تاریک ہو گئی۔ اس عالم میں خدا سے دل لگایا۔ اور ۲۰ برس کی عمر تک، وہ وہ سجدے کیے کہ ہر سجدہ گویا ایک جام تھا جو 'وہاں' سے آتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج تک جتنے 'مذہبی' آدمی دیکھے، انھوں نے میرے سکوت کو اپنی گویائی کا حریف پایا۔ آج میں "آزاد مرد" ہوں۔ لیکن جو چیز میرے لبوں میں ہے وہ دوسروں کے صرف لبوں پر ہے۔ علی گڑھ میں رہتے رہتے چھیالیس سال ہو گئے ایسا شخص کم دیکھا جس کے دل میں ایمان کی روشنی ہو۔ یعنی اُس کا دل، زبان اور کام ایک ہوں۔ میں اپنی کا فرماجرائی پر نازاں ہوں اور یہ نہیں جانتا کہ نجات کا غم کیا ہوتا ہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ دنیا کیسے برتی جاتی ہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ دولت کیوں اور کیسے جمع کی جاتی ہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ حلقۂ احباب کیوں کر وسیع کیا جاتا ہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ ترقی کی پہلی منزل اور آخری منزل کیا ہوتی ہے۔ زندگی یوں بسر کرتا ہوں کہ موت کو نہیں بھولتا اور انشاء اللہ جب موت آئے گی تو دل پاک اور پر سکون ہو گا۔

۱۹۳۸ء میں دلی سے ہائی اسکول کیا اور ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ سے ایم۔اے کیا۔ امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیے۔ طالب علمی کے زمانے میں تحریر اور تقریر میں میرا کوئی حریف نہیں تھا۔ بی۔اے فائنل میں یونیورسٹی یونین میں سیرلڈ کوکس کیمبرج اسپیکنگ پرائز ملا، اور طالب علمی کے زمانہ کے ایک مضمون "شبلی" کی داد، ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری اور عبدالماجد دریابادی نے دی۔ ان بزرگوں کے چند جملوں کا مرتے دم تک ممنون رہوں گا۔ مقابلہ کے امتحان میں اس لیے نہیں بیٹھا کہ انگریز سے نفرت تھی۔ وکالت کا خیال اس لیے چھوڑا کہ جھوٹ سے نفرت تھی۔ اردو میں ایم۔اے اسلیے نہیں کیا کہ رزق یا موت میسر نہیں تھی، بلکہ صرف اس لیے کہ اُس سے عشق تھا۔ مگر علیگڑھ میں اس جرم پر کیا کیا سہنا پڑا یہ دل ہی جانتا ہے۔ علیگڑھ بحیثیت مجموعی "معوج الضمیر" ہے۔ یہاں لوگ ہر قوال کو امیر خسرو بتاتے ہیں۔ اور جو لوگ اعلیٰ قدروں کا نام لیتے ہیں وہ اشتراکی ہوں یا مسلمان، محض بہروپیے ہیں۔

۱۹۴۵ء میں لکچرر ہوا۔ ۱۹۵۲ء تک علمی زندگی کا ایک بھیانک روپ دیکھا۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے

کہ نحیف و نزار رہا ہوں۔ بلکہ یہ سمجھیے کہ ہر صاحبِ جاہ کا رقیب رہا ہوں اور پھر اس کا خمیازہ بھگتا ہے۔ خمیازہ تین صورتوں میں، ایک مسلسل ذہنی تکلیف میں کہ دنیا ایسی کیوں ہے" اور دوسرے روحانی تنہائی میں اور تیسرے ہر جائز حق سے محرومی میں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری وضع مضبوط رہی۔ مگر ایک نقصان اس سے یہ ہوا کہ میں اپنے حوصلہ کے مطابق نہ شعر کہہ سکا اور نہ نثر لکھ سکا۔ یہ ضرور ہے کہ جو کچھ لکھا اُسے اُن بزرگوں اور عزیزوں نے سراہا جو بے لوث تھے اور انھوں نے سکوت اختیار کیا جن کے قلب میں لکنت تھی۔ ۱۹۵۲ء میں لندن یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے گیا اور ۱۹۵۶ء تک رہا۔ یہاں میرے رفیق کار رالف رسل تھے ان سے میری دوستی مثالی ہے۔ ہم نے اردو کا جو کام انگریزی میں کیا ہے اور جو کر رہے ہیں اور کریں گے اس سے امید ہے کہ ہماری زبان دنیا میں معروف ہوگی اور ہمارا ادب دنیا میں شرف قبول پائے گا۔ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم۔

شعر میرا مزاج ہے۔ میں دنیا کے ادب سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ اور شعر کی ہر شکل مجھے محبوب ہے۔ اور کوئی موضوع ایسا نہیں جس سے مجھے کسی قسم کا تعصب ہو۔ یورپ میں نو دس سال اس طرح رہا ہوں جیسے پرندے ہوا میں رہتے ہیں لہٰذا میری نظر میں ہندوستان کا "جدید" بھی کسی حد تک قدیم ہے۔ وہ تعلیم میں ہو، سیاست میں ہو، روزمرہ انسانی تعلقات میں یا ادب میں۔ لیکن مجھے بلا ضرورت اپنے ماحول یا اپنے مزاج سے بغاوت پسند نہیں ہے اور ہر گز ہرگز کسی فیشن یا فارمولے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ غزل میری طبیعت سے ایک خاص مناسبت رکھتی ہے۔ میں نے بہت کہا ہے جس میں سے بیشتر بعض اسباب کی بنا پر ضائع ہو گیا ہے۔ مقدار کی شاعری میں ایک اہمیت ہے اور اشتہار تو اس زمانہ میں قدرت کے اشارہ کا حکم رکھتا ہے۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ مقدار کم اور اشتہار صفر۔ پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ مجنوں گورکھپوری نے میری غزل کو سراہا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے میرے مجموعۂ کلام کو اردو شاعری کے لیے فال نیک بتایا۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری نے گرمجوشی کے ساتھ اس پر عارفانہ تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ایک مضمون میں میرا اور نقدِ غزل کا حق ادا کر دیا۔ اور علی سردار جعفری نے ایک خط میں لکھا:۔

"برادرم۔ تسلیم! اس رات کی مختصر مگر پُرلطف صحبت طویل اور طویل تر صحبتوں سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔ زندگی میں اگر اتفاقات اتنے ہی حسین ہوا کریں تو کیا کہنا۔ آپ کی غزل ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے ... ایسا لگتا ہے کہ شعر کی زبان روز بروز گونگی ہوتی جا رہی ہے۔ اس عالم میں ایسی چہکتی اور دہکتی غزل کون کہتا ہے۔ آپ کو اپنی گوشہ نشینی مبارک ہو تاکہ بار بار ایسا دلکش اندازِ سخن جاگے۔"

میں شکوہ کم کرتا ہوں اور محبت زیادہ۔ لہٰذا میں نے جو یہ چند صفحے لکھے ہیں ان میں اگر کہیں غصّے کا اظہار کیا ہے یا شکایت کی ہے یا اپنی تعریف کی ہے تو وہ کسی داخلی جبر کی بنا پر کی ہے۔ غصہ اُس پر ہے جسے زمانہ کہتے ہیں اور جو قابو سے باہر ہے۔ شکایت ان سے ہے جن سے محبت تھی اور ہے۔ تعریف اپنی نہیں ہے خدا کی ہے، جو ہر تعریف کے لائق ہے۔

انتخابِ کلام

خاک سی اُڑتی ہے سینے میں یقیں کے ہر دم
قافلے آ کے ٹھہرتے تھے گماں میں پہلے
اب جو ہے گرمیِ بازار تو ہم اس میں نہیں
ہم بھی تھے گرمیِ بازارِ جہاں میں پہلے

شمع جلتی ہے تو پروانوں کا آتا ہے خیال
اور بجھتی ہے تو بجھنے پہ ملال آتا ہے
عینِ ہجراں میں بھی ملتی ہے کبھی لذّتِ وصل
عینِ لذّت میں بھی لذت پہ زوال آتا ہے

اس شور میں کیا کوئی سُنے گا مری آواز
جس شور میں ماتم کی صدا ڈوب چلی ہے

کہیں لپک اٹھے شعلے، کہیں مہک اُٹھے گل
شبِ فراق نہ پوچھو کہاں کہاں گذری
بہ شکلِ قامتِ آدم، بہ طرزِ رقصِ پری
ہمارے سر پہ قیامت بھی کیا جواں گذری

دیکھا انھیں قریب سے ہم نے، تو رو دیئے
جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم

زمیں سے شکر و شکایت ہے، آسماں سے نہیں
کہ ہم یہیں سے ہیں، جو کچھ بھی ہیں، وہاں سے نہیں

وہ اور بزم ہے جس میں چراغ جلتے ہیں
یہاں تو اپنے ہی دل اور دماغ جلتے ہیں

دبے جو آگ تو دِل سے دھواں سا اٹھتا ہے
مکاں کے پردے سے اک لامکاں سا اٹھتا ہے
نہ پوچھ تشنگی اُس شخص کی جو بعدِ وصال
کسی کے پہلو سے یوں کامراں سا اٹھتا ہے

یہاں تو کوئی نہیں دِل تلک اکیلا ہے۔
قبا کے بند تو کھولو، ہمارے پاس تو آؤ

کچھ تو ہو جس کے فیض سے دل کو ہو تاب و تب بہم
کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم

ویرانیوں نے بڑھ کے گلے سے لگا لیا
لے کر دلوں میں کیسے خزانے چلے تھے ہم

ہم پہ اگرچہ بھاری گذری، پھر بھی تھی کیا پیاری رات
آپ بھی تڑپی ساتھ ہمارے، آپ بھی جاگی ساری رات

خوں سے میرے ترا دامن اگر تر ہے تو کیا
تیرے چہرے پہ ابھی تک سادگی کا رنگ ہے

خانقاہوں سے تعلق ہے نہ درباروں سے
نسبتِ سلسلۂ زلفِ بتاں رکھتے ہیں

لائیں کہاں سے تاب کہ دیکھیں یہ فصلِ گل
جو شخص ہے لہو میں نہایا ہوا سا ہے

جو غم ہے آدمی کو یہاں، آدمی سے ہے ——— جو غم بھی ہے زمانے میں لایا ہوا سا ہے

یہ کیفیت ہے نشاط و الم سے کچھ آگے ——— کہ دل ہے خلدِ تماشا، دماغ شورِ جحیم

جن سے دلِ مایوس میں گرمی کی رمق تھی ——— وہ لوگ بھی جب دل سے اتر جائیں تو کیا ہو

وہ سادہ دل ہیں کہ غیروں کو راز داں جانا ——— وہ بدگماں ہیں کہ ہر راز داں سے روٹھ گئے

ذوقِ یقیں کی، حسنِ مروّت کی، غم کی موت ——— جو کچھ دکھائے عمرِ رواں، دیکھتے چلیں

مانا کہ رائیگاں ہی گئی عمرِ بے ثبات ——— پھر بھی حسابِ سود و زیاں، دیکھتے چلیں

یہ رنگ و بوئے گل و لالہ خوب ہیں لیکن ——— کہاں کہاں سے مرا شوق سوگوار آیا

چراغ جلتے ہیں، بجھتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں ——— تمام کام، غرض، یوں تمام ہوتے ہیں

یہ آرزو ہے کبھی تو نوائے جاں سنتے ——— کہ حرفِ دہر جو سنتے ہیں، سخت مبہم ہے

آسماں توڑ کے آدم تو زمیں تک آیا ——— پھر دمِ گردشِ پرکار سے آگے نہ گئے

تا دیر اہلِ بزم رہیں گم ورائے بزم ——— تا دیر شمعِ کشتہ کے سر پر دھواں رہے

یہ رسم ملکِ عجم ہے کہ قبلِ دورِ شراب ——— گرج کے پیرِ مغاں، لا الٰہ کہتا ہے

تمام عمر اسی پیچ و تاب میں گزری ——— کہ نشہ سیل کا تھا اور خمار ساحل کا

کمالِ بے خبری ہے کہ لطفِ جاں کے لیے ——— ہم اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں ہاتھ قاتل کا

تمام عمر یہ صحبت رہی تمنا سے ——— وہ شاخِ گل پہ رہی اور میں قفس میں رہا

دوزخ مرا حریف ہو گیا جس کے دار میں   شعلوں کی برہمی ہے، مری برہمی سے کم

ہم ہیں تمام معرکہ، ہم ہیں تمام وجد ——— ہم بھی نہیں ہیں حشر کی شوریدگی سے کم

قہرِ یزید و قہرِ خدا، سب کو مرحبا ——— ہم کو تو اپنا شوقِ شہادت عزیز ہے

کیا لطف اک خلش میں، خرابی میں کیا مزہ ——— کوئی ستم ہو، اس کی نہایت عزیز ہے

ہم نہ روتے جو ابر کی مانند ——— ابر، کاشانۂ ہوا ہوتا

سر کی مستی سے چلے یا پاؤں کی گرمی سے ہم ——— زندگی بھر خدمتِ کوہِ گراں کرتے رہے

گنہ کی آنچ سے ہوتا ہے حسن بالیدہ ——— گنہ کی آگ میں تپ کر جواں نکھرتے ہیں

کفر کے شعلہ کو الفاظ سے آتا ہے حجاب ——— قصۂ غم تو نہیں ہے کہ سناتے جائیں

دیکھا ہے میں نے عرش سے دنیا کو بار بار
جنت کے اِرد گِرد جہنم نظر میں ہے

کسی سے کاہے کو مانگیں لبانِ خوش بوسہ
ہم اپنے خوابوں کے گل پیرہن میں رہتے ہیں

جو صحنِ خانہ سے لیتے ہیں، آسماں کا سراغ
وہ اِس خرابے کے اندر چمن میں رہتے ہیں

ہاں زمیں کا ذائقہ کیسا لگا مریخ میں
گھوم پھر کر دیکھ آئے لامکاں، آگے کہو

برق و باراں، کاروبارِ زندگی، فکرِ یزید
فیض سے لطفِ خدا کے ہیں رواں، آگے کہو

غم تھا، خوشی تھی، بے خبری تھی کہ بے کسی
دے دے کے تابِ دل کو، بلوتے رہے ہیں ہم

حیرت سے ہم نے شب میں یہ دیکھا ہے ماجرا
دامن کو روشنی میں بھگوتے رہے ہیں ہم

آنکھوں کا یہ بھی کام، کرامت سے کم نہیں
خود تو رہیں غنودہ، اثر جاگتا رہے

آدمی زندگی پہ مرتا ہے
زندگی آدمی کو ڈستی ہے

شب کے سناٹے میں، ہر روز کہیں پر جیسے
کوئی صحرا، کسی دریا کو صدا دیتا ہے

زندگی شاید کوئی نالہ تھی، سر ہوتی رہی
زندگی شاید کوئی نغمہ تھی، ہم گاتے رہے

اُڑا کے لے گئی جو میرے ساتھ دنیا کو
وہ بیخودی تو مری غم گسار اب بھی ہے

چلے تو جیسے فسانہ، رُکے تو جیسے فسوں
یہ آدمی ہے بھلا یا کوئی پری ظالم

نہ آتے آبلہ پا گر یہاں، تو یوں کہیے
جہاں زمین ہے وہاں ایک آبلہ ہوتا

تمہاری بستی میں یوں آ پڑا ہے کوئی فقیر
زمیں پہ آن پڑے جیسے کوئی سیارہ

کسی غریب سے کہتے تو کیا، یہ شرم آئی
کہ اپنے ہاتھ میں دنیا کا انتظام نہیں

***

سانس لیتے ہیں، تو رونے کی صدا آتی ہے
ایک ہنگامہ سا رہتا تھا مکاں میں پہلے

یک بیک دل سے چھلک پڑتی تھی اک موجِ طرب
لذتِ جاں تھی عجب شورشِ جاں میں پہلے

اب تردد ہے، تامل ہے، تاسف ہے تمام
تاب تھی غم میں، تمنا تھی فغاں میں پہلے

***

دیکھا انہیں قریب سے ہم نے تو رو دیے
جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم

***

غزلیات

○

یہ مانا نت نئے فتنے، عجب رنج و محن جاگے — مگر یہ بھی تو دیکھو، چار سو کیا کیا چمن جاگے

تجھے بیٹھے رہیں کب تک، بس اب شیشے کو چھلکا دو — لہو چھلکے، نفس مہکے، خرد ناچے، بدن جاگے

خمارِ بے دلی حد سے فزوں ہے اور دل تنہا — کوئی ایسی غزل چھیڑو کہ ہر داغِ کہن جاگے

کھلو گیسوئے مشکیں سے کہ بادل جھوم کر اٹھیں — ذرا بندِ قبا کھولو کہ گل کی انجمن جاگے

کوئی ایسی بھی ساعت ہو، کوئی ایسی بھی شب آئے — کہ میری حسرتیں سو جائیں تیرا بانکپن جاگے

خمارِ آرزو اس رنگ اس انداز سے ٹوٹے — کہ تم شانے پہ سر رکھو تو بستر کی شکن جاگے

کتابِ جسم نرمی سے ورق اندر ورق دیکھیں — حجابِ شوق گرمی سے شکن اندر شکن جاگے

بدن تھک جائیں، شل ہو جائیں، آنکھیں بند ہو جائیں — گلے سے لگ کے یوں سوئیں، چمن اندر چمن جاگے

عجب عالم دکھایا ہے تری کافرادائی نے — جوانانِ خطا ابھرے، غزالانِ ختن جاگے

یہی شانِ کریمی ہے، یہی کارِ چمن بندی! — کہ جب غنچے کا دل شق ہو تو گل کا پیرہن جاگے!!

یہ وہ شے ہے، جو ہم پیتے ہیں، جم پیتا تھا، زمزم کیا — جسے پینے سے اے واعظ نہ تن جاگے نہ من جاگے

○

بہت دنوں سے بدن کی تھکن بہت ہے یہاں — اگرچہ سینہ میں، سرو و سمن بہت ہے یہاں

تبھی تو دام پہ گرتے ہیں ٹوٹ کر طائر — کہ حلقہ حلقہ، چمن در چمن بہت ہے یہاں

کمر خمیدہ ہے، لب خشک ہیں تو آنکھیں نم — کہ دوش دوش پہ بارِ محن بہت ہے یہاں

یہ اہلِ شب ہیں، اٹھو، ان کی انجمن سے چلیں — کہ ذکرِ منزلِ گور و کفن بہت ہے یہاں

نہ سرحدیں ہیں، نہ قدغن، نہ صومعہ، نہ سجود — بشر کے واسطے دل کا وطن بہت ہے یہاں

ستم کشوں کو تو مسجد ملی نہ میخانہ
ستم گروں کے لیے انجمن بہت ہے یہاں

تمام عمر برہنہ رہے تو کیا غم ہے
کہ آدمی کو لباسِ کفن بہت ہے یہاں

ملے گی خلد جنھیں، اس کے عیش وہ جانیں
ہمیں تو لذّتِ کام و دہن بہت ہے یہاں

کسی حبیب کا حرفِ غلط، غنیمت ہے
کسی حریف کا حسنِ سخن بہت ہے یہاں

کسی کی آنکھوں میں شفقت کا وہ رسیلا پن
کسی کے ہونٹوں پہ مے کا پھبن بہت ہے یہاں



آسودگی میں شدّتِ غم کیوں ہے، تم بتاؤ
چہرہ پہ آب، آنکھ میں نم کیوں ہے، تم بتاؤ

جا جا کے صحنِ گور میں سوتے ہیں کیوں نجوم
ہر شہر میں یہ شہرِ عدم کیوں ہے، تم بتاؤ

شاید یہ بتکدہ ہے جو ہر دل کے پاس ہے
ورنہ دلوں سے دور حرم کیوں ہے، تم بتاؤ

ٹپکا نہ گر مژہ سے تو آنکھوں میں جم گیا
خوں وقفِ خارِ خارِ الم کیوں ہے، تم بتاؤ

مانا کہ تیغِ تیز بھی، حق کا پیام ہے
فتحِ عرب شکستِ عجم کیوں ہے، تم بتاؤ

جو ہر میں ہر فقیر کے گردن کشی ہے کیوں
گردن میں ہر امیر کی خم کیوں ہے، تم بتاؤ

ہر دم خیالِ روزِ جزا کیوں ہے، کچھ کہو
ہر دم حسابِ دام و درم کیوں ہے، تم بتاؤ

مشرق میں دھول اڑتی ہے چہروں پہ دمبدم
مغرب میں ابر و بادِ نعم کیوں ہے، تم بتاؤ

قد جس کا سرو، آنکھ نشیلی، بدن گداز
اس کو کسی فقیر سے رم کیوں ہے، تم بتاؤ

ہاں نرم نرم، نرم نظر کیوں افق پہ ہے
ہاں گرم گرم، گرم قدم کیوں ہے، تم بتاؤ

ہاں کہنہ کہنہ طاق یہ کیوں بتکدہ میں ہیں
ہاں تازہ تازہ روئے صنم کیوں ہے، تم بتاؤ

اُس سروِ تاب دار کے تیکھے گداز میں
وہ دائرہ، یہ قوس، وہ خم کیوں ہے، تم بتاؤ

خوشبوئے گل، نہالِ بدن، آبِ نوبہار
یہ کم ہے اور وہ کم ہے، سو کم کیوں ہے، تم بتاؤ



جو بار سر پہ تھا، وہ آگہی نے کب دیکھا
جو غار سینہ میں تھا، روشنی نے کب دیکھا

کہاں تھی آگ، کہاں تھا نمک، کہاں ناسور
اُلٹ پلٹ کے زمیں کو کسی نے کب دیکھا

خفا ہوئی جو کسی موڑ پر کسی سے تو پھر
کسی کو مڑ کے بھلا زندگی نے کب دیکھا

جلا تو کیسے جلا دِل، بُجھا تو کیسے بُجھا
تری بہار کی گل تازگی نے کب دیکھا

جو فرش پر تھا گدا، اس گدا نے کیا پایا
جو عرش پر تھا غنی، اس غنی نے کب دیکھا

میں دیکھتا رہا لبِ تشنگی کو دریا میں
مرے عذاب کو دریا دلی نے کب دیکھا

وہ پیچ و تاب، وہ نغمہ، وہ حوصلوں کا خمار
جو دل میں تھا، وہ تری سادگی نے کب دیکھا

مری نمود، مرے ذوق نے کہاں پائی
مرا وجود، مری بے کسی نے کب دیکھا

ہزار شوق، سرِ دار روز چڑھتا ہے
یہ اوجِ دار یہاں، کس نبی نے کب دیکھا

وہ ریگ زار، وہ سورج، وہ لو، وہ سر، وہ سناں
عجب سماں تھا، مگر اُس شقی نے کب دیکھا

ہمارے چہرہ کو دیکھا تری نظر نے مگر
ہمارے دل کو تری ہمدمی نے کب دیکھا

نفس کا وجد ترے آئینہ میں کب اترا
لہو کا رقص تری دلبری نے کب دیکھا

میں آپ کم رہا، قامت سے اپنی، ساری عمر
کسی کی بیشی کو میری کمی نے کب دیکھا

میں خاکِ پا تھا عزیزوں کی، بے نیاز رہا
کسی کا کبر مری عاجزی نے کب دیکھا

کہا تو کیا کہا، روح الامین نے، کس سے کہا
کوئی فرشتہ یہاں آدمی نے کب دیکھا

دل یہ چاہے ہے کہ پھولوں میں مہکتے جائیں
باغ میں جائیں تو ہر گام بہکتے جائیں

اِس سراپردہ میں، ہر غم کو جگائے رکھیں
دل سے اُبھریں تو ہر اک دل میں دھڑکتے جائیں

اس کے سینہ میں رہیں جامِ سحر کی صورت
اس کی آنکھوں میں بہر رنگ دمکتے جائیں

شاخ تا شاخ سرِ شاخ چلیں موج بہ موج
برگ تا برگ سرِ برگ لہکتے جائیں

بے لحاظی سے گل و گل کے بدن کو چومیں
بے خیالی میں بہر گام چہکتے جائیں

قطرہ قطرہ دمِ باراں سے ہوا میں جھومیں
ذرّہ ذرّہ میں بیاباں کے دہکتے جائیں

لطف ہے لطف جو احباب پییں جام پہ جام
جام کی طرح مگر دل بھی کھنکتے جائیں

لذّتِ جسم سے اعصاب ہو آرامیدہ
غنچہ غنچہ ترے زانو پہ چٹکتے جائیں

ان کا ایمان مبارک ہوں انھیں نامِ خدا
شک کے پہلو سے جو ڈر ڈر کے سرکتے جائیں

خوب ہیں خوب، میسر ہے جنھیں راہِ صواب
مرد ہیں مرد، جو راہوں میں بھٹکتے جائیں

دست و دل، تاب و تواں کھو کے، یہ ہم بیٹھے ہیں
ہاتھ دنیا سے تری دھو کے، یہ ہم بیٹھے ہیں

صبح کرنی جنھیں آتی ہو، وہ ہم کو رو دیں
رات بھر رات کو رو رو کے، یہ ہم بیٹھے ہیں

پاسداری کے، محبت کے، حیا کے، غم کے
بیج اس دشت میں بو بو کے، یہ ہم بیٹھے ہیں

اب جو جاگے ہیں تو ہے مے سے سبو بھی خالی
عمر بھر نشے میں سو سو کے، یہ ہم بیٹھے ہیں

وہ اندھیرا تھا کہ گم ہو گئی ہر راہِ صواب
کن چراغوں سے خفا ہو کے، یہ ہم بیٹھے ہیں

کاش یوں ہوتا کہ دنیا میں اکیلے ہوتے
بوجھ کس کس کا یہاں ڈھو کے، یہ ہم بیٹھے ہیں

••

ساقی فاروقی



ساقی فاروقی (پ - ۲۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء)

عکسِ تحریر

غزل

وقت ابھی پیدا نہ ہوا تھا تم بھی راز میں تھے
ایک سلگتا سناٹا تھا ہم آغاز میں تھے

ان سے پیار کیا جن پر خاموشی نازل کی
ان پر ظلم کیا جو بند اپنی آواز میں تھے

ہر قیدی پر آزادی کی حد جاری کر دی
ہونٹوں کا اعجاز ہوئے جو نغمے ساز میں تھے

جنبش تھا کوئی صبح فروزاں ہونے والی تھی
شام قدم بوسی پر تھی سائے پرواز میں تھے

جس نے خون میں غسل کیا اور آگ میں رقص کیا
حیف کہ سارے ہنگامے اس کے اعزاز میں تھے

۶ ۶/۸۶ ۶

ساقی فاروقی

نام: قاضی محمد شمشاد نبی فاروقی۔ پیدائش: ۲۱ دسمبر ۱۹۳۶ء (گورکھپور)۔ تعلیم: بی۔اے (کراچی) کمپیوٹر پروگرامنگ (لندن)۔

کتابیں: پیاس کا صحرا، رادار، بہرام کی واپسی، اور بازگشت و بازیافت۔ (انگریزی میں بھی لکھتا ہوں۔ انگریزی نظموں کی کتاب لندن سے شائع ہوئی۔ آئل پینٹنگ بھی جاری ہے)۔

ابتدائی تعلیم و تربیت گورکھپور میں۔ ۱۹۴۷ء میں والدین کے ساتھ بنگلہ دیش منتقل۔ بعدازاں ۱۹۵۰ء میں خاندان کے ساتھ کراچی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن کو روانگی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد کمپیوٹر پروگرامر کی حیثیت سے وہاں ملازمت۔

میں تنہا ہوں اور تنہائی میں آپ سے مخاطب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری مجبوری دُوہری ہے۔ اظہار بھی اور رسائی بھی۔ یعنی دکھ اٹھانا اور لفظوں کو زنجیر کرنا تو لکھنے والے کا مقدر ہے مگر یہ احساس کہ جس استعارے کو جنم دینے کی کوشش میری شاعری میں ملتی ہے اس سے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی ذہن میں کوئی نہ کوئی ارتعاش پیدا ہوگا —— عجب جاں آفریں ہے۔ یہ خوش خیالی مجھے خاموش نہیں ہونے دیتی ورنہ یوں ہے کہ لفظوں پر بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے۔



میں ایک Committed Individual ہوں اور ہجوم سے میری دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ اسے افراد بناتے ہیں۔ دس ہزار مزدوروں کے مشتعل ہجوم کے معنی ہوئے دس ہزار مختلف شخصیتوں کے دس ہزار مختلف ذہنوں کا مجموعی اشتعال۔ دراصل میں ظلم سہتے ہوئے فرد کا طرفدار ہوں۔ یعنی میں اس کا آدمی ہوں جو دکھ اٹھا رہا ہے۔

اب میں خیال کی اس منزل پر ہوں جہاں دولت یا نسل کے باعث انسانوں (افراد) سے نفرت یا محبت ممکن نہیں۔ ایک حا

کسان یا ایک فوجی کمانڈر یا ایک گنوار مزدور یا ایک کروڑپتی سیٹھ میرا دوست یا ہم جلیس اس لیے نہیں بن سکتا کہ ہماری ذہنی لہریں جداجدا ہیں اور ترسیل کا امکان نہیں مگر میں اس معاشرے کے لیے جنگ کرتا رہوں گا جس میں ہم کسی نہ کسی سطح پر کہیں نہ کہیں مل سکیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ ہمیشہ سے جاری ہے، مگر تماشائی بن کر بیٹھنا اور تماشے میں شامل نہ ہونا میرے اختیار میں نہیں کہ ذہنی بیداری ایک طرح کا جبر ہے۔

یوں ہے کہ میلان طبع بائیں بازو کی طرف ہے، مگر اس لیے نہیں کہ Left is Right بلکہ اس لیے کہ اپنے تجزیے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے گفتگو عوام سے ہے۔

میں مذہبی آدمی نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں مسلماں اس لیے پیدا ہوا کہ میرے ماں باپ مسلمان تھے۔ وہ عیسائی یا ہندو یا یہودی ہوتے تو میرا پیدائشی مذہب کچھ اور ہوتا کہ یہ فیصلہ پیدا ہونے والا نہیں پیدا کرنے والے کرتے ہیں اور میں ایسے کسی فیصلے کا پابند نہیں جو میری فلاح و بہبود کے لیے ہی سہی، میری اجازت کے بغیر کیا گیا ہو۔ یہ تو ممکن نہیں کہ نومولود سے اجازت مانگی جائے مگر یہ تو ممکن ہے کہ وہ نومولود جب آپ سوچ بچار کے قابل ہو تو دوسروں کا فیصلہ بدل سکے۔ پھر خدا کا معاملہ تو بہت ذاتی معاملہ ہے، یہ ایک فرد اور "نامعلوم" کا رشتہ ہے، اور فرد اگر ذہن بھی رکھتا ہو تو اسے اس رشتے کا سراغ خود لگانا چاہیے۔ میرے دل میں مذہبی لوگوں کی قدر و منزلت غیر مذہبی لوگوں کی قدر و منزلت سے کم نہیں، مگر میں بدقسمتی یا خوش قسمتی سے خدا کی نعمت سے محروم ہوں۔ اگر میرے ذہن کے کمپیوٹر کی پروگرامنگ میں کوئی تبدیلی ہوئی تو میری آنکھیں بیدار ہوں گی۔ یا میرے دل میں کبھی کوئی ٹک ٹک سنائی دی تو میں اس آواز پر اپنے کان بند نہیں کروں گا۔



جوں جوں میری عمر گذرتی جاتی ہے۔ نباتات اور حیوانات سے میری محبت بڑھتی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کائنات پر ان کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہم انسانوں کا۔ بلکہ ہم انسانوں نے تو اس کائنات کو بدصورت بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ ان بے چاروں نے تو خوبصورتی ہی خوبصورتی بکھیری ہے۔ گائے، سور، مینڈک، کچھوا، وھیل، شارک، طوطا، مینا، ہرین، کبوتر، فاختہ، زیبرا، شیر، ہاتھی، اونٹ، گدھا، گھوڑا، لنگور، آم، جامن، کٹھل، انار، بیلا، جوہی، موتیا، گلاب اور ایسی ہی کروڑوں چیزیں ہماری توجہ چاہتی ہیں کہ یہ عشرت نظارہ ہیں اور جانِ مناظر ہیں۔ ان سے محبت کرنے کے یہ معنی نہیں کہ انسانوں سے محبت کم ہو جائے گی —— میرا تو یہ عالم ہے کہ جیسے جیسے محبت بڑھتی جاتی ہے دل میں کشادگی آتی جاتی ہے۔ محبت کا دائرہ محدود ہو تو دل محدود ہو جاتا ہے۔ میں نے کچھوے کا ایک بچہ پال رکھا ہے۔ جب اس سے گفتگو کرتا ہوں تو اس کی زندہ اور دور رس آنکھوں میں ایک عجب تحریر ابھرتی ہے تو یہ کائنات کیا خوبصورت

جگہ ہے، مگر افسوس کہ یہاں انسان بہت ہیں —— ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو اپنے دوسرے "ہمعصروں" کی نظروں سے بھی دیکھنے کی کوشش کرتے رہا کریں۔ اس میں شاید ہمارا ہی بھلا ہو۔

انتخابِ کلام:-

(ہر غزل سے ایک شعر)

وہ مری روح کی الجھن کا سبب جانتا ہے —— جسم کی پیاس بجھانے پہ بھی راضی نکلا

تیری پرچھائیں ہوں نادان، جدائی کیسی —— میری آنکھوں میں پھر اخوف کا سایہ کیسا

میں وہی دشت ہمیشہ کا ترسنے والا —— تو، مگر کون سا بادل ہے برسنے والا

تجھے لبوں پہ ہے بوسوں کی راکھ بکھری ہوئی —— میں اس بہار میں یہ راکھ بھی اڑا دوں گا

وہ منتقم ہوں کہ شعلوں کا کھیل کھیلتا ہوں —— مری کمینگی دیتی ہے داستان مجھے

اس طرح اس نے چھوڑ دیا دشتِ ہجر میں —— جیسے خدا کا بوجھ مری جان پر نہ ہو

اب گھر بھی نہیں، گھر کی تمنّا بھی نہیں ہے —— مدّت ہوئی سوچا تھا کہ گھر جائیں گے اک دن

جن میں ابھی اک وحشی آگ کے سائے ہیں —— وہ آنکھیں ہو جائیں گی صحرا اک دن

زنداں بھی نہیں لیکن ہم اہلِ محبّت نے —— جس سمت نظر ڈالی، دیوار نظر آئی

اک رات ہم ایسے ملیں جب دھیان میں سائے نہ ہوں —— جسموں کی رسم و راہ میں روحوں کے سنّاٹے نہ ہوں

جو تیرے دل میں ہے وہ بات میرے دھیان میں ہے —— تری شکست تری لکنتِ زبان میں ہے

مجھے خبر تھی، مرا انتظار گھر میں رہا —— یہ حادثہ تھا کہ میں عمر بھر سفر میں رہا

ہم کب سے لپکتے ہوئے شعلوں میں کھڑے ہیں —— اس آگ میں اک گُل کی ہوا لے گئی ہم کو

حادثہ ہے کہ ستاروں سے مجھے وحشت ہے —— مجھ کو اس دشت کے آداب سکھا دو کوئی

ناموں کا اک ہجوم سہی میرے آس پاس —— دِل سُن کے ایک نام دھڑکتا ضرور ہے

مجھے خبر ہے کہ اک مُشتِ خاک ہوں پھر بھی —— تو کیا سمجھ کے ہوا میں اُڑا رہا ہے مجھے

میرے اندر بیٹھا کوئی میری ہنسی اُڑائے
ایک پلک کو اندر جاؤں باہر بھاگا آؤں

یہ کون رقص میں ہے یہ منظر کہاں چلے
دریا چلے، پہاڑ چلے، آسماں چلے

جو میرے اشک تھے، برگِ خزاں کی طرح گرے
برس کے کھل گیا ابرِ بہار میں بھی تھا

میں نے اُٹھ کر عجب تماشا دیکھا آدھی رات کو
روح کو اندھی روح بلائے بات پکارے بات کو

حد بندیِ خزاں سے حصارِ بہار تک
جاں رقص کر سکے تو کوئی فاصلہ نہیں

حادثہ یہ ہے کہ ہم جاں نہ معطر کر پائے
وہ تو خوشبو تھا اُسے یوں بھی بکھر جانا تھا

شاخ سے ٹوٹ کے بے حرمت ہیں ویسے بھی حرمت تھے
ہم گرتے پتوں پہ ملامت کب موسم موسم نہ ہوئی

مجھ کو مری شکست کی دُہری سزا ملی
تجھ سے بچھڑ کے زندگی دنیا سے جا ملی

سوچ میں ڈوبا ہوا ہوں عکس اپنا دیکھ کر
جی لرز اُٹھا تری آنکھوں میں صحرا دیکھ کر

شہروں شہروں گھوم رہا ہوں شہروں میں سناٹا ہے
ہنگاموں کی بات الگ ہے ورنہ آدمی تنہا ہے

جینے کا حوصلہ ہو تو زنداں کی ساری عمر
مقتل کی ایک صبح پہ قربان کیجیے

بیکار اُس کے واسطے آنکھیں ہوئیں تباہ
یہ لوگ آنسوؤں سے گرفتار کب ہوئے

اس نے نظر انداز کیا مجھ کو سرِ بزم
اس میں کوئی تحقیر کا پہلو بھی نہیں ہے

میں پیاس کا صحرا ہوں ترسنے کے لیے ہوں
تُو کالی گھٹا ہے، تو برس کیوں نہیں جاتی

خواب دیکھا تھا ہم ہوں گے بکھرنے والے
منہدم ہو گئے پر خواب نہ ٹوٹا اپنا

ایک دوزخ تھا میرے سینے میں
جس سے چہرا مرا منور تھا

وہ سحر گو رکن ہے، بدن بدحواس ہیں
ہو پتلیوں میں جان تو مردہ جلائے

تیرے بدن کی آگ سے آنکھوں میں ہے دھنک
اپنے لہو سے رنگ یہ پیدا نہیں ہوئے

دنیا پہ اپنے علم کی پرچھائیاں نہ ڈال
اے روشنی فروش اندھیرا نہ کر ابھی

میرے اندر اُسے کھونے کی تمنا کیوں ہے
جس کے ملنے سے مری ذات کو اظہار ملے

راستہ دے کہ محبت میں بدن شامل ہے
میں فقط روح نہیں ہوں، مجھے ہلکا نہ سمجھ

ہم تنگ نائے ہجر سے باہر نہیں گئے
تجھ سے بچھڑ کے زندہ رہے مر نہیں گئے

ہر نئے درد کی پوشاک پہن لی میں نے
جاں مہذب نہ ہوئی میں تھا برہنہ ایسا

یہ مہتاب موجیں اُٹھیں گی وہ طوفان آئے گا اک دن
مجھے چاند کھینچے گا اک دن کہ مجھ میں سمندر چھپا ہے

میں اتنا محتاج نہیں ہوں تو اتنا مایوس نہ ہو
آج برہنہ چشم نہیں — اشکوں کی چادر لایا ہوں

اس اپنے سے یہ بنتی ہوئی دیوار نہ دیکھ
دیکھ اس میں کوئی کھلتا ہوا دروانہ ہے

مجھ میں سات سمندر شور مچاتے ہیں
ایک خیال نے دہشت پھیلا رکھی ہے

دن بہار ہوں تیرے اے قرار ہوں میرے
قربتوں بھرے سارے فاصلے بہم کر دے

سفر میں رکھ مجھے میری جدائیوں سے پرے
فراق دے ابھی خاکِ وصال میں نہ ملا

لہر کے قریب میری پیاس پڑی تھی
ابر کوئی شام کے دیار میں نہ تھا

جو راکھ بن کے ہواؤں میں اڑتا پھرتا ہوں
مرا قصور کہ میں شعلے جمع کرتا تھا

ایک ہی مرکزِ دیوار نگاہوں میں رہے
دیکھتے دیکھتے چہرا کوئی پیدا ہوگا

رات اپنے خواب کی قیمت کا اندازہ ہوا
یہ ستارہ نیند کی تہذیب سے پیدا ہوا

اپنے اندر کی گرتی دیواروں پر
اتنی دھوپ اتار کہ سایہ ناز کرے

میرے اندر کسی افسوس کی تاریکی ہے
اس اندھیرے میں کوئی آگ جلا کر جائے

وہ اختیار ملے اب کہ اختیار چلے
یہ کیا ملال کے بازار سے گزار دیا

لوگ ہیں اور سوگ میں خوف ہزار دشت ہے
موت کی بازگشت ہے خاک یہاں صدا لگائیں

وہ رقص خوں ہے کہ آنکھوں میں پھول کھلتے ہیں
ترے خیال میں رحمت شراب جیسی ہے

ایک مختار ستارے نے بتایا ہے مجھے
صبح تک اور ہے یہ سوگ پرانا میرا

وہ آنکھ اُٹھے گی تو یہ دل بھی کروٹیں لے گا
یہ آفتاب ابھی عرصۂ عذاب میں ہے

ہماری شکستوں کا بن بھی تو ہے
خدا آدمی کی تھکن بھی تو ہے

مرے لہو میں جدائی کی لہر اُٹھی تھی
وہ منتقم ہوں کہ یہ بات اُسے بتادی ہے

اپنی آنکھوں میں کاڑھوں اپنے شعلوں کے رنگ
جس میں جل جل راکھ بنا وہ آگ رہا نہ کروں

فاصلے کا سحر بے ثبات ہے
قربتوں سے دوریاں چلی گئیں

حرف آگ بیچتا ہوں جس طرح سے جیتا ہوں
اُس طرح سے جینے میں الجھنیں بہت سی ہیں

آج روح اور دل ایک ظلم سے خجل
یار آدمی سے مِل سرحدیں اتار کر

دھنک جلی تھی فضاؤں سے منوّر تھی
مرے مزاج کا اک رنگ آسمان میں تھا

مِری سَحر سے گزر روشنی گزیدہ ہوں
مجھے چراغ کی تاریخ سے اُدھر لے جا

سب رنگ پریشان ہوئے تیرے سبب سے
تو، کون ہے اب سحرِ مصوّر سے نکل آ

یہ ظلم ہے، خیال سے اوجھل نہ کر اُسے
جو حاصلِ سفر ہے مُعطّل نہ کر اُسے

دنیا قدم کے ساتھ ہے منزل نہ کر اسے
دل کا قرار بیچ کر حاصل نہ کر لے

تو اپنی آن میں ہے تو ہم اپنی آن میں
اور فاصلے مزاج کی قربت سے آ گئے ہیں

تو ماہِ پس ابر کے مانند ہے مجھ میں
مستور بھی رہ اور دکھائی بھی مجھے دے

میں ایک لمحہ مغرور ہوں، دوام نہیں
بہت دنوں سے مِرا وقت میں قیام نہیں

میں ایک قلزمِ بیتاب اپنی لہروں میں
اسیر ہوں، کسی مہتاب کا اشارہ ملے

مجھے حجاب نہیں بوسہ، جدائی سے
مگر لبوں کے پیالے میں پیاس بھر کے نہ جا

انکار نہ کر چراغ ہو جا
اب روشنی اختیار کر لے

دیکھ دنیا کی طرف اور محبت سے نہ دیکھ
رُوح پر داغ اگر حسنِ طلب سے آئے

میں زمینوں سے بہت دور نکل آیا ہوں
حرفِ ویرانۂ مہتاب نظر آتا ہے

آج ہم اُداس ہیں اے نظر شناس آ
اور اِس طرح سے پاس آ کہ فاصلہ رہے

ہمیں ملال رہے گا کہ ابتدا کی للک
تعلقات کے اُس آخری برس میں نہ تھی

نظر خراب ہوئی موت کے تماشے سے
اسے زمانہ نظارۂ حیات بھی دے

ملی ہے تمکنت شعلۂ خیال تجھے
ہوا سہار سکے تو چراغ راہ میں رکھ

بدن اُتار کے مت چل کہ روح بھیگ چلی
ہوائے موسمِ باراں ہے بے لباس نہ رہ

مٹی سے ہوا منسوب مگر آتش خانہ سا جلتا ہوں
کئی سورج مجھ میں ڈوب گئے مِرا سایہ کم کرنے کیلئے

میں جس خوف میں تھا اس میں کچھ اور بھی قیدی تھے
میں جس خواب میں تھا اُس میں دروازہ کوئی نہ تھا

وقت ابھی پیدا نہ ہوا تھا تم بھی راز میں تھے
ایک سِسکتا سنّاٹا تھا ہم آغاز میں تھے

ایک اکیلے ریگ زار میں گرد باد کا رقص
میرا حال تیری دنیا سے باہر ایسا تھا

غزلیات

○

مگر میانہ روی آنسوؤں کے بس میں نہ تھی
یہ کائنات محبت کی دسترس میں نہ تھی

انا کی آگ میں دو سرد مہر جلتے تھے
کسی امید کی لَو شعلۂ نفس میں نہ تھی

دلوں میں پیچ عجب تھے کہ خواہشِ تجدید
مرے لہو میں تری چشمِ خواب ریں میں نہ تھی

ہم اجنبی کی طرح ایک دوسرے میں بچے
رہِ فرار کوئی، خوف کے قفس میں نہ تھی

ہمیں ملال رہے گا کہ ابتدا کی للک
تعلقات کے اُس آخری برس میں نہ تھی

○

میں تیرے ظلم دِکھاتا ہوں اپنا ماتم کرنے کے لیے
مِری آنکھوں میں آنسو آئے، تری آنکھیں نم کرنے کیلئے

مٹی سے ہوا منسوب مگر آتش خانہ سا جلتا ہوں
کئی سورج مجھ میں ڈوب گئے، مِرا سایہ کم کرنے کیلئے

وہ یاد کے ساحل پر سارے موتی بکھرائے بیٹھی تھی
اک لہر لہو میں اٹھی تھی مجھے تازہ دم کرنے کیلئے

آج اپنے زہر سے کاٹ دیا سب زنگ پرانے لفظوں کا
آئندہ کے اندیشوں کی تاریخ رقم کرنے کیلئے

ممکن ہے کہ اب بھی ہونٹوں پر کوئی بھولا بسرا شعلہ ہو
میں جلتے جلتے راکھ ہوا لہجہ مدھم کرنے کیلئے

○

لوگ تھے جن کی آنکھوں میں اندیشہ کوئی نہ تھا
میں جس شہر سے گزرا اس میں زندہ کوئی نہ تھا

چیزوں کے انبار لگے تھے خلق آرام سے تھی
اور مجھے یہ رنج وہاں افسردہ کوئی نہ تھا

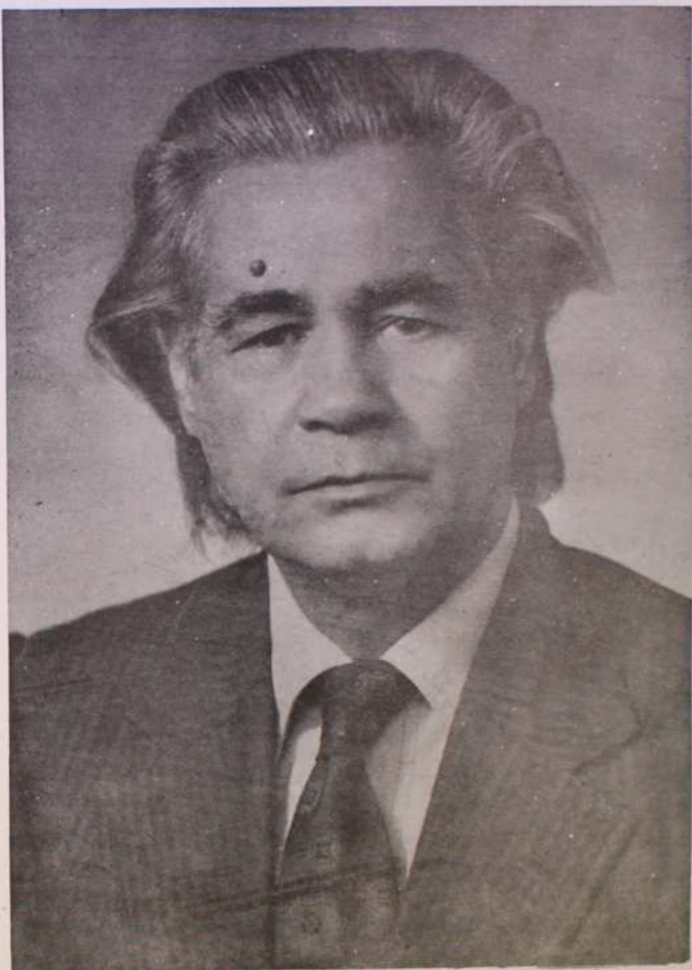
حیرانی میں ہوں آخر کس کی پرچھائیں ہوں
وہ بھی دھیان میں آیا جس کا سایہ کوئی نہ تھا

چونک پڑا جب یادوں میں اُس کی آواز سنی
بس اپنی ہی گونج تھی مجھ میں ورنہ کوئی نہ تھا

میں جس خوف میں تھا اُس میں کچھ اور بھی قیدی تھے
میں جس خواب میں تھا اُس میں دروازہ کوئی نہ تھا

●●

سردار جعفری



Kinsey
New Delhi

سردار جعفری

پ ۱۹۱۳ء

عکسِ تحریر

پیراہنِ شرر

کہاں ہے کوئی کہ پیراہنِ شرر پہنے
بدن پہ حجر تو باطن سے خون جاری ہے
زباں پہ گریۂ فرہاد و قیس ختم ہوئے
یہ کس کا اہلِ جہاں کو حکمِ سنگ باری ہے
یہاں تو کوئی بھی شیریں ادا نگار نہیں
یہاں تو کوئی بھی لیلیٰ بدن بہار نہیں
یہ کس کے نام پہ زخموں کی لالہ کاری ہے

کوئی تو دیوانہ پہ لکھتا ہے [illegible]
فریب دے کے کرے [illegible]
بپا ہے تماشا کہ سزا اس کو سنگ باری ہے

[illegible]

سردار جعفری

تاریخ پیدائش، ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء ... پہلے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، پھر دہلی یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ ۱۹۳۹ء میں، انگریزی ادبیات میں ایم۔اے کی خاطر لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم۔اے کے آخری سال میں جنگ مخالف نظم لکھنے کی وجہ سے گرفتاری۔ لکھنؤ اور پھر بنارس جیل میں۔ رہائی کے بعد بھی اپنی جائے پیدائش بلرامپور میں نظر بند۔ اس طرح طالب علمی کے زمانے سے ہی کانگریس اور کمیونسٹ تحریکوں سے رابطہ۔

ابتک نثر میں چار اور نظم میں نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آج کل نثر میں اپنی یادیں لکھنے میں مصروف ——— اس کے علاوہ ایک طویل منظوم خود نوشت "نومبر میرا گہوارہ" چل رہی ہے جو ذاتی یادوں کے علاوہ خاص طور پر نومبر میں ہوئے تاریخی واقعات پر مشتمل ہوگی • سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور فیض کے ساتھ ہم (سردار) بھی ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں • مجاز اور سبط حسن کے ساتھ "نیا ادب" کی داغ بیل اور معاون مدیر کی حیثیت سے اس کی ادارت میں شرکت • ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کے اردو ہفت روزہ "قومی جنگ" کے ادارتی بورڈ میں • ادبی رسالہ "گفتگو" کی اشاعت • ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۳ء تک ہندستانی کمیونسٹ پارٹی

کے انگریزی رسالہ "انڈین لٹریچر" کی ادارت ● "روشنی اور آواز" چار پروگراموں کی ترتیب۔
(۱) لال قلعہ (دہلی) (۲) شالیمار باغ (کشمیر)
(۳) مہاتما گاندھی کا سابرمتی آشرم (۴) جواہر لال نہرو کا تین مورتی بھون
● خواجہ احمد عباس کے ساتھ مل کر دو دستاویزی فلمیں بنائیں۔ "ڈاکٹر محمد اقبال" اور "ہندستان ہمارا" (پانچ ہزار سال کی مشترکہ تہذیبی میراث) ● اعزازات اور انعامات: کتاب "ایک خواب اور" پر سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ۔ ۱۹۶۵ء — صدر جمہوریہ ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن کی طرف سے پدم شری کا اعزاز ۱۹۶۷ء — جواہر لال نہرو فیلوشپ ۱۹۶۸ء۔ ۱۹۶۹ء — اردو شاعری میں نمایاں خدمات کے لیے نہرو کلچرل ایسوسی ایشن کی طرف سے سجاد ظہیر ایوارڈ۔ ۱۹۷۴ء — کتاب "اقبال شناسی" پر اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۷۷ء — کتاب "لہو پکارتا ہے" پر اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۷۹ء — اردو شاعری نیز ادبی خدمات کے لیے آندھرا پردیش اردو اکادمی، حیدرآباد کی طرف سے مخدوم ایوارڈ۔ ۱۹۸۰ء — شاعری اور ادبی خدمات کے لیے مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال کی طرف سے میر تقی میر ایوارڈ۔ ۱۹۸۲ء — طویل رزمیہ "ایشیا جاگ اٹھا" پر بلیالم لنگویج ترپوندرم کی طرف سے کمار آشان ایوارڈ۔ ۱۹۸۳ء — سوویت سوسائٹی آف فرینڈشپ کی طرف سے فرینڈشپ میڈل۔ ۱۹۸۴ء بمبئی یونیورسٹی کے سینیٹ ممبر (دوبار) ریڈیو اور ٹیلیویژن کے براڈکاسٹرس ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء تک کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کے چیرمین۔ کل ہند اقبال صدی تقریبات کمیٹی کے جنرل سکریٹری۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے ممبر۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء سے دسمبر ۱۹۸۳ء تک جموں یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر۔ شاعری کے لیے حکومت مدھیہ پردیش کا ایوارڈ اقبال سمان ۱۹۸۵ء علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈی لٹ D. LIT. اعزازی ڈگری ۱۹۸۶ء۔ ہندستانی بک ٹرسٹ کے سابق ایڈیٹر۔ ہندی اور اردو کے چار عظیم شعراء غالب، میر، کبیر اور میرابائی کا تعارف مع فرہنگ اور کلام، دونوں زبانوں میں۔ امریکہ، کناڈا، انگلینڈ، بلغاریہ، چیکوسلوالیہ، روس، مصر، چین، عراق اور پاکستان کے ادبی اور ثقافتی سفر۔

دوسری زبانوں، مثلاً روسی، تاجیک، انگریزی اور فارسی میں نظموں کا ترجمہ۔ تاشقند اور بمبئی یونیورسٹیوں میں ہم پر پی۔ ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام۔

● انگریزی مطبوعات: غالب اور اس کی شاعری ۱۹۶۹ء (قرۃ العین حیدر کے اشتراک سے)

مطبوعہ کتابوں کی فہرست

• نئی دنیا کو سلام - طویل تمثیلی نظم - (دوسرے ایڈیشن میں مرزا جعفر علی خاں اثر کا دیباچہ) نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی سے اس کا ترجمہ ہندستان کی سات زبانوں میں چھپ چکا ہے - پانچ اور زبانوں میں ہوگا • خون کی لکیر (نظمیں) اس میں پہلی کتاب پرواز کا انتخاب شامل ہے • ایشیا جاگ اٹھا (طویل رزمیہ نظم) • امن کا ستارہ (طویل آزاد نظم) روسی اور انگریزی کے علاوہ ہندستان کی بارہ زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے • پتھر کی دیوار (نظمیں) منتخب نظمیں روسی ازبک اور انگریزی میں ترجمہ • ایک خواب اور (نظمیں) منتخب نظموں کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں اب مکمل کتاب روسی زبان میں شائع ہونے والی ہے - ہندستان اور پاکستان میں اب تک سات ایڈیشن - • پیراہن شرر (نظمیں) آنند نرائن ملا کے دیباچے کے ساتھ • لہو پکارتا ہے (نظمیں) • ترقی پسند ادب (تحریک کا جائزہ) ہندستان میں دو بار پاکستان میں کئی جعلی ایڈیشن نیا ایڈیشن حواشی کے ساتھ زیر طبع - • لکھنؤ کی پانچ راتیں (ذاتی یادیں) مکتبہ جامعہ نیا زم جلد کا ایڈیشن آرہا ہے لکھنؤ سے نیا ایڈیشن گذشتہ سال شائع ہوا - پاکستان میں الگ شائع ہوئی • پیغمبرانِ سخن (کبیر، میر اور غالب پر مضامین) پاکستان میں بیک وقت دو ایڈیشن • اقبال شناسی - ہندستان اور پاکستان میں الگ الگ ایڈیشن -



لکھنؤ سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور شمال میں ہمالیہ کی ترائی کا دامن جہاں سے پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ پندرہ بیس ہزار کی آبادی کا ایک چھوٹا سا قصبہ بلرام پور تعلقہ داری کو ریاست کہتے ہیں۔

اس کے چاروں طرف کئی مکانات ہیں ہر مکان میں ایک گھرانہ آباد تھا انہی میں ایک میرا گھر بھی تھا۔ بڑے سے وسیع صحن وسیع دلان، اور کوٹھے کی دو کھلی ہوئی چھتوں کا گھر اس کی پورب کی دیوار کی طرف سے ایک مندر کا خوبصورت کلس اور شیشم کا ایک بلند قامت دذت نیلے رجھانکتا تھا اور پیڑ کے پیچھے سے صبح کا سورج اور چودھویں کا چاند نکلتا تھا گرمیوں کی راتوں میں جب پلنگ بچھ جاتے تھے تو یہ آنگن چھوٹا معلوم ہوتا تھا اور جاڑوں کی راتوں میں اتنا لمبا کہ اکثر دوڑ کر اس آنگن سے گزرا کرتا تھا اسی آنگن میں میں نے پہلی بار اپنی رگوں میں جوانی کا خون محسوس کیا گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہر میں دیوار کے سائے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کا پسینے سے بھیگا ہوا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اس سے زیادہ حسین چیز نہیں دیکھی ہے۔ وہ چہرہ آج نظروں سے اوجھل ہو کر اور زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔

یہاں ہمارے چھوٹے سے گھر کے سوا اپنا اور کچھ نہیں تھا ہر چیز ریاست کی تھی جو میرے والد اور چچا کو ملازمت کے سلسلے میں استعمال کے لیے ملی تھی میرے چچا بڑے عہدے پر تھے اور میرے والد چھوٹے عہدے پر لیکن رعب پورے خاندان کا تھا۔ چچا سید صاحب کہلاتے تھے اور والد بڑے بھیا کے نام سے مشہور تھے۔ میری ماں کو سارا قصبہ بڑی بہو کہتا تھا۔

خاندان میں بڑا اطمینان تھا بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی یہیں بچے پیدا ہوتے تھے بلرام پور کے اسکول کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہو جاتی تھی۔

یہ بڑا ایمان دار مذہب کا پابند اور پرہیزگار خاندان تھا اسی لیے مجھے چھوٹی عمر میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا کہ مولوی بن جاؤں گا تو خاندان کی عاقبت سدھر جائے گی لیکن طبیعت کی آزادہ روی نے اس سعادت سے محروم کر دیا اور میں لکھنؤ سے تین بار بھاگا۔ میرے والد اور چچا نے کبھی رشوت نہیں لی۔ اور دولت مندی کی شہرت کے باوجود

صبر وقناعت کے ساتھ زندگی گذار دی۔ میری ماں کے سارے زیور بِک گئے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ گھر میں افلاس ہے وہ بڑے خلوص سے محنت کرتے تھے اور ہر موقع پر نمک حلال ہونے کا ثبوت دیتے۔ دسہرے کے موقع پر جو ریاست میں بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا نگین صلفے باندھ کر جلوس کے ہاتھیوں پر بیٹھتے تھے اور مہاراج اور مہارانی کو نذر دینے جاتے تھے عیدِ بقرعید ۱۲ رجب اور عید غدیر بڑی شان سے مناتے تھے اور دیوالی پر ریاست کے دیے ہوئے تیل کے دیوں سے گھروں کی دیواریں سجاتے تھے ریاست کے کام کے علاوہ ہمارے خاندان کو اخراجات کے لیے جو گاؤں ٹھیکے پر ملے تھے ان کا انتظام کرتے تھے۔ اپنے انتقال سے کچھ پہلے جب میرے والد بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں تھے تو ان کی چارپائی محرم کی مجلسوں کے لیے عزاخانے میں لاکر رکھ دی جاتی تھی اور لیٹے لیٹے مجلس سنتے تھے۔

سال کے اور مہینوں میں بھی مجلسیں اور محفلیں ہوتی تھیں جن کی بدولت میں نے اس عہد کے تمام بڑے ذاکروں کو سنا ہے اور تمام بڑے علمار اور مجتہدین کے ہاتھوں کو بوسے دیے ہیں۔

شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دیے تھے اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے ان کی زبان تشبیہ استعارے ترتیب ہر چیز انیس کی تھی میرا اپنا کچھ نہیں تھا میں ساٹھ ساٹھ ستر ستر بند لکھ جاتا تھا لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا ویسے مجلس میں پڑھنے کے لیے یہ بند کافی تھے۔ جب میں نے پہلا مرثیہ کہا تھا ؎

آتا ہے کون شمعِ امامت لیے ہوئے ـ اپنے جلو میں فوجِ صداقت لیے ہوئے
اللہ رے حسن فاطمہ کے ماہتاب کا ـ ذروں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

اور اسے منبر پر بیٹھ کر پڑھا تو والد اور چچا نے بہت گلے لگایا اور ماں نے سر پر ہاتھ رکھ دعائیں دیں۔ میرے چچا بار بار مرثیے کے آخری دو مصرعوں کو پڑھتے تھے اور روتے تھے۔

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی ـ اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

اس کامیابی سے ہمت بہت بندھی اور میں نے پندرہ بیس دن میں ایک مرثیہ اور کہہ لیا وہ اس طرح شروع ہوتا تھا ؎

آتا ہے ابن فاتح خیبر جلال میں ـ ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں
اک تہلکہ ہے وادی و دشت و جبال میں ـ بھاگا ہے آفتاب بھی برج زوال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمین درد و کرب سے ـ ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

مجھے اب تک یاد ہے کہ آخری مصرعے کے قافیے کی بہت داد ملی لیکن کچھ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ میں کسی سے لکھوا کر

پڑھ دیتا ہوں یہ بات مجھے اتنی ناگوار ہوئی کہ میں نے نیا مرثیہ ان مصرعوں سے شروع کیا۔

اے بلبل ریاضِ بیاں نغمہ بار ہو　　اے نو عروسِ طبع جواں ہم کنار ہو
اے خامۂ شگفتہ زباں لالہ کار ہو　　اے حاسدِ دریدہ دہاں شرمسار ہو
کیا اس میں مجھ سے ہیچمداں کا قصور ہے　　یہ تو عطائے رحمتِ ربِ غفور ہے

اس میں میں نے یہ بھی لکھا تھا ع　اک خوشہ چین ہوں باغِ جناب انیس کا

پھر ایک اور مرثیہ کہا جس کے صرف دو مصرعے یاد رہ گئے ہیں ؎

عرش تک اوس کے قطروں کی چمک جانے لگی　　چلی ٹھنڈی جو ہوا تاروں کو نیند آنے لگی

یہ مرثیے اب تک بلرام پور میں محفوظ ہیں اور محرم کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں کربلا کے قافلے میں مجھے امام حسین کے بعد سب سے زیادہ عقیدت حضرت عباس اور حضرت زینب سے تھی اور انیس کے مرثیوں نے اس عقیدت پر جلا کر دی تھی۔

میرے والد کے پاس مذہبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا قرآن بچپن میں بہار کے ایک مولوی صاحب سے پڑھا وہ دن میں بیدوں سے مارتے تھے اور رات میں پیغمبروں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے والد کی کتابوں سے میں نے تمام پیغمبروں اور چودہ معصومین کے حالات پڑھ لیے تھے اور چونکہ میں اس عمر میں مرثیہ خوانی کے علاوہ حدیث خوانی بھی کرنے لگا تھا اس لیے حالات اور قرآن کی بہت سی آیتیں زبانی یاد تھیں۔ اور ان سب کا مجموعی اثر مجھ پر یہ تھا کہ حق اور صداقت کے لیے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے میں نے حق و صداقت کو ہمیشہ زمین کی چیز سمجھا نمرود و خلیل کی داستان سے لے کر شہادت حسین تک کے واقعات نے میرے خون میں حرارت پیدا کر دی تھی اور میں اقبال کے یہ اشعار لہک لہک کر پڑھا کرتا تھا۔

آں امام عاشقاں پور بتول　　سرو آزادے ز بستان رسول
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر　　معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر
دشمناں چون ریگِ صحرا لاتعد　　دوستان بالفظ یزداں ہم عدد
رمز قرآن از حسین آموختیم　　ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم
این دو قوت از حیات آمد پدید　　موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز　　تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

اس زمانے میں چند سوالات نے مجھے بےچین کیا۔ اور چند واقعات نے میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب برپا کردیا۔ مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ یہ دنیا کیوں آئی ہے کہاں سے آئی ہے لیکن اس سوال نے ہمیشہ بےچین رکھا کہ یہ دنیا ایسی کیوں ہے۔ اور اس کی ابتدا میرے بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔

میں نے ایشیائی افلاس کے بدترین نمونے دیکھے ہیں ریاست کے گاؤں میں پہلے اور اپنے گاؤں میں بعد کو مجھے شکار اور گھوڑے کی سواری کا بےحد شوق تھا اور میں بندوق لیے گاؤں گاؤں اور جنگل جنگل مارا مارا پھرتا تھا اور ریاست کی تحصیلوں اور ذیل داریوں میں ٹھہرتا تھا۔ اور اس طرح اودھ کے دیہات کی زندگی سے آشنا ہوا یہ خوبصورت گیتوں، دھان اور گیہوں کے کھیتوں اور انتہائی افلاس کی سرزمین ہے اس میں اتنی پگڈنڈیاں نہیں ہوں گی جتنے خون کے دھارے اس کے جسم میں جذب ہو چکے ہیں میری یاد میں اس کی انتہائی بھیانک تصویریں محفوظ ہیں گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جھکے ہوئے کسان جن کی پیٹھوں پر اینٹیں لدی ہوئی ہیں ان کے جوتے مارے جارہے ہیں۔ اور وہ دہائیاں دے رہے ہیں۔ پیڑوں کی شاخوں میں بالوں سے لٹکی ہوئی عورتیں پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹانگوں اور باہر نکلی ہوئی پیٹوں کے بچے بڑی بڑی سیاہ مگر بجھی ہوئی آنکھیں ـــــ ایک بار میرے سامنے ایک کسان عورت ننگی کردی گئی یہ اور اس قسم کی بےشمار تصویریں ہیں جو اگر کوئی مصور پردے پر بنادے تو دنیا چیخ اٹھے ان دیہاتوں میں جاکر مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ لاکھوں آدمی ۲۴ گھنٹے میں صرف ایک بار کھانا کھاتے ہیں۔

مجھے سن یاد نہیں ہے لیکن ایک مرتبہ یہ ہوا کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے بغاوت کردی ریاست کی فوج نے جواب میں سارے گاؤں کو آگ لگادی اور کسان عورتوں کو بےعزت کیا اس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور اخباروں میں خبریں چھپیں اور کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اس معاملہ کی تحقیقات کرنے آئے ریاست کے عملے نے انکو گاؤں تک جانے سے روک دیا اور راستے کی کچی سڑک پر جابجا گڑھے کھود دیے گئے تاکہ پنڈت نہرو کی کار وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

غالباً عید غدیر کا دن تھا یا یوں ہی ہمارے گھر میں کوئی محفل تھی میں اس محفل میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے اس عام جلسے میں چلا گیا جہاں پنڈت نہرو نے جاگیرداری ظلم و استبداد کے خلاف تقریر کی جلسے کے بعد میں واپس آیا تو گھر کے لوگ مجھ سے خفا تھے اور میں ساری کائنات سے بیزار۔ افلاس کے سماجی اسباب کے پہلے علم نے میرے دل میں چراغ جلائے تھے

اسی زمانے میں میں نے دو نہایت اہم کتابیں پڑھیں جنہوں نے میری زندگی پلٹ کر رکھ دی ایک مہاتما گاندھی کی کتاب "تلاش حق" اور دوسری پلوٹارک کی کتاب "مشاہیر یونان و روما" گاندھی جی کی کتاب میں پوری طرح نہ سمجھ سکا اس لیے کہ وہ انگریزی میں تھی اور میری انگریزی کی استعداد اتنی نہیں تھی۔ کتاب میرے چچا کی تھی جنہوں نے

خود اسے بڑے شوق سے پڑھا تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان سے ان کے مطالب دریافت کروں خود ہی اس کی سیاہ چھپی ہوئی سطروں میں نور اور روشنی کی جستجو کرتا رہتا۔ پلوٹارک کی کتاب انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد نے چھاپی تھی اور غالباً اس کا اُردو ترجمہ ہاشمی فرید آبادی نے کیا تھا اس کا اثر زیادہ گہرا پڑا کیوں کہ میں اسے آسانی سے سمجھ سکتا تھا خاص طور سے لے کرگس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کی کون سی ادا مجھے بھائی تھی۔

لیکن ان کتابوں نے میرے سوالات حل کرنے کے بجائے میرے دل میں اور آگ لگا دی اس آگ کو کون بجھائے نہ گھر میں کوئی میرا جواب دینے والا ہے اور نہ اسکول میں نہ کتابیں نہ رسالے نہ اخبار میرے والد اور چچا مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اس لیے ان کو میرے سوالات دیوانگی معلوم ہوتے تھے انکی شفقت میرے دل کی آگ نہیں بجھا سکی۔ ایک واقعے نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا ایک اور گاؤں میں بغاوت ہو گئی کسانوں نے ریاست کے تحصیلدار کو جان سے مار دیا۔ میرے بہنوئی جو ذیلدار تھے بہ مشکل اپنی جان بچا کر بھاگ آئے سب کی ہمدردیاں میرے بہنوئی اور مرے ہوئے تحصیلدار کے ساتھ تھیں میری ہمدردیاں کسانوں کے ساتھ۔

اب مجھے ہر اس چیز سے نفرت ہو گئی جس سے امارت کی ذراسی بھی بو آتی ہو۔ میرا ردعمل صرف جذباتی تھا اور عقل کو جذبات کی تنظیم کا راستہ نہیں مل رہا تھا اس عالم میں میں نے ایک نظم کہی کہ خدا نہ تو غرناطہ و بغداد کے ایوانوں میں ہے نہ امیروں کے محلوں میں خدا جَو کی روٹی میں ہے پیوند کی چادر میں ہے اور کربلا میں چمکنے والی حسین ابن علی کی تلوار میں اب اس کا ایک مصرعہ بھی یاد نہیں ہے لیکن یہ نظم میں نے کئی مجلسوں میں پڑھی اور اس کی داد بھی ملی، اور تو کسی نے اس نظم کو نہیں سمجھا لیکن والد اور چچا کو ملنے والے ایک گورنمنٹ کے تحصیلدار النجا حسین صاحب تھے وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے ان کے کان کھڑے ہو گئے انھوں نے نظم کی تعریف کی اور پھر مجھ سے پوچھا "تم خدا کو مانتے ہو" وہ مجھے اسی طرف لے جانا چاہتے تھے کہ امیر و غریب سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں لیکن گفتگو میں بات یہاں پہنچی کہ میں نے کہا کہ "میں خدا کو اس لیے مانتا ہوں کہ رسولؐ کو مانتا ہوں" بزرگوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اور انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن میں اس وقت ان کے سامنے گستاخ ہو گیا تھا میں یہاں تک کہ گیا کہ "آپ کے پاس خدا کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن میرے پاس ہے اور وہ یہ کہ رسولؐ نے کہا تھا کہ خدا ہے"، میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اور دیر تک اقبال کی بانگِ درا پڑھتا رہا اور جب شکوہ کے اس بند پر پہنچا:

تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذاتِ قدیم — پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحب الطافِ عمیم — بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت تیرے محبوب کی دیوانی تھی

تو خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں کہ میں اپنے بزرگوں کے سامنے اقبال کی دلیلیں پیش کر کے آیا ہوں۔

اب خاندان میں میرا تھوڑا سا احترام بھی کیا جاتا تھا اور لوگ میرے نام پر زیرِ لب مسکرا بھی دیتے تھے۔

میں نے اچھی چیزیں کھانا چھوڑ دی تھیں ٹینس کھیلنا اور شکار کھیلنا بھی تقریباً ترک کر دیا تھا زیادہ تر کتابیں پڑھنے میں وقت گزرتا تھا لیکن کام کی کتابیں کم تھیں سب سے اچھی کتاب بانگِ درا تھی جو زبانی یاد ہو گئی تھی اسی دوران میں نگار کے کچھ پرانے پرچے کہیں سے مل گئے غالباً ۱۹۲۴ء کی فائلیں تھیں ان میں پہلی بار غالباً نیاز فتحپوری کی کسی تحریر میں انقلابِ روس کا ذکر مل گیا اور میں نے اقبال کی خضرِ راہ کو اسکے ساتھ ملا کر اپنے خوابوں کی نئی دنیا تعمیر کرنا شروع کر دی۔

ماں باپ میری حالت پر کڑھتے تھے اور بہنیں مجھے حیرت سے دیکھتی تھیں ایک رشتہ کی بہن تھی اس کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ پسندیدگی کی چمک مجھ کو اس پر آمادہ کر رہی تھی کہ میں اس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کر دوں میں اس سے ہمیشہ مفلسی اور امارت، ظلم اور انصاف کی باتیں کرتا رہتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ ہمارے درمیان کچھ نازک اور لطیف رشتے پیدا ہو گئے ہیں اور میرے دل میں ایک نور سا بکھر گیا۔ برسوں بعد جب میری شادی کا سوال اٹھا تو میں نے اپنے والدین کو اس لڑکی کا نام بتا دیا لیکن لڑکی کے باپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اول جلول آوارہ گرد ٹھہرا نہ رہنے کا ٹھکانہ ہوگا نہ کھانے کا۔ لڑکی کہاں بھاڑ جھونکے گی۔

یہ غالباً ۱۹۳۰ء کے آس پاس کی بات ہے کہ میں نے طے کر لیا کہ میں بلرام پور سے نکل جاؤں گا اتفاق سے یہ خبر معلوم ہوئی کہ جہاز رانی کی ٹریننگ کے لیے اب ہندوستانی بھی لیے جائیں گے، کچھ ذوق آوارہ گردی کچھ بلرام پور سے نکل جانے کا شوق، میں نے اپنے والد سے جہاز رانی میں جانے کی خواہش ظاہر کی انھوں نے اجازت دیدی میں مہینوں امتحان کی تیاری کرتا رہا اور پھر لکھنؤ جا کر امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہو گیا بمبئی سے بلاوا آ گیا میں بے انتہا خوش تھا اور سفر کی تیاریاں کرنے لگا تھا کہ یکایک ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے سارے خوابوں کو خاک میں ملا دیا۔

ایک مجتہد صاحب ہر سال تشریف لاتے تھے میں جانے کی تیاری میں تھا کہ وہ آ گئے، جب میرے والد نے ان کے سامنے ذکر کیا تو کچھ شبہات کا اظہار بھی ہوا کس طرف سے یہ مجھے نہیں معلوم بس اتنا معلوم ہے کہ مجھے ان کے سامنے بلایا گیا اور پھر میرے سامنے استخارہ دیکھا گیا اور استخارہ منع ہو گیا۔ میں نے اس وقت ذرا سی جھنجھلاہٹ محسوس کی پھر یہ تاویل کی چلو اچھا ہوا میں خواہ مخواہ انگریزوں کی ملازمت کرنے جا رہا تھا لیکن جب ۱۹۴۶ء میں میری آنکھوں کے سامنے بمبئی کے جہازیوں نے بغاوت کی تو میرا دل اس خیال سے تڑپ اٹھا کہ میں اس بغاوت میں شریک نہ ہو سکا۔ اے ایک

طرح کی رومانیت کہہ لیجیے لیکن یہی رومانیت تو زندگی میں رس پیدا کرتی ہے۔

اب پھر بلرام پور کا کنواں تھا اور میں۔ عمل کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، ذہنی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں، میں بے بس تھا اور اندر اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

انتخاب کلام

پرتو سے جس کے عالم امکاں بہار ہے ـــ وہ نو بہار ناز ابھی رہگزر میں ہے

سو ملیں زندگی سے سوغاتیں ـــ ہم کو آوارگی ہی راس آئی

تو وہ بہار جو اپنے چمن سے آوارہ ـــ میں وہ چمن جو بہاراں کے انتظار میں ہے

کمی کمی سی تھی کچھ رنگ و بوئے گلشن میں ـــ لب بہار سے نکلی ہوئی دعا تم ہو

بہت برباد ہیں لیکن صدائے انقلاب آئے ـــ وہیں سے وہ پکار اٹھے گا جو ذرہ جہاں ہوگا

اسی لیے تو ہے زنداں کو جستجو میری ـــ کہ مفلسی کو سکھائی ہے سرکشی میں نے

دل و نظر کو ابھی تک وہ دے رہے ہیں فریب ـــ تصورات کہن کے قدیم بت خانے

ہمارے دل کی تپش سے چراغ جلتے ہیں ـــ ہماری تشنہ لبی میکدے بناتی ہے

نگاہِ ساقی نامہرباں کا شکوہ کیا ـــ ہمارے نام کی صہبا چھلک ہی جاتی ہے

جواب تلخ لب یار ہو کہ بوسۂ یار ـــ اگر وہ قند مکرر نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہت حسین سہی زندگی کا بت خانہ ـــ نگاہ شوق صنم گر نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ چمن کی آرزو ہے کوئی لوٹ لے چمن کو ـــ یہ تمام رنگ و نکہت ترے اختیار میں ہے

ترے ہاتھ کی بلندی میں فروغ کہکشاں ہے ـــ یہ ہجوم ماہ و انجم ترے انتظار میں ہے

اپنی بے باک نگاہوں میں سمایا نہ کوئی ـــ اور وہ ہیں کہ ہر اک تازہ ادا سے خوش ہیں

دربدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال ـــ اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب



ستاروں کے سلام آئے بہاروں کے پیام آئے ـــ ہزاروں نامہ ہائے شوق اہل دل کے نام آئے

نہ جانے کتنی نظریں اس دل وحشی پہ پڑتی ہیں ـــ ہر اک کو فکر ہے اس کی یہ شاہیں زیر دام آئے

اسی امید میں بے تابی جاں بڑھتی جاتی ہے
سکونِ دل جہاں ممکن ہو شاید وہ مقام آئے

ہماری تشنگی بجھتی نہیں شبنم کے قطروں سے
جسے ساقی گری کی شرم ہو آتش بجام آئے

انہیں راہوں میں شیخ و محتسب حائل رہے اکثر
انہیں راہوں میں حورانِ بہشتی کے خیام آئے

نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشید تمنا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے ناتمام آئے

یہ عالم لذت تخلیق کا ہے رقص لافانی
تصور خانہ، حیرت میں لاکھوں صبح و شام آئے

کوئی سردار کب تھا اس سے پہلے تیری محفل میں
بہت اہل سخن اٹھے بہت اہل کلام آئے

○

وہ بہاریں وہ ہوائیں جو زمیں زمیں چمن دیں
وہی مہر وماہ لائیں جو افق افق کرن دیں

یہ نیا زمانہ اے دل جو وقار کھو چکا ہے
اسے اپنی سربلندی اسے اپنا بانکپن دیں

جو ہیں رند بھٹکے بھٹکے جو ہیں ساقی بہکے بہکے
انہیں درس میکدہ دیں انہیں ذوق انجمن دیں

بڑی دیر ہو چکی ہے کہ ہیں نوحہ خواں ستارے
چلو اب شب سیہ کو نئی صبح کا کفن دیں

لب تیغ پر لہو ہے، لب زخم پر تبسم
یہ حیات تن برہنہ اسے کیسا پیرہن دیں

نئی روح جسم خستہ کو عطا نہ ہو سکے تو
یہ کریں کہ روح نو کو کوئی اک نیا بدن دیں

نئی ابروؤں کو بجلی نئی انکھڑیوں کو صہبا
نئی تیغ دیں نظر کو نئی زلف کو شکن دیں

یہ زمیں مری زمیں ہے یہ فلک مرا فلک ہے
انہیں صید کر چکی ہیں مری فکر کی کمندیں

اسی بزم میں ملیں گے ابھی شعر تر کے ساغر
چلو بزم جعفری میں تمہیں جام فکر و فن دیں

○

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا

باعث رشک ہے تنہا روی رہرو شوق
ہم سفر کوئی نہیں دوری منزل کے سوا

ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اٹھایا دل کو
لیکن اک شوخ کے ہنگامۂ محفل کے سوا

تیغ منصف ہو جہاں دار و رسن ہوں شاہد
بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا

جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شور سلاسل کے سوا



آئے ہم غالب و اقبال کے نغمات کے بعد
مصحفِ عشق جنوں حسن کی آیات کے بعد

اے وطن خاکِ وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد

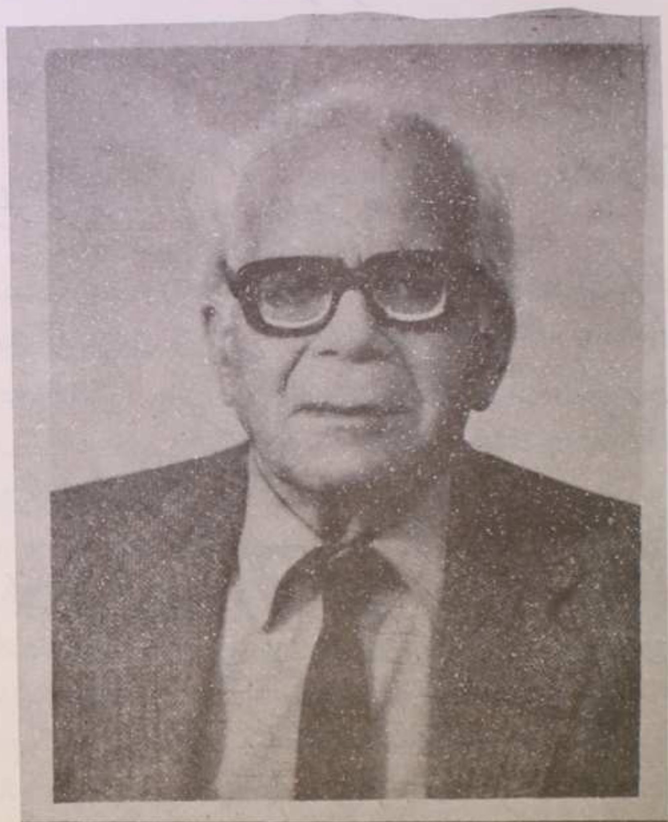
نارِ نمرود یہی اور یہی گلزارِ خلیل
کوئی آتش نہیں آتشکدۂ ذات کے بعد

رام و گوتم کی زمیں، حُرمتِ انساں کی امیں
بانجھ ہو جائے گی کیا خون کی برسات کے بعد

مجھ کو معلوم ہے وعدوں کی حقیقت کیا ہے
بارشِ سنگِ ستم جامِ مدارات کے بعد

تشنگی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی سردار
بڑھ گئی کوثر و تسنیم کی سوغات کے بعد

آل احمد سرور



آل احمد سرور   پ ۱۹۱۲ء

عکسِ تحریر

غزل

چلو ہم اپنی خطاؤں کا اعتراف کریں
پھر اسکے بعد کسی کی خطا معاف کریں

کیا تھا ہم نے بہت کچھ ادا ہے کیا کیا کچھ
سحر قریب ہے، اپنا حساب صاف کریں

زمانے چھین لیا دردِ مشترک کا زور
بچی ہے زیرِ زمیں شمشیر اسے غلاف کریں

کبھی کبھی تو خود زخم کا مزا چکھیں
کبھی کبھی تو روایت سے انحراف کریں

جو اُن کے در پہ جبینیں جھکانے آئے تھے
وہ پہلے اپنی جبینوں کی گرد صاف کریں

حرم کو شکوہ ہے آئے اپنا یار یہاں
جو دل تو لائے نہیں خالی، مگر طواف کریں

[illegible]

آل احمد سرور

پیدائش بدایوں، یوپی۔ ہائی اسکول کے امتحان میں تاریخ پیدائش ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء ہے۔ ہمارا خاندان صدیقی فرشوری ہے۔ روایت یہ ہے کہ فرشور مصر میں کوئی مقام تھا جہاں سے ہمارے آباؤاجداد ہندستان آئے۔ سلسلۂ نسب حضرت عبدالرحمان بن ابوبکرؓ سے مل جاتا ہے۔ مکتب کی تعلیم، قرآن شریف اور فارسی کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول پیلی بھیت میں تیسرے درجے میں نام لکھایا گیا۔ میرے والد اس زمانے میں وہاں پوسٹ ماسٹر تھے۔ پھر بدایوں، بجنور، سیتاپور، گونڈہ اور غازی پور کے اسکولوں میں پڑھا۔ ہائی اسکول وکٹوریہ اسکول غازی پور سے کیا۔ اس کے بعد سینٹ جانس کالج آگرہ سے بی۔ایس سی کیا۔ ایم۔اے پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کیا۔ مطالعے اور شاعری کا شوق شروع سے تھا۔ ۱۹۳۴ء میں شعبۂ انگریزی میں لیکچرر مقرر ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد میری خدمات شعبۂ اردو کو منتقل کردی گئیں۔ خواجہ منظور حسین انگریزی کے استاد تھے۔ رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ذاکر حسین سے یہیں قرب ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ میگزین کا ایڈیٹر اور ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی یونین کا نائب صدر ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں پہلا مجموعۂ کلام "سلسبیل" شائع ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں رشید احمد صدیقی کے ساتھ رسالہ سہیل کا ایک خاص نمبر نکالا۔ ۱۹۴۱ء میں تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "تنقیدی اشارے" شائع ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں "انتخاب جدید" کے نام سے عزیز احمد کے ساتھ "جدید اردو شاعری کا انتخاب" شائع ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں ڈیپوٹیشن پر رضا انٹر کالج رام پور کا پرنسپل ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ "نئے اور پرانے چراغ" شائع ہوا اسی سال مولوی عبدالحق کی سفارش پر لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کا ریڈر مقرر ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں "تنقید کیا ہے؟" کے نام سے تیسرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ ۱۹۵۰ء سے اردو ادب کا (جو انجمن ترقی اردو ہند کا سہ ماہی تنقیدی رسالہ ہے) ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں مضامین کا چوتھا مجموعہ "ادب اور نظریہ" شائع ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں شاعری کا دوسرا مجموعہ "ذوقِ جنوں" کے نام سے شائع ہوا۔ فروری ۱۹۵۵ء میں مجھ سے جونیر ایک ریڈر کو صدر شعبہ بنا دیا گیا اس پر میں نے استعفا دیدیا۔ بعد میں چندر بھانو گپتا منسٹر کے کہنے پر استعفا واپس

لے لیا۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے سید حسین ریسرچ پروفیسر کے عہدے پر آنے کی دعوت دی اور میں علی گڑھ واپس آگیا۔ یہاں غالب کے اردو دیوان کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور نول کشور پر ایک مقالہ تیار کرایا۔ ۱۹۵۵ء سے ساہتیہ اکادمی کا ممبر منتخب ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں رشید احمد صدیقی کے سبکدوش ہونے پر پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو مقرر ہوا۔ علی گڑھ آنے کے بعد جنوری ۱۹۵۶ء سے انجمن ترقی اردو کا اعزازی سکریٹری مقرر کیا گیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۴ء کے مارچ تک جاری رہا۔ ۱۹۶۰ء میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کے ماسکو کے اجلاس میں شرکت کی۔ ۱۹۶۶ء میں ترجمہ سیمینار کے سلسلے میں کابل جانا ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں شکاگو یونیورسٹی (یو۔ ایس۔ اے) میں وزٹنگ پروفیسر رہا اور غالب اور جدید شاعری پر لکچر دیے۔ ۱۹۷۲ء میں کلچرل ایکس چینج پروگرام کے تحت رومانیہ، ہنگری اور سوویت یونین کی سیر کی اور وہاں کے ادیبوں سے ملاقات کی۔ ۱۹۷۳ء میں تنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ "نظر اور نظریے" اور ۱۹۷۴ء میں "مسرت سے بصیرت تک" شائع ہوا۔ "نظر اور نظریے" پر ۱۹۷۴ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں علی گڑھ کی ملازمت سے سبکدوش ہوا اور اپریل ۱۹۷۴ء سے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ میں وزٹنگ فیلو مقرر ہوا جہاں تین سال قیام رہا۔ ۱۹۷۷ء میں شیر کشمیر شیخ عبداللہ کی دعوت پر کشمیر یونیورسٹی میں اقبال پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۹۷۹ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ وجود میں آیا اور میں اس کا ڈائرکٹر مقرر ہوا۔ شعبۂ اردو سے کئی جلدیں سیمیناروں کے مقالوں کی ایڈٹ کر کے شائع کیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سیمیناروں کے مقالات کے بھی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں پہلی اقبال انٹرنیشنل کانگریس میں اور ۱۹۸۲ء میں دوسری کانگریس میں شرکت کی۔ دہلی یونیورسٹی میں "اقبال نظریہ اور شاعری" کے نام سے تین خطبات دیے جو شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں "ہندستان کدھر" کے عنوان سے سیدین میموریل لکچر دیا جو شائع ہو چکا ہے۔ تصانیف اور مرتب کردہ کتابوں کی تعداد دو درجن کے لگ بھگ ہوگی۔ شاعری کا تیسرا مجموعہ اور تنقیدی مضامین کے دو مجموعے اشاعت کے لیے تیار ہیں۔

مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، خواجہ منظور حسین اور اچاریہ نریندر دیو سے متاثر ہوں۔ اردو تنقید میں حالی سے اور انگریزی میں رچرڈس اور ایلیٹ سے متاثر ہوں۔ اقبال سے بہت متاثر ہوں مگر میر اور غالب کی عظمت کو بھی مانتا ہوں۔ ہمعصر شعرا میں فیض اور راشد کو اہمیت دیتا ہوں۔ نثر پر زیادہ توجہ کی وجہ سے شاعری کو زیادہ وقت نہ دے سکا مگر یہ سلسلہ بہرحال جاری رہا۔

شادی ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ میری ایک نظم کا آخری بند حسب حال ہے:

بہت سیکھا، بہت سوچا، بہت پی پی کے چھلکایا　　بہت توڑا، بہت جوڑا، بہت چاہا، بہت پایا
مگر پھر بھی کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے

آل احمد سرور

انتخاب کلام:

جن کا تھا مجھ کو جنوں، یہ وہ بہاریں تو نہیں　　میری پلکوں میں ابھی اور لہو باقی ہے

حیاتِ تازہ کے خطروں سے دل دھڑکتا تھا
ہوا چلی تو کلی پھر بھی مسکرا ہی گئی

ساحل کے سکوں سے کسے انکار ہے لیکن
طوفانوں سے لڑنے میں مزا اور ہی کچھ ہے

روشن ہوئے جن سے غمِ دنیا کے بھی سائے
ایسے بھی دیے تیرے تصوّر نے جلائے

دشت میں پھول کھلاتے تو ہے اہلِ وفا
شہرِ خوباں میں اگر نام نہ کرنے پائے

بدلے بہارِ لالہ و گل نے ہزار رنگ
لیکن جمالِ دوست کا عالم نہ ہو سکی

انھیں سے ہوتی ہے توسیع کاروبارِ چمن
جو خارِ دشت سے الفت زیادہ رکھتے ہیں

دھڑکتے دل کے علاوہ کسی کو کیا معلوم
معاملے جو مرے ان کے درمیاں ٹھہرے

دشت و دمن میں پھول کھلائے تو بات ہے
یہ کیا بہار ہے جو مقید چمن میں ہے

سرورؔ آؤ، نئی صبح کو گلے سے لگائیں
اگرچہ دے کے نئی مشکلات آئی ہے

اپنے نگار خانے میں مستوں نے کیا کیا
غیروں پہ کیسے فاش کریں، گھر کی بات ہے

نگاہیں منتظر تھیں کب کرن پھوٹے، سحر جاگے
مگر یہ رات تو کچھ اور کالی ہوتی جاتی ہے

مری تشنہ لبی میری صراحی میں چھلک آئی
وہ پیہم بھرتے جاتے ہیں، یہ خالی ہوتی جاتی ہے

کرن پڑتی ہے جوں جوں شوخیوں کی ان نگاہوں میں
سرورؔ اتنی ہی صورت بھولی بھالی ہوتی جاتی ہے

تجھ سے طوفاں کے تقاضے کبھی اتنے تو نہ تھے
تیری دلدارئ ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی

زلفِ ہستی کو سنوارا ترے گیسو کی طرح
کام تھا گرچہ بہت سخت، مگر ہم نے کیا

رہِ حیات بڑے پیچ و خم سے گزری ہے
کسی طرف کوئی سیدھا سا راستا نہ گیا

نہ مسرت سے ہے نہ غم سے ہے
زندگی کشمکش کے دم سے ہے

دل کی اک چھوٹی سی بستی اور غمِ کون و مکاں
اُن کی برکت سے، بحمد اللہ، آسائش تو ہے

شوق کے ہاتھ کہاں چاند کو چھو سکتے ہیں
چاندنی دل میں رہے، یہ بھی شرف کیا کم ہے

کیا لہو روئے تو آیا ہے بہاروں کا سلام
صرف خوابوں سے حقائق کو سنوارا نہ گیا

وہ بھی وقت آتا ہے ساقی بھی بدل جاتے ہیں
میکدے پر کبھی مستوں کا اجارا نہ گیا

بے بال و پر ہوتے ہوئے اللہ رے اپنا حوصلہ
ان طائرانِ بام کو اڑنا سکھاتے ہی رہے

میں سلامے جنوں و جذب و گداز
وہ نوائے رم و ادائے گریز

آرزو کا سرور شعلہ بجام　　دلبری کا غرور کم آمیز

ہزاروں طایرانِ بام پر تولے رہے پھر کیا　　فضا میں ہی ادائے بال و پر معلوم ہوتی ہے

سرورِ اللہ والوں میں بڑا درجہ تمہارا تھا　　مگر مستی میں ہونٹوں پر یہ کس کافر کا نام آیا

ہر اک جنت کے رستے ہو کے دوزخ سے نکلتے ہیں　　انھیں کا حق ہے پھولوں پر جو انگاروں پہ چلتے ہیں

نوکِ ہر خار کو سب خونِ جگر دے ڈالا　　یہ خرابے تو گلستاں نہیں ہونے پاتے

اپنی بستی میں بھی اک شورِ جنوں اٹھا ہے　　تجھ کو ایسے میں بیاباں کی ہوا یاد آئی

تجلّی کو من و تو میں مقید کر نہیں سکتے　　جہاں کوئی چراغاں ہے وہ اپنا ہی چراغاں ہے

سود و زیاں کا ذکر کیا، جب ہو جنوں کا کاروبار　　آج ہیں سب کو اُلجھنیں، میرا حساب صاف ہے

ہوش و خرد کے بام سے، جذب و جنوں کے طور تک　　سلسلۂ طلب وہی، وضع میں اختلاف ہے

علم و حکمت سے شعر و نغمے تک　　اپنے اپنے نشے کی بات آئی

جہاں خاروں نے کی تھی آبلہ پاؤں کی دلداری　　اُسی وادی میں کھلتے ہیں گلاب آہستہ آہستہ

برسوں جو پھونک پھونک کے رکھے گئے قدم　　اک لغزشِ جنوں کے برابر نہ ہو سکے

خس و خاشاک کی بیدادگری عام ہے آج　　اپنے شعلے کو بچالے یہ بڑا کام ہے آج

سادہ اوراقِ فطرت سے بہلتا نہیں دل　　بے صنم خانۂ افکار سجائے نہ بنے

بڑا بھاری ہے خوابوں کے نازک آبگینے پر　　ہزاروں ظلمتوں میں اک کرن کی آزمائش ہے

کچھ تو ہے ویسے ہی رنگیں لب و رخسار کی بات　　اور کچھ خونِ جگر ہم بھی ملا دیتے ہیں

(رباعی) احباب سے یوں تو لطفِ صحبت بھی ہے　　اپنے سے ملاقات کی فرصت بھی ہے

عالم میں چراغاں ہو تو شرکت بھی ہے　　لو اپنے چراغ کی سلامت بھی ہے

(انتخاب از ذوقِ جنوں)

چاند کا کیا ہے، گئے اور چلے بھی آئے　　یک ہمسائے کا دروازہ کئی منزل ہے

ہم کو خواب اور حقیقت نے ڈسا ہے مل کر　　زہراب کون سا باقی ہے جو راس آئے گا

ایک عالم سے کب آسودہ ہوا ہے انساں　　وہ تو جنت میں بھی دوزخ کی کمی پائے گا

بزمِ عالم میں چراغاں سے کسے انکار ہے　　اپنی چنگاری کی لیکن پرورش بھی کم نہیں

چُپ رہیں تو دل اپنا کچھ خفا سا رہتا ہے　　سچ کہیں تو ساتھی بھی ہم سے روٹھ جاتے ہیں

اپنی تیغ سے یارو کون زخم کھاتا ہے — ہم سبھی سہولت کو فلسفہ بناتے ہیں

***

بڑھ گئی حد سے سوا اب تو گراں خوابیِ زیست — یادِ جاناں بھی دبے پاؤں گزر جاتی ہے

***

یہ انجم و مہ و خورشید ہیں سبھی کے لیے — لگا لو سینے سے جو بھی کرن جہاں سے ملے

***

جن اصولوں کو ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہو — ان کی تلوار سے بھی زخم کوئی کھاؤ کبھی
حسن کو دیدہ و دل نذر کیے خوب کیا — حسن والوں کے لیے راز بھی بن جاؤ کبھی
آگہی گنجِ گراں مایہ ہے ڈھونڈو اک عمر — اور ہر گنجِ گراں مایہ کو ٹھکراؤ کبھی
تم نے تزئینِ حرم کے لیے کیا کیا نہ کیا — بت کدے سے بھی کوئی شمع چرا لاؤ کبھی

***

جنس کے جبر کی یا جسم کے جادو کی ہے بات — کوئی بھولے سے بھی لیتا نہیں اب پیار کا نام

***

دیتے ہیں نام جبر کو بھی اختیار کا — مجبوریوں کو اپنی وفا کر رہے ہیں لوگ
میرے لہو نے دشت کو گلزار کر دیا — اس کو بھی فیضِ بادِ صبا کر رہے ہیں لوگ
بے جا نہ تھی بتوں کی خدائی کی رسم بھی — پرچھائیوں کو اب تو خدا کر رہے ہیں لوگ

***

جن کو آزادیِ افکار کے دعوے تھے بہت — پاؤں میں ان کے بھی زنجیر پڑی ہے اے دوست
یہ سیاہی کی سفیدی کی لکیریں کیسی — زندگی تیری لکیروں سے بڑی ہے اے دوست
آگہی نے بھی کچھ آشوب کیے ہیں پیدا — زندگی تازہ جنوں ڈھونڈ رہی ہے اے دوست

***

بیدلیِ بزم کی تقدیر ہوئی جاتی ہے — فکرِ برہم کے بگولے ہی لگاتے رہیے
دل میں طوفاں نہ ہو کوئی تو ہوتا ہے یہی — چائے کی پیالی میں طوفان اٹھاتے رہیے

***

سروں پہ چلتے ہیں دل میں اتر نہیں سکتے — کوئی بتاؤ کہ یہ انقلاب کیسا ہے

***

عمر گزری ہے اندھیرے ہی کا ماتم کرتے — اپنے شعلے سے بھی کچھ کام لیا ہے تم نے

***

نہ یہ عالی جناب اٹھے، نہ وہ عالی مقام آئے — جب آئی آنچ صحرا پر تو دیوانے ہی کام آئے
لہو کی چند بوندیں میں نے بکھرائی ہیں راہوں میں — نہ جانے کس شگوفے کو بہاروں کا سلام آئے

***

نسیم چھیڑ کرے کس سے کچھ نمو بھی تو ہو — چراغِ لالہ و گل کے لیے لہو بھی تو ہو

***

چاند کو چھونے کا قصہ بھول ہی جانے کی بات — ہر سہانی آرزو اب تک ہے دیوانے کی بات
شمع کے جلوے پہ سب کی جان جاتی ہے مگر — کون سمجھے ایک پروانے کے جل جانے کی بات

سرورؔ آدابِ مستی کا تقاضا ان سے کیا کیجے — کہ رندوں کو ابھی آدابِ محفل تک نہیں آتے

حقائق کے پرستاروں نے خوابوں کو کچل ڈالا — مگر کچلے ہوئے خوابوں کی تابانی نہیں جاتی

شناسا سیکڑوں ہیں، آشنا کوئی نہیں ملتا — بھری محفل میں میرے دل کی ویرانی نہیں جاتی

نگل گئی انھیں ساحل کی ریت آخرکار — سفینے جو بھی تھے طوفاں کے آزمائے ہوئے

ہر قدم پر خود ہی دیتی ہے بڑھاوا چشمِ دوست — عاشقی کا بار کب تنہا اٹھایا جائے ہے

یاد آتا ہے کوئی صحنِ چمن یا کوئے دوست — دیر تک کس سے فضاؤں میں بھی گھبرائے ہے

دل وہ کافر کہ حقیقت نہ فسانہ مانگے — ہر زمانے میں کوئی اور زمانہ مانگے

دلِ صد چاک کی اے دوست بڑی مشکل ہے — گیسوئے لیلیِ ایام بھی شانہ مانگے

دل وہ معصوم کہ ہر شب کو کہانی مانگے — عقل ہر صبح کہانی میں معانی مانگے

دل میں پہلے ہی بہت زخم تھے اب کیا ہوگا — ہر نیا درد، الگ اپنی نشانی مانگے

ہاں جان کر امید کی مدھم رکھی ہے لَو — اب اور پاسِ خاطرِ ناشاد کیا کریں

ہزار بار بہاروں نے دکھ دیا مجھکو — نہ جانے کیا ہے بہاروں کا انتظار بھی ہے

مرے سفینے کو ساحل کی جستجو ہی نہیں — ستم یہ ہے کسی طوفاں کا انتظار بھی ہے

غرورِ عشق، غرورِ وفا، غرورِ نظر — سرورؔ، تیرے گناہوں کا کچھ شمار بھی ہے

لوگ تنہائی کا کس درجہ گلا کرتے ہیں — اور فن کار تو تنہا ہی رہا کرتے ہیں

ساتھ دینا وقت کا بھی کیا قیامت ہوگیا — کل تلک جو آشنا تھے، آج ہیں نا آشنا

شاہراہوں سے گزرتے ہیں شب و روز ہجوم — نئی راہیں ہیں فقط چند جیالوں کے لیے

کتنے سنگین حقائق سے نچوڑا ہے لہو — چند خوابوں کے لیے، چند خیالوں کے لیے

جہاں میں کس کو گوارا ہوئی ہے فکر کی دھوپ — ہر اک یہاں شجرِ سایہ دار مانگے ہے

دیدہ و دانش کا کوئی کرب گوارا نہ ہوا — یوں تو ہونے کو مری بزم میں کیا کیا نہ ہوا

نہ جانے اس رخِ روشن پہ کس نے لکھ دی ہے — نگاہِ شوق نے میری جو بات کی بھی نہیں

ہر ایک تازہ کرن کے لیے کھلے ہیں کواڑ — اگرچہ گھر میں ہمارے کوئی کمی بھی نہیں

ایک خوشبو میں کئی جادو کہاں سے آگئے — اک ادا میں ان گنت پہلو کہاں سے آگئے

ہم تو نکلے تھے کسی دار و رسن کی چاہ میں — پیشوائی کو قد و گیسو کہاں سے آ گئے
ہم افق پر دیکھتے تھے جلوہ ہائے نو بہ نو — اس جھروکے میں خم ابرو کہاں سے آ گئے
چشم ساقی مہرباں ہے لطف ساقی بے کراں — پھر یہ میری آنکھ میں آنسو کہاں سے آ گئے

غم دوراں، غم انساں کے بڑے چرچے تھے — یہ بھی اپنی ہی نمائش کے بہانے نکلے

ہوا کرتی ہے برگ گل میں بھی شمشیر کی تیزی — یہ جادو ہے نگاہ مہرباں قاتل نہ بن جائے

میں نے ہی کیا نکالی تھی یہ رہگزر کبھی — تکتی ہے رہگزر مجھے اور رہگزر کو میں
دنیا بڑی ہے اس کے مسائل بڑے بڑے — اس مخمصے میں بھول گیا اپنے گھر کو میں

نئے زمانے کے آشوب آگہی کے لیے — بس ایک دیدۂ تر تھا سو معتبر کیا تھا

مشترک دھوپ تو کیا ہو، کوئی سایہ بھی نہیں — اپنا اپنا ہے الگ سایۂ دیوار یہاں

خدا وہی ہے مگر اس کا کیا علاج کریں — کہ آدمی تو بہت کچھ بدل گیا ہے میاں

رات کا جشن منانے والے گو پھیلاتے رہتے ہیں — وہ بھی تو شرمایا ہوگا جس نے سحر کا ساتھ دیا
دست و بازو کے کوئی شایاں نظر آتا نہیں — چلتی رہتی ہے مگر تلوار ان کے شہر میں

دیکھے ہیں کتنے سایۂ دیوار کے گلاب — قائم ہے دھوپ میں جو شجر دیکھتے چلیں

اک خدا کی بندگی کا حق ادا ہوتا نہیں — شہر کے اتنے بتوں کی بندگی کیسے کریں

آج کل کیا کیا کرشمے آدمی کے ساتھ ہیں — دل کسی کے ساتھ تلواریں کسی کے ساتھ ہیں

بھیڑ کوئی ہو، تماشا کوئی، ہنگامہ کوئی — خوف کے مارے ہوئے ہیں ہر کسی کے ساتھ ہیں

داستانِ درد کتنی بار دہرائی گئی — سننے والوں میں توجہ کی کمی پائی گئی

گرد راستے کی ہے، پھر بھی ہے شرف اتنا — ان اجاڑ گلیوں کا جو بھرم ہے ہم سے ہے

اندھیرے میں اجالے کی تمنا سب کو ہوتی ہے — اندھیرے میں بھٹکنے کی روش جاتی ہے مشکل سے

چلو ہم اپنی خطاؤں کا اعتراف کریں — پھر اس کے بعد سبھی کی خطا معاف کریں
کبھی کبھی تو نئے زخم کا مزا چکھیں — کبھی کبھی تو روایت سے انحراف کریں
جو ان کے در پہ جبینیں جھکائے آتے ہیں — وہ پہلے اپنی جبینوں کی گرد صاف کریں

دشت میں کل کوئی وحشی یہ صدا دیتا تھا — شہر والوں کی یہ تہذیب تو بیمار کرے

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی ہے   ہماری بات بھی ہے اور تمہاری بات بھی ہے

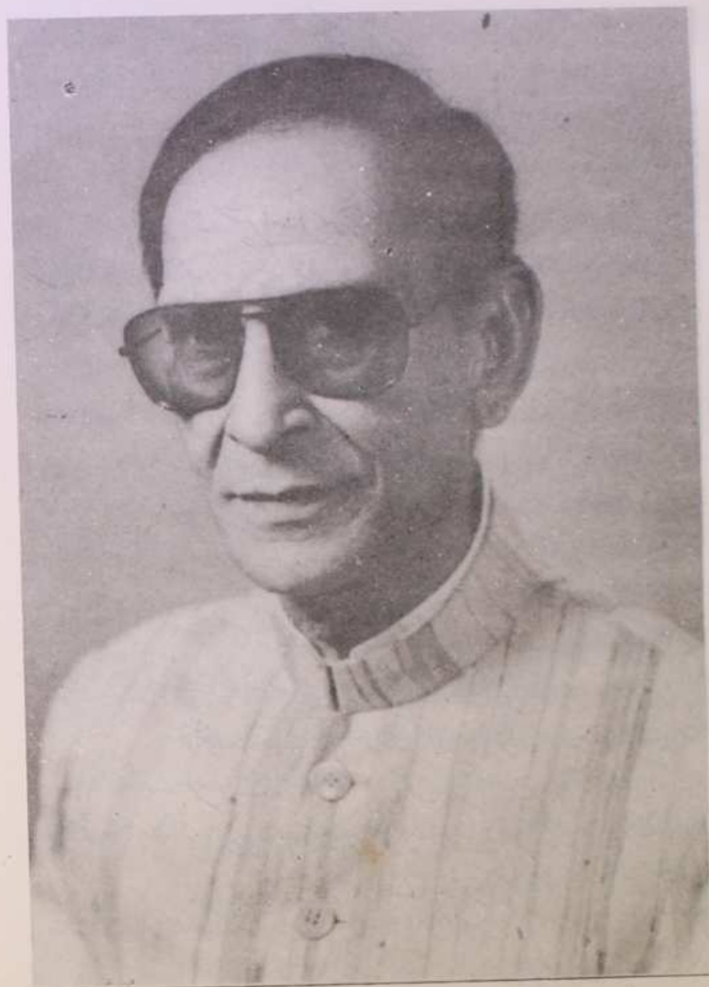
وقت کی گرد نے دھندلا دیے کتنے منظر   ہاں مگر تیری گلی تیری گلی آج بھی ہے

بہاروں کی تمنا میں بھرم اپنا بھی رکھنا ہے   چمن سب کے لیے مانگیں، روش اپنی جدا مانگیں

کون اپنے بت تراشے، کون یہ زحمت کرے   دوسروں کے ہی گھروں سے بت چرا لاتے ہیں لوگ

ہم نہ اِس ٹولی میں تھے یارو، نہ اُس ٹولی میں تھے   نے کسی کی جیب میں تھے، نے کسی جھولی میں تھے

شاعر لکھنوی



حسن پاشا شاعر لکھنوی ——— (پ - ۱۶ر نومبر ۱۹۱۷ء)

عکسِ تحریر

کبھی شراب کی صورت کبھی لہو کی طرح
غم اپنا رنگ بدلتا ہے آرزو کی طرح

سکھا رہے ہیں وہ آدابِ میکشی ہم کو
جو میکدے میں چھلکتے رہے سبو کی طرح

سکوت پر بھی وہ شاید بٹھائیں گے پہرے
سکوت بھی تو ہے اک جرمِ گفتگو کی طرح

بہار میں بھی نہیں کوئی شاخِ گل محفوظ
چمن کا حسن ہے مفلس کی آبرو کی طرح

ہمیں بھی دیکھ کہ ہم زندگی کے صحرا میں
کھلے ہوئے ہیں کسی زخمِ آرزو کی طرح

خوشی سے آئے ترے دستِ ناز میں تلوار
عزیز ہے ہمیں وہ بھی رگِ گلو کی طرح

نگاہِ لطف کی جنبش کے بعد اے شاعر
ہر ایک زخم ہے اپنی جگہ رفو کی طرح

شاعر لکھنوی

شاعر لکھنوی

میرا نام حسن پاشا اور قلمی نام شاعر لکھنوی ہے۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ کی خاک پر اپنے وجود کی آنکھ کھولی۔ والد محترم منظور احمد صدیقی، قصبہ امیٹھی بندگی میاں ضلع لکھنؤ کے ایک معزز زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ میری عمر بمشکل ۵ برس کی تھی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ والدہ محترمہ، مجھ سے دو سال چھوٹا ایک بھائی اور آٹھ سال بڑی ایک بہن، یہ تھی کل کائنات۔ زندگی بسر کرنے کی جدوجہد میں تمام زمینداری رفتہ رفتہ فروخت ہو کر رہ گئی۔ شدید مالی مشکلات کے باعث مدرسہ کی تعلیم بھی ختم ہو گئی۔ ملازمت کے سوا بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ عزیزوں اور رشتہ داروں نے کوئی مدد نہیں کی۔ چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کر کے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتا رہا۔ بہن کی شادی قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے ایک زمیندار خاندان میں ہو گئی۔ جب آہستہ آہستہ معاشی حالات کچھ بہتر ہوئے تو ارباب علم و دانش اور صاحبان فضل و کمال کی صحبتوں میں بیٹھ بیٹھ حصول علم کے ذوق کو آسودہ کیا۔ میری ادبی و ذہنی تربیت میں مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کا اسم گرامی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔

۱۹۳۲ء سے ادبی محافل میں شرکت کی ابتدا کی۔ لکھنؤ میں میری شہرت کا آغاز کیننگ کالج کے ایک بڑے مشاعرے سے ہوا جس میں نوجوان شعراء میں میری غزل حاصل مشاعرہ ٹھہری۔ ایک شعر یہ تھا:

کر دیا دل کو ترے درد نے نازک ایسا   سانس بھی لی تو نکل آئے ہمارے آنسو

اس غزل کی مقبولیت کے بعد لکھنؤ کی گلیوں میں مجھے شاعرِ آنسو کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا۔ اس کے بعد میری شہرت کا سفر شروع ہوا۔

غالباً ۱۹۴۶ء میں کانپور میں ایک بڑا مشاعرہ حبیب احمد صدیقی آئی۔ سی۔ ایس کی صدارت میں (جو اس وقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی حیثیت سے کانپور میں تھے) منعقد ہوا۔ جس میں یہ شعر حاصلِ مشاعرہ مانا گیا:

عدم کے دوش پہ قائم ہے کائناتِ وجود   حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے

یہ شعر ہندستان گیر شہرت ومقبولیت کا سبب بنا۔

۱۹۴۷ء میں بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ کے سالانہ مشاعرے میں میری غزل کا تاثر بہت گہرا رہا۔ اس مشاعرے میں ہندستان کے تمام اساتذہ شریک تھے۔ ایک شعر یہ تھا:

نہ خزاں میں ہے کوئی تیرگی نہ بہار میں کوئی روشنی ۔۔۔ یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل گئے

۱۹۴۷ء کے آخر میں جامعہ نگر دہلی میں جگر مراد آبادی، روش صدیقی، قدیر لکھنوی اور جلیل رام پوری کے ہمراہ مشاعرے میں شرکت کی۔ اس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے فرمائی تھی۔ اس مشاعرے میں میری غزل کا اثر خصوصیت کے ساتھ محسوس کیا گیا اور اسٹیج سکریٹری نے میرے اس شعر کے حوالے سے نوجوان شعرا کو متوجہ کیا اور بتایا کہ گل و بلبل کی شاعری کا وقت گزر چکا ہے اب اِس طرح کے اشعار کی ضرورت ہے:

خزاں کے جھونکوں سے ڈرنے والے چمن کی تعمیر کیا کریں گے ۔۔۔ ہو بہانے کے بعد ہوتی ہے حاصل اک سرخیٔ فسانہ

میں نے شاعری کے سلسلے میں خود اپنے ذوق و وجدان شعری کو اپنا راہنما بنایا۔ کسی پر اصلاح کی ذمہ داری نہیں ڈالی البتہ بزرگ دوستوں اور اہلِ کمال کے مشوروں کی ہمیشہ قدر کی۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان کا رُخ کیا اور ۱۹۵۰ء تک شوکت تھانوی کے ہمراہ رہا اور ریڈیو لاہور سے فیچر لکھتا رہا۔ یہاں کے موقر پرچوں میں میرا کلام طبع ہوتا رہا۔ پاکستان میں شعرائے انتخابِ کلام سے متعلق جو کتب منظر عام پر آئیں تقریباً سب میں میرے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی مشہور کتاب "اردو رباعی کا فنی و تاریخی ارتقا" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی "متغزلین اور غزل" ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "اردو غزل" نقوش کے "غزل نمبر" اور نورالصباح بیگم کی کتاب "پاکستان کی مشہور شخصیتیں" میری نظر میں ہیں میرا ذکر اور کلام موجود ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری صدر شعبہ اردو جامعہ کراچی نے میرے بارے میں ایک تفصیلی مضمون میں لکھنؤ کا ایک غزل گو لکھنوی شاعر کے عنوان سے میری شاعری اور فن کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ ادارۂ ادبیات پاکستان کی طرف سے شایع ہونے والی کتاب اردو غزل میں بھی میرا کلام اور حالاتِ زندگی موجود ہیں۔

۱۹۷۹ء میں میرا پہلا مجموعۂ غزل بزرگ بونڈ لمیٹڈ پاکستان کی طرف سے شایع ہوا۔ جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ اب دوسرا مجموعۂ نعت "مدحِ محمدؐ" کے نام سے مکمل ہو کر نعت کونسل آف پاکستان کے اشتراک سے اشاعت کا منتظر ہے۔ یہ مجموعہ تمام و کمال صنعتِ عاطلہ (غیر منقوطہ) میں ہے۔ تیسرا مجموعہ بچوں کی نظموں سے متعلق ترتیب کے آخری مراحل میں ہے۔ تنقیدی مضامین کی ترتیب زیرِ غور ہے۔

ادب و شعر کے تین ادوار کے مطالعے اور مشاہدے سے گزر چکا ہوں، فراق، فیض، اصغر، جگر، یاس یگانہ

اور شادؔ عظیم آبادی کے رنگِ سخن سے متاثر ہوں۔

جنوری ۱۹۵۱ء سے کراچی میں مقیم ہوں اور ایشیا کے معروف ادارے ہمدرد، پاکستان سے اسٹورز منیجر کی حیثیت سے وابستہ ہوں۔

انتخابِ کلام:

خوشی کی ایک کرن بھی نہیں مکانوں میں ــــــ عجیب قحطِ محبت ہے خاندانوں میں

اندھوں کو حسنِ دیدہ وری کی ملی سند ــــــ گونگوں کی گفتگو کا قصیدہ لکھا گیا

زندگی راہ بھی ہے منزل بھی ــــــ کیا خبر کون کہاں سے گزرا

کیسے کیسے گل مرجھائے کیسے کیسے باغ جلے ــــــ صدیوں میں بھی کہہ نہ سکیں گے لمحوں کے افسانے لوگ

کبھی کبھی تو کچھ اس طرح تیری یاد آئی ــــــ کہ جیسے شمع جلا دے کوئی خیال کے پاس

نہ خزاں میں ہے کوئی تیرگی نہ بہار میں کوئی روشنی ــــــ یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل گئے

گرم کتنا ہے زمانے کی سیاست کا مزاج ــــــ ہم نے دیکھا ہے پگھلتے ہوئے ایمانوں کو

صبح کا ذکر سن کے اے شاعرؔ ــــــ سوچتا ہوں کہ رات کب گزری

پریشاں سی نظر، یہ عرق آلود جبیں ــــــ تم نہ تھے اتنے حسیں ترکِ وفا سے پہلے

لفظ و معنی کی صداقت نہ بدل جائے کہیں ــــــ آج اپنوں سے مجھے بوئے وفا آئی ہے

نہ جانے کیا ہے کہ جب بھی کوئی کلی چٹکی ــــــ شکستِ دل کا مجھے دیر تک رہا احساس

میں نے سائے کی اماں چاہی تھی ــــــ بچھ گیا دھوپ کا صحرا مجھ میں

جو کم نسب تھا نسب سے سوا دکھائی دیا ــــــ شجر کے ظرف سے سایہ بڑا دکھائی دیا

چند کاغذ کی کشتیوں کے لیے ــــــ شہر کا شہر زیرِ آب رہا

دوست بن جاتے ہیں پیرایۂ اظہار سے لوگ ــــــ زخم دینے کو بھی آتے ہیں بڑے پیار سے لوگ

اللہ رے اعتبارِ ہستی ــــــ ہم خواب میں جیسے چل رہے ہیں

کیوں نہ ہوں شگفتہ ہم دل پہ زخم کھانے سے ــــــ زخم کا تعلق ہے پھول کے گھرانے سے

لمحہ لمحہ اسی کی باتیں ہیں ــــــ گفتگو جس سے عمر بھر نہ ہوئی

کہاں کا ذوقِ پرستش، کہاں کے دیر و حرم ــــــ تمام عمر ہم اپنا طواف کرتے رہے

کوششِ ضبطِ عشق کیا کہیئے
آج لَو دے اٹھا تبسّم تک

ہجر میں کب ہوا ہے اندازہ
عمر گزری کہ ایک شب گزری

یہ کس خوشی میں مناتے ہیں جشن اہلِ چمن
کلی کا خون ہُوا ہے کلی ہنسی تو نہیں

حسابِ عمرِ گریزاں لکھوں تو کیسے لکھوں
جو ایک پل کو سمیٹوں تو اک زمانہ لگے

ہم تو سمجھے تھے کہ ہے عشق یہیں تک محدود
منزلیں اور بھی آئیں رسن و دار کے بعد

ہونٹوں کی خفیف جنبشوں میں
نغموں کے طویل سلسلے ہیں

چلا ہے پھول سے اور زخم پر ہوا ہے تمام
بہار ہم نے ترا شجرۂ نسب دیکھا

کون سی شکل چھپی ہے مجھ میں
ایک خوشبو سی بسی ہے مجھ میں

اس کے کوچے سے اٹھائے ہمیں کون
ہم گرے ہیں نقشِ کفِ پا کی طرح

عجیب شخص ہے وہ بھی کہ اُس کو آتا ہے
گُریز میں بھی ادائے سپردگی رکھنا

دبا سکا نہ مرے حرفِ حق کو جہل کا شور
میں اپنے عہد میں زندہ رہا اذاں کی طرح

ہو سکے تم سے تو غنچوں کو چٹکنے بھی نہ دو
عام ہو جاتی ہیں اس طرح چمن کی باتیں

ہمیں خبر ہے وہ کتنی پئیں گے اے شاعر
خیالِ جام سے جو لڑکھڑائے جاتے ہیں

اُڑ گیا بن کے دھواں فاصلۂ ہجر و وصال
تم کو اتنا نہ قریبِ رگِ جاں ہونا تھا

اُس کے لب پر بھی محبت کا فسانہ نہ آیا
بجھ گئے ہم تو چراغوں کا زمانہ نہ آیا

اے غمِ دہر ابھی اور نکھر اور نکھر
اتنا آساں تو نہیں ہے غمِ جاناں ہونا

ہزار جام تصدق، ہزار میخانے
تری نظر کی لطافت شراب کیا جانے

بدل دیا ہے کچھ اتنا خزاں نے چہروں کو
بہار آئے تو شاید ہمیں نہ پہچانے

عدم کے دوش پہ قائم ہے کائناتِ وجود
حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے

نصیب ہو نہ سکا جس کو اِن کا غم شاعر
وہ بدنصیب غمِ زندگی کو کیا جانے

کچھ عجب زندگی کے منظر ہیں
دور تک ریت کے سمندر ہیں

میری ہی روشنی کا پیکر ہیں
چند شکلیں جو دل کے اندر ہیں

دل جو ٹھہرے تو کچھ سراغ ملے
قرض کس کس نظر کے ہم پر ہیں

خامشی خود ہے ایک گہرائی — چُپ ہیں جو لوگ وہ سمندر ہیں
دل پہ گزری ہے جانے کیا شاعرؔ — ریزہ ریزہ تمام نشتر ہیں

ہمیں سے ہے طلبِ جان و تن سمجھتے ہیں — ہم اُس نگاہ کا، ردِ سخن سمجھتے ہیں
ملا ہے راہبروں سے ہمیں شعور اتنا — کہ کم سے کم نگہِ راہ زن سمجھتے ہیں
یہ اپنا ظرفِ نظر ہے کہ ہم نگاہ کو بھی — ترے جمال کا اک پیرہن سمجھتے ہیں
چمن پہ تیرا تصرف سہی مگر گلچیں — انھیں نہ چھیڑ جو رنگِ چمن سمجھتے ہیں

جینے کا سماں ہے خواب جیسا — دریا ہے یہاں سراب جیسا
ہنگامہ وہ شہر میں نہیں ہے — اس دل میں ہے اضطراب جیسا
مدت سے جو مجھ میں جل رہا ہے — چہرہ ہے وہ آفتاب جیسا
ہے اُس کے نقاب کا وہی رنگ — ہے رنگ ترا نقاب جیسا
کانٹے کی طرح چبھا ہے دل میں — اک شخص کہ ہے گلاب جیسا
اتنا تو بُرا نہ تھا میں شاعرؔ — دنیا نے کیا خراب جیسا

کون سی شکل چھُپی ہے مجھ میں — ایک خوشبو سی بسی ہے مجھ میں
تو نہیں ہے تو یہ ہوتا ہے گماں — جیسے میری ہی کمی ہے مجھ میں
اک نظر اس نے اٹھائی تھی کبھی — مدتوں شمع جلی ہے مجھ میں
مجھ کو گلزار کئے دیتی ہے — وہ جو اک آگ دبی ہے مجھ میں
اب مجھے نیند بھی آ جائے تو کیا — روشنی جاگ رہی ہے مجھ میں
اجنبی سی کوئی صورت شاعرؔ — راستہ بھول گئی ہے مجھ میں

کیا کہیے مفہومِ جنوں سے ہیں کتنے بیگانے لوگ — دیوانے کو ہوش کی باتیں آتے ہیں سمجھانے لوگ
آ جاتے ہیں پھر تو اضع دو اک پتھر گلیوں سے — مل جاتے ہیں ہر بستی میں کچھ جانے پہچانے لوگ
جلتی سانسیں، تپتے چہرے، ساکت ہونٹ، سلگتے دل — اُس محفل میں چپ رہ کر بھی کہتے ہیں افسانے لوگ
ذکرِ سرِ شوریدہ چھیڑو، دشتِ جنوں کی بات کرو — شہر کی رسمیں ہم کیا جانیں ہم تو ہیں دیوانے لوگ

کوئی ہے واعظ، کوئی ہے ناصح، دوست کوئی غمخوار کوئی
کیسے کیسے بھیس بدل کر آتے ہیں سمجھانے لوگ

کتنے سادہ، کتنے رنگیں، کتنے پیارے لگتے ہیں
روٹھے روٹھے، برہم برہم، بیگانے بیگانے لوگ

"ماہرِ فن" جو نکلے اُن کو عظمتِ فن کا تاج ملا
ہم تو اک فنکار تھے شاعرؔ ہم کو کب پہچانے لوگ

اپنا درد سمجھنے والے شہر کے اندر کتنے ہیں
ویرانی خود بول رہی ہے بستی میں گھر کتنے ہیں

ہم تو ہیں اک راہ کا پتھر، ہم کو ہے تسلیم مگر
دھوپ نکلنے دو تو کھُلے گا موم کے پیکر کتنے ہیں

جتنی تابِ زخمِ ہنر ہے اس سے زیادہ دادِ ہنر
کتنے پھل ہیں ایک شجر میں، ہاتھوں میں پتھر کتنے ہیں

یہ ہنستے ہونٹوں کے شگوفے، یہ کھلتے چہروں کے گلاب
آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہوں، خواب کے منظر کتنے ہیں

ہر معیارِ قامتِ فن کا ایک تناسب ہوتا ہے
مجھ سے بڑے تو سب ہیں لیکن میرے برابر کتنے ہیں

صبح بھی دستک دے کر پلٹی، شام بھی الٹے پاؤں پھری
اپنے گھر میں رہ کر شاعرؔ ہم سے بے گھر کتنے ہیں

ہوا کی موج میں گُل رنگیٔ افکار چھوڑ آئے
سرِ مقتل ہم اپنے عشق کا معیار چھوڑ آئے

چلے گھر سے تو پھر درپیش تھی صحرا کی ویرانی
وہاں بھی ہم اک احساسِ در و دیوار چھوڑ آئے

ترے کوچے سے نکلے تو نہ لمحہ تھا نہ پل کوئی
جہاں پر تھی وہیں ہم وقت کی رفتار چھوڑ آئے

ٹھہرنے کی کہاں ملتی ہے مہلت راہِ ہجرت میں
نہ جانے کتنے چہروں کو پسِ دیوار چھوڑ آئے

نہ ملتا نقدِ جاں دے کر بھی اک لمحہ محبت کا
گراں تھا اس قدر سودا کہ ہم بازار چھوڑ آئے

نئے منصور کو مل جائے رستہ اس لئے شاعرؔ
جلا کر اپنے خوں سے ہم چراغِ دار چھوڑ آئے

ہوا کو اور بھی کچھ تیز کر گئے ہیں لوگ
چراغ دے کے نہ جانے کدھر گئے ہیں لوگ

کوئی جواب نہیں فکر کی بلندی کا
زمیں پہ رہ کے بھی افلاک پر گئے ہیں لوگ

کبھی کبھی تو جدائی کی لذتیں دے کر
رفاقتوں میں نیا رنگ بھر گئے ہیں لوگ

قریب تھے تو فقط واسطہ تھا آنکھوں سے
جُدا ہوئے ہیں تو دل میں اُتر گئے ہیں لوگ

یہ اور بات کہ گھر بجھ گئے ہیں اے شاعرؔ
مگر وطن میں چراغاں تو کر گئے ہیں لوگ

ملال کیوں ہو مجھے دل پہ زخم سہنے کا
کہ زخم ہی تو نشاں ہے مرے قبیلے کا

ہزار درد کے رشتے، ہزار پیار کے رنگ
حیات نام نہیں صرف سانس لینے کا

ابھی ہے پھول، ابھی آئنہ، ابھی مہتاب
ذرا ذرا میں بدلتا ہے رنگ چہرے کا

جمال و رنگِ مہ و سال کا تو ذکر ہی کیا
ادا نہ ہم سے ہوا قرض ایک لمحے کا

میں بوئے گل نہ سہی گردِ کارواں ہی سہی
مجھے ہے شوق ہمیشہ سفر میں رہنے کا

شکستِ زیست کو کافی ہے ایک ضربِ نفس
بنا ہوا ہے یہ سارا طلسم شیشے کا

ہوئی ہے جس سے ملاقات آج اے شاعرؔ
یہ شخص تو مرا دیکھا ہوا ہے پہلے کا

خرد تو گمراہ ہو چکی ہے جنوں کو اب رہنما کریں گے
جہاں پہ ہے انتہائے منزل وہاں سے ہم ابتدا کریں گے

محبت اک سوزِ مشترک ہے ہم اسکی تشریح کیا کریں گے
نگاہ و دل کا معاملہ ہے، نگاہ و دل فیصلا کریں گے

قریب آتا ہے وہ زمانہ ہنسے گا بجلی پہ آشیانہ
جہاں کا ہر ذرّہ برق ہوگا وہاں نشیمن بنا کریں گے

لہو بہانے کے بعد ہوتی ہے حاصل اک سرخیٔ فسانہ
خزاں کے جھونکوں سے ڈرنے والے چمن کی تعمیر کیا کریں گے

ہے اک طرف جام کی تمنّا تو اک طرف ہے خیال توبہ
ذرا گھٹاؤں کا رنگ دیکھیں تو پھر کوئی فیصلا کریں گے

مٹائے دنیا ہزار شاعرؔ مگر صداقت رہے گی روشن
چراغِ کاشانۂ محبت بجھیں گے پھر بھی جلا کریں گے

خدا کرے کہ پھر ان تک کبھی نہ جام آئے
جو میکدے میں گئے اور تشنہ کام آئے

عجیب چیز تھا اُس زلف و رُخ کا منظر بھی
پلٹ پلٹ کے کئی بار صبح و شام آئے

فسانہ جب کبھی پامالیٔ چمن کا چھڑا
زبانِ گل پہ خود اہلِ چمن کے نام آئے

رَوا نہیں ہے مسلسل سکوتِ میخانہ
کبھی کبھی تو صدائے شکستِ جام آئے

خیالِ نکہتِ گیسو میں کچھ خبر نہ ہوئی
سُنا ہے بادِ صبا کے بہت سلام آئے

کہیں پہ رنگ، کہیں روشنی، کہیں آواز
نظر سے تا بہ نظر سیکڑوں مقام آئے

عجیب چیز ہے یہ میکدہ بھی اے شاعرؔ
سُبک خیال گئے اور سُبک خرام آئے

پھول کی صورت کھل اٹھتے ہیں شمع کی صورت جلتے ہیں
موسمِ گل میں ہم دل والے کیا کیا روپ بدلتے ہیں

سورج کب کا سر سے گزرا دیواروں تک دھوپ گئی
لیکن شب کی گود کے پالے اب تک آنکھیں ملتے ہیں

بستی ہو یا ویرانہ، یکساں ہے رفتارِ جنوں
جائیں جدھر بھی ہم دیوانے ساتھ بیاباں چلتے ہیں

خندۂ گل کے دیکھنے والے کچھ اس پر بھی غور کریں
کتنے غنچے شاخ سے گر کر پہروں دھوپ میں جلتے ہیں

نکہت و رنگ کے سائے سائے عشق کی منزل آتی ہے
دار و رسن تک جانے والے گیسو گیسو چلتے ہیں

خاک بسر انسانوں میں بھی ملتے ہیں جینے کے سراغ
ویرانوں کی تہہ کھودو تو کتنے شہر نکلتے ہیں

غیر ہمارا حال سمجھ لیں کب ممکن ہے اے شاعرؔ
خود ہم کو معلوم نہیں ہے بجھتے ہیں یا جلتے ہیں

سوئے میخانہ ہم جو چلتے ہیں
حادثے اپنا رُخ بدلتے ہیں

اک نظر تجھ کو دیکھنے کے لیے
کتنے آئینے ہاتھ ملتے ہیں

ہیں عجب چیز آرزو کے چراغ
جب ہوا تیز ہو تو جلتے ہیں

منصفوں کے سوا کسے معلوم
کس طرح فیصلے بدلتے ہیں

ہم اکیلے سفر نہیں کرتے
راستے ساتھ ساتھ چلتے ہیں

دشت بے رنگ ہو تو دیوانے
شہر کی سمت آ نکلتے ہیں

اہل دل بھی عجیب ہیں شاعرؔ
پھول کو زخم سے بدلتے ہیں

وہی مزاجِ مشیت کا رُخ بدلتے ہیں
جو حادثوں کو سہارا بنا کے چلتے ہیں

نہ مل سکے گا کبھی ان کو منزلوں کا سراغ
جو ہر قدم پہ نئے کارواں بدلتے ہیں

سلام کرتی ہیں بڑھ بڑھ کے گردشیں کیا کیا
ذرا سی دیر کو بھی ہم اگر سنبھلتے ہیں

سجے سجائے شبستاں کی روشنی پہ نہ جا
یہ دیکھ کتنے گھروں میں چراغ جلتے ہیں

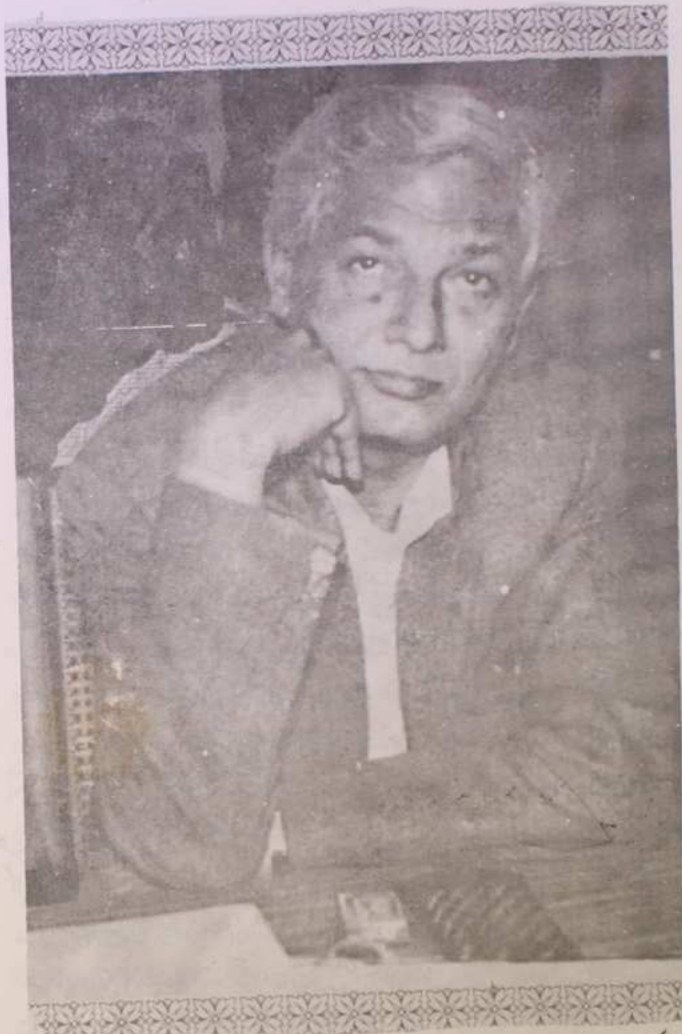
تمام عمر کی قربت کے باوجود اکثر
نگاہ و دل میں بڑے فاصلے نکلتے ہیں

ازل سے "دھوپ" بنی ہے مسافروں کے لیے
ہزار راہ میں سایہ ہو پھر بھی جلتے ہیں

وہ دل دہی کو تو آئے ہیں لیکن اے شاعرؔ
ہم اہلِ درد سکوں سے کہاں بہلتے ہیں

••

شہریار



کنور اخلاق محمد خاں شہریار (پ، ۱۶ر جون ۱۹۳۶ء

عکسِ تحریر

غزل

شہریار

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

بچھڑے لوگوں سے ملاقات کبھی پھر ہوگی
دل میں امید تو کافی ہے یقیں کچھ کم ہے

اب جدھر دیکھیے لگتا ہے کہ اس دنیا میں
کہیں کچھ زیادہ ہے کہیں کچھ کم ہے

آج بھی ہے تری دوری ہی اداسی کا سبب
یہ الگ بات کہ پہلے سی نہیں کچھ کم ہے

شہریار

نام: کنور اخلاق محمد خاں　　　　تاریخ پیدائش: ۱۶؍ جون ۱۹۳۶ء

قلمی نام: شہریار　　　　تعلیم: ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

۱۹۵۵ء سے شاعری کی ابتدا کی۔ اسکول کے زمانے میں کھیل کود سے زیادہ دلچسپی تھی اور اسکول کے مقابلوں میں امتیاز حاصل کیا۔ زمانہ طالب علمی میں شعبہ اردو کی انجمن "انجمن اردوئے معلیٰ" کا سکریٹری اور علیگڑھ میگزین کا ایڈیٹر رہا۔ ایم۔ اے۔ کے فوراً بعد چند ماہ لکچرر اور ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۵ء تک انجمن ترقی اردو ہند میں لٹریری اسسٹنٹ کے فرائض انجام دیے۔ "ہماری زبان" اور "اردو ادب" کی ترتیب کا کام بنیادی فرض تھا۔ ۱۹۶۶ء میں شعبہ اردو میں لکچرر مقرر ہوا۔

مجموعوں کے نام:- • اسم اعظم ۱۹۶۵ء • ساتواں در ۱۹۷۰ء • ہجر کے موسم ۱۹۷۸ء • خواب کا در بند ہے ۱۹۸۵ء • قافلے یادوں کے (دیوناگری) ۱۹۸۶ء۔

• سہ ماہی شعر و حکمت کا معاون مدیر تین سال تک • پندرہ روزہ خیر و خبر کا ادبی مشیر تین سال تک • اتر پردیش اردو اکیڈمی اور بہار اردو اکیڈمی نے "ساتواں در" اور "خواب کا در بند ہے" پر انعام دیئے • عالمی شاعری میلے (دہلی) میں شرکت کی • فیسٹول آف انڈیا کے سلسلے میں پیرس میں ہندوستانی شاعری کے میلے میں اردو کی نمائندگی کی ۱۹۸۵ء • کوی بھارتی یعنی ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کی شاعری کے اجتماع میں اردو کی نمائندگی کی ۱۹۸۷ء • مسقط اور قطر اور پاکستان کے مشاعروں میں شرکت کی • علی گڑھ کے سابق طلبا کی تنظیم (واشنگٹن) کی دعوت پر امریکہ کا ایک ماہ کا دورہ کیا۔ واشنگٹن، سان فرانسسکو، اٹلانٹا، شکاگو، بوسٹن اور نیویارک کے مشاعروں میں شرکت کی ۱۹۸۵ء • اٹلی میں عالمی ادبی اجتماع میں اردو کی نمائندگی کی ۱۹۸۷ء • ساہتیہ منچ جالندھر، ادبی سنگم نیویارک، لائنس کلب علی گڑھ نے ادبی خدمات کا اعتراف کیا • ۱۹۸۳ء میں ریڈر مقرر ہوا • انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، مراٹھی، اڑیا، بنگالی میں شاعری کا ترجمہ ہو چکا ہے • بعض صوبوں کے نصابات میں کلام شامل ہے • این، سی۔ آر۔ ٹی کے اردو نصابات کی تیاری میں معاونت کی ہے • ہندوستانی شاعری کے انتخابات کی قومی کمیٹی (ساہتیہ اکاڈمی) کے اردو کی انتخابی کمیٹی کا رکن ہوں • بیس سال کی اردو شاعری کا انتخاب (ساہتیہ اکاڈمی) گوپی چند نارنگ صاحب کے ساتھ کیا ہے • گمن، امراؤ جان، فاصلے، انجمن اور جرنہ خاتون کے فلمی نغمے لکھے • ہندوستان کے تمام اہم ٹی وی اور ریڈیو اسٹیشنوں کے مشاعروں میں شرکت کی • کئی رسالوں نے خصوصی گوشے شایع کیے ہیں • ادبی کیریر میں خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کا بہت اہم رول ہے • مختلف

انجمنوں اور تنظیموں نے فلم امراؤ جان کے گانوں پر انعام دیئے • ن۔م۔ راشد کے فن اور فکر پر مبنی تبسم کے اشتراک سے ایک کتاب مرتب کی • کئی طلبا کی تحقیق کی نگرانی کر رہا ہوں۔ ایک کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری مل چکی ہے۔ ایک ایم۔ فل کا مقالہ جمع کر چکا ہے، دوسروں کا کام بھی تسلی بخش رفتار سے ہو رہا ہے۔

شہریار

انتخابِ کلام

اک کرن نور کی مانگی تھی سزا اس کی ہے ۔۔۔ جو نظر آتا ہے ہر سمت اندھیرا ایسا

اس ہتھیلی میں بہت سی دستکیں روپوش ہیں ۔۔۔ اس گلی کے موڑ پر اک گھر تھا کل تک کیا ہوا

آتی کسی کو راس شہادت حسین کی ۔۔۔ دنیا میں ہم کسی کو تو سیراب دیکھتے

راتوں کو جاگنے کے سوا اور کیا کیا ۔۔۔ آنکھیں اگر ملی تھیں کوئی خواب دیکھتے

ہوا تو کہاں ہے زمانے ہوئے ۔۔۔ سمندر کے پانی کو ٹھہرے ہوئے

جہاں جایئے ریت کا سلسلہ ۔۔۔ جدھر دیکھئے شہر اجڑے ہوئے

بڑا شور تھا جب سماعت گئی ۔۔۔ بہت بھیڑ تھی جب اکیلے ہوئے

ترے ہی کہنے پہ میں نے یہ عمارت دل کی ۔۔۔ بڑی مشکل سے بڑے شوق سے بنوائی تھی

کیسا منظر تھا کہ زنجیر ہوئیں آوازیں ۔۔۔ اور مخلوق خدا ساری تماشائی تھی

اب وہ سفر کی تاب نہیں باقی ورنہ ۔۔۔ ہم کو بلاوے دشت سے جب تب آتے ہیں

کاغذ کی کشتی میں دریا پار کیا ۔۔۔ دیکھو ہم کو کیا کیا کرتب آتے ہیں

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونیکا ۔۔۔ کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا

برہنہ جسم بگولوں کا قتل ہوتا رہا ۔۔۔ خیال بھی نہیں آیا کسی کو رونے کا

صلہ کوئی نہیں پرچھائیوں کی پوجا کا ۔۔۔ مآل کچھ نہیں خوابوں کی فصل بونے کا

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو ۔۔۔ میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

میں جس کو لکھنے کے ارمان میں جیا اب تک ۔۔۔ ورق ورق وہ فسانہ بکھر گیا یارو

پہلے نہائی اوس میں، پھر آنسوؤں میں رات ۔۔۔ یوں بوند بوند اتری ہمارے گھروں میں رات

یہ کیا ہوا کہ طبیعت سنبھلتی جاتی ہے ۔۔۔ ترے بغیر بھی یہ رات ڈھلتی جاتی ہے

یہ دیکھو آ گئی میرے زوال کی منزل ۔۔۔ میں رک گیا مری پرچھائیں چلتی جاتی ہے

طویل ہونے لگی ہیں اسی لیے راتیں ۔۔۔ کہ لوگ سنتے سناتے نہیں کہانی بھی

عشق کہیے کہ ہوس اس کی بدولت کچھ ہے
راکھ کے ڈھیر میں چنگاری کی صورت کچھ ہے

تیز آندھی میں اندھیروں کے ستم سہتے رہے
رات کو پھر بھی چراغوں سے شکایت کچھ ہے

آج کی رات میں گھوموں گا کھُلی سڑکوں پر
آج کی رات مجھے خوابوں سے فرصت کچھ ہے

جُستجو جس کی تھی اُس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

سب کا احوال وہی ہے جو ہمارا ہے آج
یہ الگ بات کہ شکوہ کیا تنہا ہم نے

عمر بھر سچ ہی کہا سچ کے سوا کچھ نہ کہا
اجر کیا اس کا ملے گا یہ نہ سوچا ہم نے

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تا حدِّ نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

یہ قافلے یادوں کے کہیں کھو گئے ہوتے
اک پل بھی اگر بھول سے ہم سو گئے ہوتے

اے شہر ترا نام و نشاں بھی نہیں ہوتا
جو حادثے ہونے تھے اگر ہو گئے ہوتے

ہر بار پلٹتے ہوئے گھر کو یہی سوچا
اے کاش کسی لمبے سفر کو گئے ہوتے

ہم خوش ہیں ہمیں دھوپ وراثت میں ملی ہے
اجداد کہیں پیڑ بھی کچھ بو گئے ہوتے

کس منہ سے کہیں تجھ سے سمندر کے ہیں حقدار
سیراب سرابوں سے بھی ہم ہو گئے ہوتے

کارِ دنیا سے فرومایہ محبت نکلی
اہلِ دل میں بھی بہت جینے کی حسرت نکلی

تم کہو زیست کو کس رنگ میں دیکھا تم نے
زندگی اپنی تو خوابوں کی امانت نکلی

ابتدا عشق سے افسانۂ ہستی کی ہوئی
انتہا اس کی مگر صرف مروّت نکلی

جوئے خوں آنکھوں سے ہم نے بھی بہائی لیکن
کم ہوا بوجھ ہی دل کا نہ کدورت نکلی

پھر کوئی منزلِ بے نام بلاتی ہے ہمیں
رہنمائی کے لیے دھوپ کی شدّت نکلی

پاس کی چیزوں پہ دوری کے دھندلکے چھائے
بچھڑے لوگوں سے ملاقات کی صورت نکلی

زندگی بھیس نئے شام و سحر بدلا کی
آنکھ کا کام تھا بس دیکھنا سو دیکھا کی

رنگِ وحشت سے سبھی رنگ بہت دھندلے تھے
شہر کا خاکہ تھا، تصویر بنی صحرا کی

قطرۂ اشک سے آنکھوں کا بھرم باقی ہے
چھین لے آئے نہ اس کو بھی ہوا دنیا کی

پیاس کا کیا تھا سرابوں سے بجھا سکتی تھی
یاد آتی رہی ہر آن مگر دریا کی

تازہ پھر خوشۂ گندم سے پشیمانی ہو
دل میں ہر شخص نے جینے کی ہوس پیدا کی

خموش رہنا ہے اے اہلِ درد یوں کب تک
رگِ گلو میں چبھے گی یہ موجِ خوں کب تک

بہت دنوں سے گزرگاہِ خواب سونی ہے
سرائے شام یہاں اور میں رکوں کب تک

کسی نے کھول دیئے بادبان یادوں کے
تجھے پکاروں کہاں تک صدائیں دوں کب تک

ہر ایک شخص پہ تیرا گمان ہوتا ہے
یہ دیکھنا ہے کہ رہتا ہے یہ جنوں کب تک

اب جدھر دیکھئے لگتا ہے کہ اس دنیا میں
کہیں کچھ چیز زیادہ ہے کہیں کچھ کم ہے

دل میں اترے گی تو پوچھے گی جنوں کتنا ہے
نوکِ خنجر ہی بتائے گی کہ خوں کتنا ہے

آندھیاں آئیں تو سب لوگوں کو معلوم ہوا
پرچمِ خواب زمانے میں نگوں کتنا ہے

جمع کرتے رہے جو اپنے کو ذرہ ذرہ
وہ یہ کیا جانیں بکھرنے میں سکوں کتنا ہے

وہ جو پیاسے تھے سمندر سے بھی پیاسے لوٹے
ان سے پوچھو کہ سرابوں میں فسوں کتنا ہے

ایک ہی مٹی سے ہم دونوں بنے ہیں لیکن
تجھ میں اور مجھ میں مگر فاصلہ یوں کتنا ہے

آندھیاں آتی تھیں، لیکن کبھی ایسا نہ ہوا
خوف کے مارے جدا شاخ سے پتا نہ ہوا

رُوح نے پیرہنِ جسم بدل بھی ڈالا
یہ الگ بات کسی بزم میں چرچا نہ ہوا

رات کو دن سے ملانے کی ہوس تھی ہم کو
کام اچھا نہ تھا انجام بھی اچھا نہ ہوا

وقت کی ڈور کو تھامے رہے مضبوطی سے
اور جب چھوٹی تو افسوس بھی اس کا نہ ہوا

خوب دُنیا ہے کہ سورج سے رقابت تھی جنھیں
اُن کو حاصل کسی دیوار کا سایا نہ ہوا

کھُلے جو آنکھ کبھی، دیدنی یہ منظر ہیں
سمندروں کے کناروں پہ ریت کے گھر ہیں

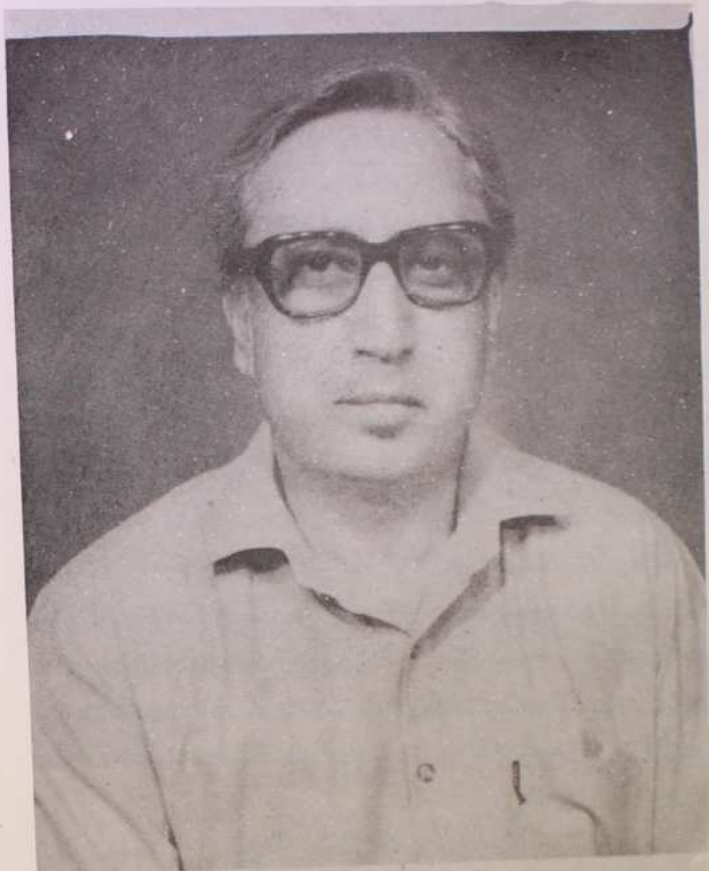
نہ کوئی کھڑکی، نہ دروازہ واپسی کے لیے
مکانِ خواب میں جانے کے سیکڑوں در ہیں

گلاب ٹہنی سے ٹوٹا زمین پر نہ گرا
کرشمے تیز ہوا کے سمجھ سے باہر ہیں

کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا سراب سب کا ہے
سبھی ہیں پیاس کے مارے سبھی برابر ہیں

حسین ابنِ علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

شہزاد احمد



شہزاد احمد　　　　پ ۱۹۳۲ء

عکسِ تحریر

غزل

وہ چاند سورج کچھ نہیں، کچھ اور منظر چاہیے
یعنی ذرا سی روشنی پیچھے کے اندر چاہیے

جب سب تماشا ہو چکا، تب یہ سمندر نے کہا
کس کس کو ہے میری طلب، کس کس کو گوہر چاہیے

اٹھی ہوئی دیوار نے سورج کی کرنیں چھین لیں
بڑھتی ہوئی آبادیو مجھ کو ذرا گھر چاہیے

اک گھونٹ ہے اک جام ہے یہ تشنگی مٹتی نہیں
میں ماہیٔ بے آب ہوں مجھکو سمندر چاہیے

ہر حال سے بیزار ہوں، اس حال میں کب تک رہوں
جس سے پلٹ کر رو سکوں، ایسا ستمگر چاہیے

شہزاد احمد

شہزاد احمد

نام : شہزاد احمد' تخلص شہزاد' پورا نام شہزاد احمد ہی لکھتا ہوں۔ ۱۶ اپریل ۱۹۳۲ء میں امرتسر میں پیدا ہوا۔ میرے والد ڈاکٹر حافظ محمد بشیر شروع ہی سے سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے اسی باعث ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے حادثے میں ان پر بغاوت کا الزام عائد کیا گیا اور پھانسی کی سزا سنا دی گئی' جو بعد میں معاف کر دی گئی ۱۹۳۸ء میں ان کا انتقال ہوا تو ضلع امرتسر مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری تھے۔ وہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے اور انھوں نے اُردو زبان میں طبی موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھی تھیں' سرجری' ہیضہ' تپ دق' شباب (مردوں کے جنسی مسائل) اور معاون نسواں ان کی چند کتابوں کے عنوانات ہیں' میرے دو بڑے بھائی شیخ محمد یوسف (مرحوم) اور شیخ احمد سعید موسیقی اور ادب میں خصوصی شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ گھر میں ایک علمی اور ادبی فضا موجود تھی۔

۱۹۴۷ء میں جو فسادات ہوئے اس کے نتیجے میں ہم نے ہجرت کی اور پاکستان آگئے' جب سے اب تک زیادہ وقت لاہور ہی میں گذرا ہے۔ شاعری کی ابتدا تو امرتسر ہی سے ہو چکی تھی مگر تقسیم برصغیر نے اس شاعری کو آگے بڑھنے کے لیے بے شمار موضوعات عطا کر دیے۔ پہلا غزلیات کا مجموعہ صدف' ۱۹۵۸ء میں دوسرا مجموعہ 'جلتی بجھتی آنکھیں' ۱۹۷۰ء میں' تیسرا مجموعہ 'ادھ کھلا دریچہ' ۱۹۷۷ء میں اور چوتھا مجموعہ خالی آسمان ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں فرائیڈ کے جبلت مرگ کے نظریے کے بارے میں ایک کتاب بعنوان 'مذہب' تہذیب' موت' شائع ہوئی پھر ۱۹۸۶ء میں تخلیقی رویے کے عنوان سے منطق اور سائنس کے بارے میں ایک کتاب کا ترجمہ شائع ہوا۔ مندرجہ ذیل کتابیں اس وقت زیرِ طبع ہیں :

(۱) ذہن کا حیاتیاتی پس منظر (۲) سائنسی انقلاب (یقین سے امکان تک) (۳) دوسرا رخ (مضامین) (۴) بکھر جانے کی رُت (پانچواں مجموعہ کلام)

پہلا ایم اے (نفسیات) ۱۹۵۳ء میں کیا' دوسرا ایم اے (فلسفہ) ۱۹۵۵ء میں' دونوں ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیے' روزگار کے سلسلے میں متنوع قسم کے کام کیے اس میں فلم' ٹیلیویژن' سائیکل سازی کی صنعت

روٹی کا رپورٹر شامل ہیں، آجکل لندن سے شائع ہونے والے تیسری دنیا کے مجلے ساؤتھ سے منسلک ہوں۔

انتخاب کلام

نہ نقش پائے تمنا، نہ کاروانِ حیات — تمہارے بعد سرِ رہگذار کچھ بھی نہیں
بکھرے ہوئے تاروں سے مری رات بھری ہے — یہ نور ہے یا نور کی دریوزہ گری ہے
ابھی سے ہاتھ گریباں کی سمت اٹھتے ہیں — ابھی تو پیرہن گل بھی پارا پارا نہیں

کوئی آہٹ بھی نہ سُن پائے گا خواب نہ چمن — خشک پتّوں سے دبے پاؤں گذر جائے گی رات
شام ہی سے سو گئے ہیں لوگ آنکھیں موند کر — کس کا دروازہ کھلے گا کس کے گھر جائے گی رات
دل و نگاہ کا یہ فاصلہ بھی کیوں رہ جائے — اگر تو آئے تو میں دل کو آنکھ میں رکھ لوں

یہ رات وقت کے زنداں سے جب نکلتی ہے — قدم ستاروں کے سینے پہ رکھ کے چلتی ہے
لٹے ہوئے مرے دل میں یہ آرزو تیری — کوئی نہیں ہے یہاں اور شمع جلتی ہے

اب بھی ہم دور سے سُن لیتے ہیں چھاگل کی صدا — بند دروازوں سے آجاتی ہے مانوس کھنک
ابھی آیا بھی نہیں تو، مگر اس عالم میں — دل یہ پڑتی ہے ابھی سے ترے پاؤں کی دھمک
کبھی دل سے نہ گیا ترکِ محبت کا خیال — جاوداں ہو گئی ٹوٹے ہوئے تارے کی چمک
آنکھ میں چبھنے لگے شام کے گہرے سائے — ہم نے دیکھی نہ گئی ڈوبتے سورج کی جھلک

دل تو آئینہ ہے، آئینے کی صورت کیسی؟ — تو جسے دیکھ رہا ہے وہ ترا سایہ ہے
شعر کے روپ میں لاتے ہوئے گھبراتا ہوں — ہائے وہ غم جسے بچوں کی طرح پالا ہے

مرجاتی ہیں ننھی منھی روحیں — رکتا نہیں زندگی کا دریا
اپنے بھی کنارے چاٹتا ہے — غم خوار نہیں کسی کا دریا
ہے مصر سا ریگزار یہ دل — اور نیل خود آگہی کا دریا

اڑا لے گئی دھوپ پھولوں کے رنگ — چمن میں صبا چیختی رہ گئی
اگرچہ وہ صورت ستارہ نہ تھی — دلوں میں مگر روشنی رہ گئی
نہیں دل میں کچھ حسرتوں کے سوا — یہی ایک محفل جمی رہ گئی

دامن زندگی میں ہیں کونسے حادثات ابھی — دور گئی گذر گئے، اور کٹی نہ رات ابھی

ذرّے کے نور کی کرن تختِ خلا کو چھو گئی
پھر بھی نگاہِ خلق میں تیرہ ہے کائنات ابھی

روح کی واردات سے شہر کو آشنا نہ کر
خاک پہ روشنی نہ ڈال خاک ہے بے صفا ابھی

کیسے گذر سکیں گے زمانے بہار کے
چپ ہو گیا ہوں موسمِ گل کو پکار کے

یا میری زندگی میں اجالا کرے کوئی
یا پھینک دے کہیں یہ ستارے اتار کے

اب نہ وہ شور نہ وہ شور مچانے والے
خاک سے بیٹھ گئے خاک اڑانے والے

یہ الگ بات میسر لبِ گویا نہ ہوا
دل میں دھوم کہ سنتے ہیں زمانے والے

اب ساتھ نہ دے پائیں گے ٹوٹے ہوئے بازو
اڑتے ہوئے لمحوں سے مری ہم سفری ہے

بلند ہوں تو کبھی پستیاں نہ دیکھیں گے
خود اپنے ہاتھ سے ہم توڑ دیں گے زینے کو

یہ اور بات اسے زندگی نہ کہہ پائیں
دگر نہ آج بھی ہم جی رہے ہیں جینے کو

باغ کا باغ اجڑ گیا کوئی کہو پکار کر
کس نے شفق پہ مل دیے پھولوں کے رنگ اتار کر

شام کو موجِ ہوا جانبِ دشت لے اڑے
صبح، چمن میں آ گئے خاک پہ شب گذار کر

پاس ہی منزلِ مراد خاک میں تھی چھپی ہوئی
راہ میں پابریدہ لوگ بیٹھ چکے تھے ہار کر

مری نگاہ میں رہتے ہیں خاک کے ذرّے
مقامِ شکر کہ آنکھیں مری ستارہ نہیں

ترس گئی ہے زباں خاک چاٹنے کیلیے
ہر ایک سمت سمندر کہیں کنارہ نہیں

چلو جدائی کے صدمے قبول ہی کر لیں
اگر یہی ہے زمانہ تو کوئی چارہ نہیں

شوقِ نظارہ بھی ہے حسرتِ دیدار کے ساتھ
ہم تو سائے سے لگے بیٹھے ہیں دیوار کے ساتھ

یہ دل کا شہر مشکل سے بسا تھا
چلو اس شہر میں اب خاک اڑائیں

کبھی شورِ قیامت سے کھُلے آنکھ
کبھی پتّا ہلے اور چونک جائیں

اب یہ عالم ہے کہ بیتی ہوئی برساتوں کی
اپنے ہی جسم سے بو آتی ہے سودائی کو

نیند آتی ہے اگر جلتی ہوئی آنکھوں میں
کوئی دیوانے کی زنجیر ہلا دیتا ہے

دیکھنا اس کا نگاہِ غلط انداز کے ساتھ
یہ وہ لمحہ ہے جو ذرّوں کو ضیا دیتا ہے

دلِ تنہا کو اگر فرصتِ ہنگامہ ہے
محفلیں گوشۂ صحرا میں سجا دیتا ہے

کسی دیار، کسی دشت میں صبا لے جا
میں مشتِ خاک ہوں مجھ کو کہیں اڑا لے جا

تھکن ہزار سہی حوصلہ نہ ہارا ابھی
قدم اٹھیں نہ اٹھیں دل مگر سنبھالے جا

وہ فسانہ کہ جسے کہہ نہ سکے آنسو بھی
خشک ہونٹوں کے تبسم سے بیاں کیا ہوگا

ہم جہاں بیٹھے ہیں شہزادؔ وہ ویرانہ ہے
ہم جہاں خاک اڑائیں گے وہاں کیا ہوگا

بیچ کر آنکھیں خریدے ہیں یہ آنسو ہم نے
مول اس جنس کا اب اور گراں کیا ہوگا

ایک عالم سے ہوا دل غافل
شاید آ پہنچی ہے میری منزل

دل میں قدموں کے نشاں صاف نظر آتے ہیں
آخر اس منزلِ برباد میں کون آیا ہے

اجنبی شہر میں مانوس سے چہرے جیسے
کسی بھولے ہوئے نغمے کی صدا آتی ہے

ایک بوسے کی حرارت سے دمکتا ہے بدن
زندگی ایک شرارے سے بقا پاتی ہے

جا چکے وہ ہو چکا افسانۂ مستی تمام
ہاتھ ملنا رہ گیا ہے اب ہمارے ہاتھ میں

اک ستارہ دو گھڑی چمکا، چمک کر سو گیا
روشنی سی دیر تک باقی رہی لمحات میں

موتیے کی باس، تارے کی چمک، رسوں کا رنگ
دو جہاں کی لذتیں ہیں پیار کی اک بات میں

خیال ہے کہ نہ گذرے گی اب فراق کی رات
اگر یہ رات گذر بھی گئی تو کیا ہوگا

لٹے ہوئے دلوں میں ہے تمہاری یاد جس طرح
کبوتروں کے گھونسلے جلے ہوئے مکان میں

نہ دل کو چین مل سکا نہ رات ہی گذر سکی
کسی نے جیسے سی دیا ہو چاند آسمان میں

صبح کا تارا بھی گردوں پر فروزاں ہو چکا
میری آنکھوں میں فروزاں ہے چراغِ شام بھی

کب تلک بیتے ہوئے لمحوں کے غم میں روئیے
اب تو پتھر ہو گیا دل سا سبک اندام بھی

جو گھٹا چھائی ہے دل پر ایک دن چھٹ جائیگی
رفتہ رفتہ بھول جائے گا تمہارا نام بھی

بے شعوروں کی طرح سنتے ہیں دل کی بات ہم
چھوڑ دیں گے، گر سمجھ میں آ گیا یہ کام بھی

اپنی آواز کو خود سن کے لرز جاتا ہوں
کسی سائے سے مری ہم سخنی ہو جیسے

روح کے زخم کا مرہم بھی ہے جلتا آنسو
آگ بھی تو اسی شعلے نے لگا رکھی ہے

رات کا جسم ہے تاروں کی حدوں کے اندر
باہر اک نور ہے اک عالمِ تنہائی ہے

اس راہ سے گذرے تھے کبھی اہلِ نظر بھی
اس خاک کو چہرے پہ ملو آنکھ میں ڈالو

تلخ ہوتا ہے بہت خونِ جگر کا ذائقہ
اپنے شعروں سے مجھے نفرت بھی ہے اور پیار بھی

دلِ فسردہ اسے کیوں گلے لگا نہ لیا   قریب رہ کے بھی جس نے ترا پتا نہ لیا
بس ایک لمحے میں کیا کیا کچھ گذر گئی دل پر   بحال ہوتے ہوئے ہم نے اک زمانہ لیا
تمام عمر ہوا پھانکتے ہوئے گذری   رہے زمیں پہ مگر خاک کا مزا نہ لیا

دل میں وہ آباد ہے جس کو کبھی چاہا نہ تھا   چور سے ڈرتے تھے، لیکن گھر کا دروازہ نہ تھا
شاخ کی آنکھیں خزاں کے رتجگے سے چور تھیں   برگ کے سینے میں دل تھا جو ابھی دھڑکا نہ تھا
میری آنکھوں میں ہیں وہ جلتے ہوئے بیتاب دن   خلق سایہ مانگتی تھی اور خدا سنتا نہ تھا

کوئی احساس، جسے صبح سے تعبیر کریں   کوئی امکان کہ یہ رات گذرنے پائے
دل سلگتا ہی رہا، آنکھ پگھلتی ہی رہی   دشت کو دھوپ ملی آنکھ تے جھرنے پائے
کبھی ماتھے پہ رہی اور کبھی آنکھوں میں   کیا مقامات مری گردِ سفر نے پائے

جی بھر کے ہم نے لطفِ ستم تو اٹھا لیا   نامہرباں رہے تو بڑے مہرباں رہے

بجھ گئے آج سلگتی ہوئی یادوں کے چراغ   یوں سکوں آیا ہے جیسے کوئی طوفاں آئے

کانپتے ہونٹوں پہ ہاں آئی مگر مشکل کے ساتھ   اس نے پیمانِ وفا باندھا، مگر کس دل کے ساتھ

دن چڑھے چند سوکھی ہوئی پتیاں ہی نظر آئیں گی   شاخساروں میں یہ جگنوؤں کی ضیا رات کی رات ہے

گذر ہی جائے گا روزِ فراق بھی آخر   کسی طرح شبِ امید تو ٹھکانے لگی

تھمے ہیں اشک تو خوں آگیا ہے آنکھوں میں   تڑپ گیا ہوں طبیعت اگر سنبھالی ہے

تمام عمر کی بے چارگی کا حاصل ہے   وہ حادثہ جو تمہارے قریب لائے مجھے
میں آفتاب کی منزل تلاش کرلوں گا   کوئی ستارہ اگر راستہ دکھائے مجھے

بریت بنا، جگ سونا سونا پریت کیے دکھ ہوئے   جیون ہی جب روگ بنا، من جیسے چاہے روئے
بوند بوند ہو ہو کے لہو سب انگ انگ سے ٹپکا   سیج سیج پر کانٹے ہم نے کروٹ کروٹ بوئے

چندا چمکے اور بدری میں تارے چھپ چھپ جائیں   جیسے چنچل کومل ناریں پیتم سے شرمائیں
چاند رات میں دکھیارا من چونک چونک کر جاگے   شیتل کرنیں پور پور میں بجلی سی بھر جائیں

نگاہِ دوست سے کیا کیا توقعات نہ تھیں   نگاہِ دوست میں لیکن سپردگی، نہ گریز

تری تلاش تو کیا، تیری آس بھی نہ رہے   عجب نہیں کہ کسی دن یہ پیاس بھی نہ رہے

آخرِ شب وہ آندھیاں اٹھیں ــــ دور تک اڑ گیا غبار اپنا
ہم اور گمانِ بد گمانی ــــ یہ خاک اڑی ادھر سے پہلے
جانے لگا تو جی سے گیا راہِ عشق میں ــــ آنے لگا تو آپ میں آیا نہ جا سکا
کچھ نہ کچھ فیصلہ، بیم و رجا ہونے دے ــــ اے تمنا مجھے بے تاب نہ کر آج کی رات
درمیاں پردۂ آدابِ وفا حائل ہے ــــ ورنہ تسکیں نہ ادھر ہے نہ ادھر آج کی رات
ہم سے درد کے ماروں کی مجبوری کیا، مختاری کیا ــــ جینا اور نہ مرنا لیکن، عمر بسر کرتے جانا
کھل کر بھی نہیں روتا میرا دلِ دیوانہ ــــ آتے بھی نہیں اس کو اندازِ شکیبائی
جل بھی چکے پروانے، ہو بھی چکی رسوائی ــــ اب خاک اڑانے کو بیٹھے ہیں تماشائی
راتوں کی اداسی میں خاموش ہے دل میرا ــــ بے حس ہیں تمنائیں نیند آئی کہ موت آئی
اک شام وہ آئے تھے، اک رات فروزاں تھی ــــ وہ شام نہیں لوٹی، وہ رات نہیں آئی

("حدت" سے انتخاب)

میں بھی شامل ہوں ترے شہر کی آبادی میں ــــ اب کہاں تک تری دیوار کا سایہ جائے
اتنے سنسان تو جنگل بھی نہیں ہوتے تھے ــــ جی میں آتا ہے، بہت شور مچایا جائے
گھل گیا پانی میں مٹی کی طرح چاند کا عکس ــــ گدلے پانی کا عجب شعبدہ دیکھا میں نے
جھپکی تھی میں نے آنکھ کہ منظر بدل گیا ــــ لمحہ گزر گیا کہ زمانے گزر گئے
آتی ہے مرے کان میں پھر پاؤں کی آہٹ ــــ دروازۂ دل کس نے کھلا دیکھ لیا ہے
ابھی تو دن ہے، خدا جانے رات تک کیا ہو ــــ اس آفتاب نے سایہ بنا دیا ہے مجھے
گلہ یہی ہے فقط اپنی داستاں سے مجھے ــــ وہ ٹوک دیتے ہیں ہر بار درمیاں سے مجھے
میں سوچتا ہوں یہ آواز بھی مری تو نہیں ــــ صدائیں دیتا ہے اک شخص کارواں سے مجھے
بلا رہا ہے مجھے بار بار اسی کی طرف ــــ خدا نے پھینک دیا تھا جس آسماں سے مجھے
ٹھہر گئی ہے طبیعت اسے روانی دے ــــ زمیں پیاس سے مرنے لگی ہے پانی دے
تمام خلقِ خدا دیکھتی ہے حیرت سے ــــ کوئی نہیں جو ترے حسن کو معانی دے
گو اس نے مری آگ پہ شبنم نہیں ڈالی ــــ لیکن مجھے چپ چاپ سلگنے تو دیا ہے

فرق آچکا دلوں میں گھڑی فیصلے کی ہے — کیا بے تعلقی نہیں بہتر نباہ سے

مخلوق چیختی ہے کہ تھم جائے یہ بلا — دریا پکارتا ہے کہ رفتار دیکھیے

نہ ملے وہ تو تلاش اس کی بھی رہتی ہے مجھے — ہاتھ آنے پہ جسے چھوڑ دیا جاتا ہے
دیکھنے والوں کو احساس تحیّر بھی نہیں — ایسے عالم میں تو سر پھوڑ لیا جاتا ہے
جہاں پڑتی ہو فقط اپنی صدا کانوں میں — وہ جگہ کوئی ہو، ویرانہ کہا جاتا ہے

آنکھ وہ قیدی کہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں — دل وہ دیوانہ کہ زندانوں میں بھی آزاد ہے
سوچتا ہوں میں کہ کچھ کہنے سے آخر فائدہ؟ — وہ سمجھتے ہیں کہ خاموشی بھی اک روداد ہے

سُن لو تو فصلِ گل کی تمنّا نہ کر سکو — جو داستان کہتے ہیں پتے جھڑے ہوئے

پہچان لیا پھر بھی بلایا نہ کسی نے — دیوانے پہ پتھر بھی اٹھایا نہ کسی نے

تو نور ہے کہ جسم ہے کچھ سوجھتا نہیں — پیکر ہے روشنی کا، کہ پیکر کی روشنی

ممکن ہو آپ سے تو بھلا دیجیے مجھے — پتھر پہ ہوں لکیر، مٹا دیجیے مجھے

رفتار ہے ایسی کہ ٹھہرتی نہیں آنکھیں — ہے چرخ بھی چکر میں، ستارہ بھی رواں ہے

جو اپنے نام سے میں نے جہاں میں پھیلائی — ملی تھی مجھ کو وہ خوشبو ترے پسینے سے
تمہاری یاد نے سینے کو کر دیا روشن — چمک اٹھا ہے یہ گھر ایک ہی نگینے سے

رسوائے شہر اب تری عزت اسی میں ہے — پگڑی اتار کر، سرِ بازار پھینک دے

وہ خاک اڑے گی کہ نہ دیکھی نہ سُنی ہو — دیوانہ تو کیا چیز ہے، صحرا نہ رہے گا
کیوں بلاتی ہے مجھے دنیا اسی کے نام سے — کیا مرے چہرے پہ اس کا نام ہے لکھا ہوا

رات بھلی ہے، اس میں کچھ بھی دیتا نہیں دکھائی — دن کی دھوپ میں دشمن ہوتا ہے سائے کا سایہ

تھا میں بھی مجبور مگر میں نے تو بھیک نہ مانگی — تیرا دامن کھینچ لیا ہے، جب بھی ہاتھ بڑھایا

تیرے گھر کی بھی وہی دیوار تھی، دروازہ تھا — پھر وہی باتیں ہوئیں جن کا مجھے اندازہ تھا

اب اس کی دھجیوں میں چھپاتے ہیں کائنات — وہ پیرہن کہ اپنے بدن پر بھی تنگ تھا

مت دیکھ تمنا کی طرف آنکھ اٹھا کر — اندھوں کی طرح نور کے دریا سے گزر جا
میں نے چراغ سے بھی جلایا نہیں چراغ — میں کوئی بات تجھ سے بھی سن کر نہ کہہ سکا

تیری نوا میرے لیے تصویر بن گئی
اک بوند کی زبان پہ شہزاد آ گئی

میں تیرے جسم کو تیرا پیکر نہ کہہ سکا
وہ بات جس کو سارا سمندر نہ کہہ سکا

فرق کیا باقی رہا آنکھیں اگر کھلا گئیں
لیک آنسو نے ڈبو دی عمر بھر کی آبرو
فاصلے ایسے ہوئے قائم کہ مٹتے ہی نہیں
آ گئے شہزاد جب جاگی ہوئی آنکھوں تلک

آسمانوں سے زمیں تک ایک منظر ہو گیا
ہم جسے قطرہ سمجھتے تھے سمندر ہو گیا
دو گھڑی مل بیٹھنا امکاں سے باہر ہو گیا
چاندنی پانی ہوئی اور چاند پتھر ہو گیا

اب یہاں کچھ نہیں سوکھے ہوئے پتوں کے سوا
ہر نئے زخم کا احساس بھی اک دولت ہے
جیسے انجم کسی خورشید کو تشکیل کریں

ہم نہیں تھے تو گلستاں میں چلی لُو کیا کیا
اس مصیبت میں ہیں آرام کے پہلو کیا کیا
مجھے دیکھا تو طبیعت ہوئی یکسو کیا کیا

ہم ترے عشق کے مشہور کریں گے قصّے
بند کر لی ہیں جسے دیکھ کے آنکھیں شہزاد

اور کچھ بھی نہ سہی دھیان تو بٹ جائیگا
وہی لمحہ مری آنکھوں سے چمٹ جائیگا

اک دُوری کو تکتا ہے اک دُور سے آنے والا
ہر پل میں لاکھوں تصویریں ہر لمحہ اک دنیا

تیرے چہرے پر آنکھیں میرے پاؤں پر چھالا
کتنے عالم کھو دیتا ہے آنکھ جھپکنے والا

چراغ خود ہی بجھایا، بجھا کے چھوڑ دیا
ہزار چہرے ہیں موجود آدمی غائب
نہ سہی کچھ مگر اتنا تو کیا کرتے تھے

وہ غیر تھا — اسے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
یہ کس خرابے میں دنیا نے لا کے چھوڑ دیا
وہ مجھے دیکھ کے پہچان لیا کرتے تھے

خاک ہیں اب تری گلیوں کی وہ عزت والے
اب تو انسان کی عظمت بھی کوئی چیز نہیں

جو ترے شہر کا پانی نہ پیا کرتے تھے
لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے

چونکتا کوئی نہیں اب مرے نوحے سُن کر
کوئی اس شخص کی تنہائی کا اندازہ کرے

نہیں معلوم یہ آواز کہاں جاتی ہے
جسے ذرّے میں بھی تصویر نظر آتی ہے

جنگل ہے راستے میں نہ بن راستے میں ہے

مٹی کا زرد سانولا پن راستے میں ہے

اک لمحۂ سکوں نہیں میرے نصیب میں
پھرتا ہوں دشت دشت میں بے لذتِ طلب

دونوں جہاں میں دل کی بلا میرے ساتھ ہے
سنسان جنگلوں کی ہوا میرے ساتھ ہے

تنہا روی بھی خوب نہیں راہِ عشق میں
دل کچھ بھی ہے بُرا کہ بھلا میرے ساتھ ہے

سو گیا رات کی تاریکی میں روتے روتے
آئے گی صبحِ درخشاں تو مجھے ڈھونڈے گی

عمر بھر ایک ہی تصویر رہی آنکھوں میں
کتنے آرام سے گزری ترے سودائی کی

شاعری اس کے سوا کیا ہے کہ اس دنیا میں
آپ بھی خوار ہوئے تیری بھی رسوائی کی

رنگ تھا میں تو کیوں زمیں مجھ سے ہوئی نہ لالہ زار
خاک تھا میں تو کس لیے نہ اڑی ہوا مجھے

کبھی مل بیٹھنا بھی طبعِ نازک پر گراں ہو گا
زیادہ رابطہ اچھا نہیں ہم سخت جانوں سے

مجھے شہزاد نادیدہ مناظر یاد آتے ہیں
کوئی آواز دیتا ہے گئے گزرے زمانوں سے

دیوار کس طرف سے بڑھے کچھ خبر نہیں
ہے بے شمار شہروں میں جنگل گھرا ہوا

چلتی ہے زیرِ دشت بھی پانی کی ایک لہر
آتا ہے شہر میں بھی ہرن ناچتا ہوا

بے برگ و بار خود کو سمجھتا رہا تھا میں
جب جل بجھے درخت تو کچھ حوصلہ ہوا

ڈرتا ہوں میرے سر پہ ستارے نہ آ پڑیں
چلتا ہوں آسماں کی طرف دیکھتا ہوا

دن نکلتے ہی وہ خوابوں کے جزیرے کیا ہوئے
صبح کا سورج مری آنکھیں چرا کر لے گیا

اس نے تو ان موتیوں پر خاک بھی ڈالی نہیں
آنکھ کی تھالی میں، دل آنسو سجا کر لے گیا

پتھر نہ پھینک، دیکھ ذرا احتیاط کر
ہے سطحِ آب پر کوئی چہرہ بنا ہوا

گر ہے مسافروں کی یہی پا شکستگی
چلنا بھی، آپ اپنے قدم ناپتا ہوا

آنکھ سے اوجھل نہ ہونے پائی تھی سورج کی لاش
شام کے وقت آسماں جیسے کوئی شمشان تھا

رات سر پر آ چکی تھی نیند سے بوجھل تھا جسم
پاؤں ڈھیلے پڑ چکے تھے، راستہ ڈھلوان تھا

ہر طرف حدِ نظر تک، خاک تھی اڑتی ہوئی
دشت کا ہر پھول تھوڑی دیر کا مہمان تھا

(جلتی بجھتی آنکھیں سے انتخاب)

چپ کے عالم میں وہ تصویر سی صورت اس کی
بولتی ہے تو بدل جاتی ہے رنگت اس کی

وہ کہیں جان نہ لے ریت کا ٹیلہ ہوں میں
میرے کاندھوں پہ ہے تعمیر عمارت اس کی

تجسس شرط، کنجِ عافیت تو دل میں ہوتا ہے
جہاں ہم رات کو سوتے ہیں گھر اس کو نہیں کہتے

یہ دیواریں اور دروازے سب آنکھوں کا دھوکا ہے
کہنے کو ہر باب کھلا ہے اور کھلا کوئی بھی نہیں

چہرے جانے پہچانے تھے روحیں بدلی بدلی تھیں
سب نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ملا کوئی بھی نہیں

جس کے بیچ گھرا بیٹھا ہوں ڈھیر ہے بیتے لمحوں کا
سب میری جانب آتے ہیں اور گیا کوئی بھی نہیں

ملے بھی وہ تو ہے ذکر اس سے موسم کے
خبر نہیں مجھے آئے گا حال کب کہنا

یہ کیا کہ شام و سحر روز ایک جیسے ہوں
یہ دائرہ ہے اسے زندگی نہ اب کہنا

چراغ لے کے کہیں ڈھونڈتا ہیں سورج کو
میں اپنا فرض سمجھتا ہوں شب کو شب کہنا

کھل چکی ہیں اس کے گھر کی کھڑکیاں میرے لیے
رُخ مری جانب رہے گا بے رخی جیسی بھی ہے

اب کہاں لے جائیں سانسوں کی سلگتی آگ کو
زندگی ہے زندگی اچھی بری جیسی بھی ہے

کچھ اور بھی وہ حسین ہو گیا خفا ہو کر
مزے لیے مری آنکھوں نے بے مزا ہو کر

یہ نور نور ہے جاگیر تو کسی کی نہیں
الجھ پڑا ہوں میں خورشید سے دیا ہو کر

جواز کوئی اگر میری بندگی کا نہیں
میں پوچھتا ہوں تجھے کیا ملا خدا ہو کر

یہ زندگی ہے کہ بارش ہے سنگریزوں کی
میں ٹوٹ پھوٹ گیا اس میں مبتلا ہو کر

میں سنگِ میل نہیں ہوں نشانِ عبرت ہوں
پڑا ہوں راہ میں تسخیر نارسا ہو کر

میں اس کی آس میں تھا اب کواڑ کھولے ہوئے
گذر گیا وہی لمحہ گریز پا ہو کر

مجھے تلاش تھی جس کی وہ شخص ہی نہ رہا
بدل گیا وہ میرے غم سے آشنا ہو کر

تصویر کے خطوط نگاہوں سے ہٹ گئے
میں جس کو چومتا تھا وہ کاغذ ہی پھٹ گئے

انسان اپنی شکل بھی پہچانتا نہیں
آ آ کے آئینوں سے پرندے چمٹ گئے

کس شوق سے وہ دیکھ رہے تھے ہجوم کو
جب میں نظر پڑا تو دریچے سے ہٹ گئے

اتنا بھی وقت کب تھا کہ پتوار تھام لیں
ایسی چلی ہوا کہ سفینے الٹ گئے

پابندیاں تو صرف لگی تھیں زبان پر
محسوس یہ ہوا کہ مرے ہاتھ کٹ گئے

شہزاد پھر سے رخت سفر باندھ لیجیے
رستے بھی سوکھ جائیں گے بادل تو چھٹ گئے

واسطہ مجھ کو خدایا نہ پڑے لوگوں سے
چھوٹی باتوں کی توقع ہے بڑے لوگوں سے

راہ چلتی کوئی لڑکی کہ سگِ آوارہ
کون محفوظ ہے رستے میں کھڑے لوگوں سے

یہ الگ بات کہ لوگوں میں ہے شامل تو بھی
تیری خاطر بھی کئی بار لڑے لوگوں سے

گر نہ مل سکے موتی درد کے سمندر سے
اپنے رشتۂ جاں میں سنگ ہی پرولیں گے

یہ سمجھ کے مانا ہے سچ تمہاری باتوں کو
اتنے خوبصورت لب جھوٹ کیسے بولیں گے

لمحہ لمحہ مری حالت کی خبر رکھتا ہے
جان کر بھی وہ مری سمت نہ تکنے والا

دن کو گلدانوں میں اور رات کو خوابوں میں ہے
وہ ہے اک پھول شب و روز مہکنے والا

ہر لحظہ اک سوال نیا میرے سامنے
فارغ میں آج تک نہ ہوا امتحان سے

چہرہ جسے پلٹ کے بھی میں دیکھتا نہیں
شاید عزیز ہے مجھے سارے جہان سے

چیزیں تھیں کیا کہ مجھ کو چکا چوند کر گئیں
میں کچھ خرید کر نہیں نکلا دکان سے

شہزاد جس شکار کا میں منتظر رہا
دیکھا اسے تو تیر نہ نکلا کمان سے

نظر کے سامنے ہے خلد کی فضا پھر سے
زمیں پہ نہ کہیں پھینک دے خدا پھر سے

وہ آ چکا ہے، مجھے جس کا انتظار نہ تھا
خبر نہ تھی درِ دل ہے کھلا ہوا پھر سے

امید کی یہ کرن دل میں کس لیے پھوٹی
نئی رتوں نے یہ کیا گل کھلا دیا پھر سے

بجھا بجھا ہی سہی، دل تو اپنے آپ میں تھا
چراغ جان کے اس نے جلا دیا پھر سے

وہ جا چکا تو پلٹ آئی میری بینائی
وہ جانتا تو مجھے مڑ کے دیکھتا پھر سے

میں اس کی راہ کی دیوار بن گیا شہزاد
یہ سوچ کر کہ اگر وہ چلا گیا پھر سے

دل سے امیدیں نگاہوں سے ضیا لے جائیگا
جاتے جاتے وہ مرے گھر کا دیا لے جائیگا

دیکھیے سورج کی آنکھوں میں نہ آنکھیں ڈال کر
اک کرن بھیجے گا. بینائی چرا لے جائیگا

میں تو شبنم ہوں مری قسمت میں ہے پیاسی زمیں
تو تو خوشبو ہے، تجھے جھونکا اڑا لے جائیگا

کچھ نہیں شہزاد تو ترک تعلق ہی سہی
کب تلک اس فیصلے کو کل پہ ٹالے جائیگا

ہم اس لڑائی کو شرط ادب سمجھتے ہیں
وہ سامنے بھی اگر آ گیا ملیں گے نہیں

پہاڑ سی نظر آتی ہے مجھ کو باقی عمر
ترے بغیر تو یہ روز و شب کٹیں گے نہیں

جو ہم نے دیکھا ہے، لفظوں میں کیسے آئیگا
جو نقش دل میں ہیں وہ ریت پر بنیں گے نہیں

ریزہ ریزہ کرچوں میں تصویروں کے انبار
کس کا چہرہ دیکھ کے وہ آئینہ ٹوٹ گیا

اس کے دم سے یکتائی تھی لیکن اس کے بعد
موسم ایک نہیں ہو پایا اندر باہر کا

آخر کوئی پڑھ ہی لے گا رسوائی کی تحریریں
یہ میرے چہرے کی لکیریں کچھ جیتیں کچھ ماتیں ہیں

نیند کا پنچھی آ پہنچا ہے وحشی دل کی بات نہ سن
مل بھی گئے تو آخر تھک کر گہری نیند ہی سونا ہے

ابھی تو خشک بہت ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے
ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

خود ساختہ دیوار سے باہر بھی نہ جھانکو
معصوم ہو تم، لوگ ہیں سب اور طرح کے

مجبور بھی بندوں کو خداؤں نے بنایا
تخلیق کیے ہم نے بھی رب اور طرح کے

مشکل ہے کہ اندازہ ہو اس شخص کا شہزاد
الطاف جداگانہ غضب اور طرح کے

اک لمحہ میں دل پر وہ کچھ بیت گئی
جسے بتاتے ایک زمانہ لگتا ہے

روز نئے دکھ دیتی ہے دنیا شہزاد
اندر مجھے ہر درد پرانا لگتا ہے

شام کو سورج جب ستانے لگتا ہے
پتہ پتہ شور مچانے لگتا ہے

شام کی لالی دریا میں بہہ جاتی ہے
پانی اپنے رنگ دکھانے لگتا ہے

پہلے میں دیتا ہوں خود کو آوازیں
پھر سارا جنگل دہرانے لگتا ہے

سفرِ شوق ہے بجھتے ہوئے صحراؤں میں
آگ مرہم ہے مرے پاؤں کے چھالوں کے لیے

اپنی ہی ذات کے ذروں میں سمٹ آیا ہوں
دو جہاں تنگ ہوئے جب مرے نالوں کے لیے

تنگ اپنی ہی ذات پہ ہونے لگتا ہے
اپنی باتیں دوسروں سے جب سنتے ہیں

جینا ہم کو ویسے بھی کب آتا تھا
بدل گئے ہیں جینے کے ڈھب سنتے ہیں

سنتے ضرور ہیں دنیا والے بھی شہزاد
کہنے کی خواہش نہ رہے تب سنتے ہیں

ہمارا جرم یہ ہے، ہم نے کیوں انصاف چاہا تھا
ہمارا فیصلہ کرنے کئی بیداد گر بیٹھے

کہاں تک خانۂ دل اب میں تیری خیر مانگوں گا
ذرا سیلاب آیا اور ترے دیوار و در بیٹھے

میسر پھر نہ ہوگا چلچلاتی دھوپ میں چلنا
یہیں کے ہو رہو گے سائے میں اک پل اگر بیٹھے

فضا میں گرد کے ذروں کی صورت ناہم معلق ہیں
نہ اڑنے کی تمنا کی نہ فرشِ خاک پر بیٹھے

اڑی ہے خاک یادوں کی امیدوں کی ارادوں کی
یہ مٹی تھی کہ بجھتی راکھ پر ہم پاؤں دھر بیٹھے

فصلِ گل خاک ہوئی جب تو صدا دی تو نے
اے گلِ تازہ بہت دیر لگا دی تو نے

تیری خوشبو سے مرے دل میں کھلے درد کے پھول	سو گئی تھی جو بلا پھر سے جگا دی تو نے
زندگی بھر مجھے جلنے کے لیے چھوڑ دیا	سبز پتوں میں یہ کیا آگ لگا دی تو نے
کوئی صورت بھی رہائی کی نہیں رہنے دی	ایسی دیوار پہ دیوار بنا دی تو نے

چیخ کر نکلے ہزاروں خواہشوں کے قافلے	دشتِ دل میں دیر دروازے کے وا ہونے کی تھی

تو نے خود ترکِ تعلق کی قسم کھائی تھی	اور ہم نے تو فقط بات نباہی تیری
پرکشش جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب دھوکا ہیں	خاک میں حسن، فقیری میں ہے شاہی تیری

اس کے دل میں بھی جگہ میں نے بنا لی شہزادؔ	سنگ پر ثبت کیا نقشِ کفِ پا میں نے

تابندہ تر فضا ہو کہ منظر دھواں دھواں	اس شہر میں تو بند ہی رہتی ہیں کھڑکیاں
یہ اور بات ایک قدم ہم نہ چل سکیں	سنتے ہیں اس زمین کی وسعت ہے بیکراں
آیا نہیں وہ لمحۂ روشن گرفت میں	اس کشمکش میں ٹوٹ گئیں میری انگلیاں
کیا جانے کیا اُگے کہ لہو کی ہیں بارشیں	بھیگی ہوئی زمین ہے اور خشک آسماں
میں آئینہ تھا ٹوٹ گیا تیرے ہاتھ سے	کیوں تیرے ہاتھ میں نہ چبھیں میری کرچیاں
اک زلزلے سے کوہ کی بنیاد ہل گئی	شہزادؔ مجھ کو پست لگیں یہ بلندیاں

مثالِ موج تڑپنا تھا خوار ہونا تھا	نہ ڈوبنا تھا نہ دریا کے پار ہونا تھا
پکارنے کی بھی خواہش تمام عمر رہی	پکار کر بھی اسے شرمسار ہونا تھا
تلاش کرنی تھی اک روز اپنی ذات مجھے	یہ بھوت بھی مرے سر پر سوار ہونا تھا

آگ سے پھول چنوں ریت سے گوہر لاؤں	لا تو سکتا ہوں مگر کس کے کہے پر لاؤں

ابھی لوٹا نہیں دن کا مسافر	اندھیرا ہو چکا کھڑکی کھلی ہے
بہا کر لے گیا سیلاب سب کچھ	فقط آنکھوں کی ویرانی بچی ہے

اگرچہ دونوں طرف تیرگی کے جنگل ہیں	گذر کے بادِ سحر درمیاں سے آئے گی

مرے پاؤں ہیں زمیں پر کہ ہوا پہ چل رہا ہوں	ہے سفر، تو کوئی آہٹ مرے کان تک بھی آئے
مری اپنی ذات حائل مری راہ میں ہوئی ہے	مجھے تیرا آئینہ بھی مرا عکس ہی دکھائے
وہ شجر ہے میں ہوا ہوں مرا اس کا ساتھ کیسا	وہ اسیرِ آب و گل ہے مرے ساتھ کیسے آئے

کبھی میرے خوں کی سُرخی ترے ہونٹ بن گئی ہے — کبھی تو نے اپنے آنسو مری آنکھ میں چھپائے
مرے دل پہ ہاتھ رکھ کر شبِ ہجر سو گئی ہے — درِ دل کی کوئی دستک اسے نیند سے جگائے

تو چاند ہے ترے ہمراہ میں چلوں کیسے — تھکا ہوا ہوں سفر رات کا کروں کیسے
فصیلِ شب نہیں ٹوٹی کرن نہیں پھوٹی — امیدِ صبح گئی جاگتا رہوں کیسے

ہر دم تری شبیہ تھی آنکھوں کے سامنے — تنہا بھی ہم نہیں تھے، ترے ساتھ بھی نہ تھے

کوئی رشتہ نہیں آواز کا تصویر کے ساتھ — شکر ہونٹوں پہ رہا اور گلہ آنکھوں میں
جوش میں آئے بہالے گئے دریا اس کو — ایک صحرا کہ سمٹتا ہی نہ تھا آنکھوں میں

پیار کا وہی انداز عمر کا وہی آغاز — گرچہ ہیں ملاقاتیں اس سے ایک مدت کی
اپنے بند کمرے میں میں پگھلتا جاتا ہوں — رات کو نکل آئی دھوپ کس قیامت کی
یاد جب بھی کرتا ہوں ہونٹ جلنے لگتے ہیں — دوڑتے لہو میں ہیں گرمیاں رفاقت کی
میں ہوا کا جھونکا سا اپنے آپ میں گم تھا — یہ خلاصی تنہائی آپ نے عنایت کی
اہلِ زر نہیں ہم لوگ گہری نیند سوتے ہیں — دن ہزار لمحوں کا رات ایک ساعت کی

("آدھ کھلا دریچہ" سے انتخاب)

بنے گی اب ورقِ شب پہ کون سی تصویر — ستارے ڈوب چلے آسمان خالی ہے

دیکھ اب اپنے ہیولے کو فنا ہوتے ہوئے — تو نے بندوں سے لڑائی کی خدا ہوتے ہوئے
دیکھتے رہتے ہو سب کچھ بولتے کچھ بھی نہیں — کس قدر بے درد ہو درد آشنا ہوتے ہوئے

زمین پھیلتی جاتی ہے آسماں کی طرح — میں تھک کے بیٹھ گیا ہوں کہ یہ سفر ہے بہت
ہیں سنگ سنگ میں پوشیدہ کتنی تصویریں — میں کیا کروں کہ مرا ہاتھ بے ہنر ہے بہت
ملے بھی وہ تو نئی بات کیا سناؤں اسے — وہ میرے حال سے پہلے ہی باخبر ہے بہت

پھر مجھے نادیدنی زنجیر پہنائی گئی — علم تک مجھ کو نہیں اور میرا سودا ہو چکا

جس کو عبرت کا نشاں ہم نے بنا رکھا ہے — کل اسی پیڑ سے اک شاخ ہری نکلے گی

آنکھ عجیب قریہ ہے بے چراغ رہتا ہے — دل عجیب گنبد ہے بند ہے سدا اس میں
مدتوں سے آنسو بھی آنکھ سے نہیں ٹپکا — ہم نے ایک دریا کو خشک کر دیا اس میں

رچ گئی ہے کمرے میں کچھ ملی جلی خوشبو
ایک تو ہوں میں موجود اور کون تھا اس میں

لاج رکھ لیتے ہیں میری مُنہ پہ کچھ کہتے نہیں
دشمنی کا کچھ سلیقہ تو مرے پیاروں میں ہے

کون سی شئے اسے جانے نہیں دیتی دل سے
آخر اس اجڑے ہوئے گھر میں سلامت کیا ہے

ہے مجھ کو آرزو جس کی کبھی وہ موج تو اٹھے
وہ میری جان بھی مانگے مجھے انکار کیا ہوگا

عجیب رنگ کا وہ پھول تھا کہ پھر نہ ملا
ہر ایک رنگ میں اس کی شباہتیں ہیں بہت

میں چاہتا ہوں حقیقت پسند ہو جاؤں
مگر ہے اس میں یہ مشکل حقیقتیں ہیں بہت

کبھی کبھی چھلک اٹھتا ہے آب ورنگ ان کا
وگرنہ دشت تو سوکھے ہوئے سمندر ہیں

جو تیری یاد میں گذرے وہی پل زندگی ٹھہرے
بظاہر ساری گھڑیاں سارے لمحے ایک جیسے ہیں

بنا لیے نئے رستے نمو کی لہروں نے
زمیں وہیں کی وہیں ہے درخت سوکھ گیا

آباد ہوئے محل تو شہزاد
کتنے ہی گھر اُجڑ گئے ہیں

لمحہ لمحہ نئی مسافت
صدیوں سے طویل ان کے جادے

ہے جس کا ثمر ستارۂ صبح
وہ فصل بھی خاک میں اگا دے

اشجار کو رکھ بلند شہزاد
شاخوں کو زمیں پر جھکا دے

دھوکا رہِ طلب کا مجھے نقشِ پا نہ دے
دل اس سراب میں بھی سفینہ بہا نہ دے

بپھرا ہوا سیاہ سمندر مرا حریف
چلتی ہوئی ہوا بھی مجھے راستہ نہ دے

دی ہے اگر امنگ تو پھر رنگ بھی دکھا
بے سود عمر بھر کا مجھے جاگنا نہ دے

دل ہی میں رہ نہ جائیں مری سب شکایتیں
وہ مجھ کو دیکھتے ہی کہیں مسکرا نہ دے

یوں بھی نہیں کہ پاؤں کی زنجیر ہے یہ گھر
موسم کا یا ہوا کا اشارہ کوئی تو ہو

لفظوں کی جستجو میں ہے سادہ ورق ابھی
اس خالی آسماں پہ ستارہ کوئی تو ہو

یہ کیا کہ دائرے میں کٹی ساری زندگی
مجھ رہ نوردِ شوق کا صحرا کوئی تو ہو

(خالی آسمان سے انتخاب)

سب پرندوں کی طرح محتاج بال و پر نہیں
جن کو اڑنا ہے وہ اڑتے ہیں ہوا کوئی بھی ہو

پھر بھی دعویٰ کیا میں نے شناسائی کا
راہ کے سنگ بھی پہچان چکے تھے مجھ کو

میں نے کیا پایا ہے اس پاؤں کی مٹی ہو کر
دل بے حوصلہ کیسے تجھے سمجھاؤں میں

عمر شہزاد اسے ڈھونڈتے گزری لیکن
حال یہ ہے کہ جہاں جاؤں اسے پاؤں میں

یہ سوچ کر اسے ملنا کہ جب ملو گے اسے
اگر وہ کچھ نہ کہے گا تو کیا کہو گے اسے

وہ روشنی کی طرح ہاتھ لے کے آئے گا
تمام عمر فقط ڈھونڈتے پھرو گے اسے

یہ اور بات کہ جی کا زیاں ہے اس میں بھی
مگر وہ کون ہے یہ جان تو سکو گے اسے

ابھی تو دھوپ میں جی بھر کے دیکھ لو اس کو
چراغ لے کے کہاں ڈھونڈتے پھرو گے اسے

وہ آگیا تو کب آؤ گے اپنے آپ میں تم
چلا گیا تو جدا کس طرح کرو گے اسے

وہ ایک خط کہ خزانہ بھی اور سانپ بھی ہے
جلا ہی دو گے، مگر یاد تو رکھو گے اسے

عجیب کیف سا ہے شام کی اداسی میں
وہ رت پھر آئی ہے کیا دیکھنے چلو گے اسے

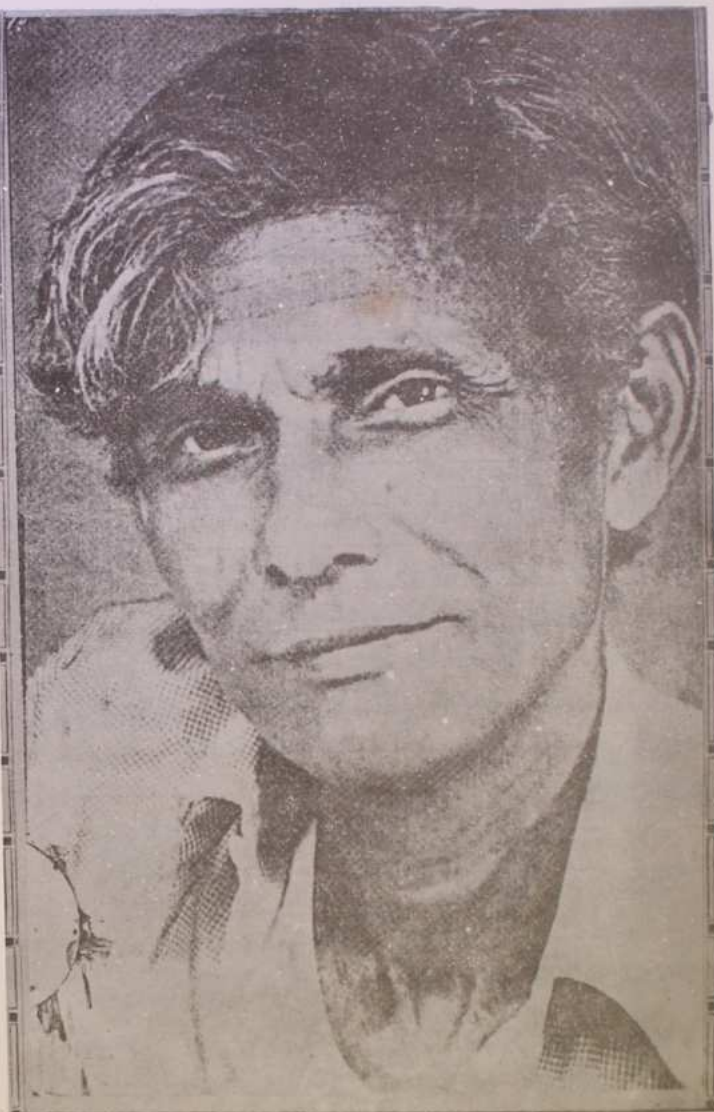
تھپک تھپک کے سلاتے ہو تم تمنا کو
کہ جیسے حشر تلک جاگنے نہ دو گے اسے

ہزار بار قلم ٹوٹ ٹوٹ جائے گا
جو بات دل میں ہے تم کس طرح لکھو گے اسے

ستارے جتنے ہیں کرتے ہیں ایک تال پہ رقص
وہ جانِ نغمہ سہی کس طرح سنو گے اسے

دل فسردہ بھی شہزاد کام کی شے ہے
خیال آئے گا جب خاک کر چکو گے اسے

ظفر گورکھپوری



ظفر گورکھپوری　　پ: ۵ مئی ۱۹۳۵ء

جب اتنی جلد اسے تم نے بجھا کے رکھی تھی
تو کیوں قریبِ ہوا شمع لا کے رکھی تھی

تمام عمر رہا دل کو ایک اندیشہ
نہ جانے کون سی دولت کما کے رکھی تھی

ذرا پھوار پڑی اور آبلے اُگ آئے
عجیب پیاس بدن میں دبا کے رکھی تھی

ذرا سی بھی نہ ٹھکانا کہیں دیا ہم کو
مکاں کی نیو زمیں سے ہٹا کے رکھی تھی

اگرچہ خیمۂ شب کل بھی تھا اداس بہت
کم از کم آگ تو ہم نے جلا کے رکھی تھی

وہ ایک گل تھا کہ ناشگفتگی بھی تھی اُس کی
اُسی سے آستیں ہم نے لگا کے رکھی تھی

یہ آسمان ظفرؔ ہم پہ بے سبب ٹوٹا
اُڑان کون سی ہم نے بچا کے رکھی تھی

ظفر گورکھپوری
۲۶ [illegible]

ظفر گورکھپوری

"نام ظفرالدین، تخلص ظفر۔ ۵ مئی ۱۹۳۵ء کو ضلع گورکھپور (یوپی) کی تحصیل بانس گاؤں کے ایک دیہات بیدولی بابو میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں بمبئی آ گیا تھا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ گاؤں واپس جانے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن:

باڑھ آئی تھی ظفر، ڈے گئی گھر بار مرا ۔۔۔ اب کسے دیکھنے جاؤں میں وطن بارش میں

زمانۂ طالب علمی میں اسکولوں کی غیر نصابی تحریکوں میں حصہ لینے اور بعض ادب کا ذوق رکھنے والے اساتذہ کی ہمت افزائیوں کے نتیجے میں ادب کا چسکا لگا۔ پہلے کچھ افسانے لکھے پھر شعر، پہلا شعر غالباً ۱۹۴۹ء میں کہا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں ترقی پسند تحریک میں شامل ہوا۔ فراق، بنے بھائی (سجاد ظہیر)، سردار، کیفی، کرشن چندر، مہندر ناتھ، ن۔ا۔ انصاری اور مجروح وغیرہ کے ساتھ ملا تو صلاحیتوں کو اور جلا ملی لیکن بہت جلد یہ سمجھ میں آ گیا کہ ادب کو کسی مخصوص نظریے کی تشہیر کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور نہ اسے ذاتِ مختصر کے دائرے کا اسیر ہونا چاہیے۔ تب سے دونوں کے درمیان اپنی راہ نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شعر گوئی کی ابتدا نظم سے ہوئی تھی۔ دو دہائیوں سے کچھ زیادہ ہی عرصے تک نظمیں کہتا رہا۔ لیکن جانے کیوں اِدھر چند برسوں سے غزل نے منہ موہ لیا ہے۔ اب تک تین شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ۱۔ تیشہ ۲۔ وادیٔ سنگ ۳۔ گوکھرو کے پھول۔ اس کے علاوہ جس قدر بن پڑا ہے، بچوں کا قرض بھی سر سے اتارا ہے۔ بچوں کے لیے دو بڑے مجموعے "ناچ ری گڑیا" اور "سچائیاں" شائع ہو چکے ہیں، بہت سے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔"

انتخابِ کلام

نیزے پہ رکھ کے اور مرا سر بلند کر ۔۔۔ دنیا کو اِک چراغ تو جلتا دکھائی دے

گھر میں پہنچوں گا تو سب گٹھری ٹٹولیں گے مری ۔۔۔ آنکھ میں چبھتی ہوئی گردِ سفر دیکھے گا کون

ہر آنے جانے والے کو کرنا پڑا سلام ۔۔۔ تا عمر اپنے گھر کا میں دربان ہی رہا

کم سے کم عشق تو کر سکتے ہو شاہوں کی طرح ۔۔۔ خط لکھو اور کبوتر کے حوالے کر دو

میں سچ ہوں شہر کے فٹ پاتھ پر ملوں گا کہیں ۔۔۔ مجھے خرید پرانی کتاب والوں سے

جو گن اب تم درشن دینے آئی ہو ۔۔۔ چاٹ گئی جب آنکھوں کی بینائی پیاس

ضمیرِ وقت میں پیوست ہوں میں پھانس کی صورت
زمانہ کیا سمجھتا ہے کہ آسانی سے نکلوں گا

مرا قلم، مرے جذبات مانگنے والے
مجھے نہ مانگ مرا ہاتھ مانگنے والے

یہ لوگ کیسے اچانک امیر بن بیٹھے
یہ سب تھے بھیک مرے ساتھ مانگنے والے

اٹھا سکے گا نہ سینے پہ یہ سیاہ پہاڑ
کچھ اور مانگ مری رات مانگنے والے

سکون دے گیا شاید انھیں کھلا میدان
خموش کیوں ہیں مکانات مانگنے والے

تو اپنے دشت میں پیاسا مرے تو اچھا ہے
سمندروں سے عنایات مانگنے والے

کچھ اپنے خون کی سُرخی کا اعتبار بھی کر
شفق سے رنگ کی خیرات مانگنے والے

کتنوں ہی کے سر سے سایہ جاتا ہے
جب اک پیپل کاٹ گرایا جاتا ہے

دھرتی خود بھی کھا جاتی ہے فصلوں کو
چڑیوں پر الزام لگایا جاتا ہے

آج ہی اس کے در پر ڈیرہ ڈالو گے؟
پہلے کچھ دن آیا جایا جاتا ہے

پیاسوں سے ہمدردی رکھی جاتی ہے
بادل اپنے گھر برسایا جاتا ہے

جب شخصیت آوازوں کی تابع ہو
بے مقصد بھی شور مچایا جاتا ہے

دل کے سو سو ٹکڑے جب ہو جاتے ہیں
تب تھوڑا سا درد گھٹایا جاتا ہے

چھوٹے بچے خواب خریدے جاتے ہیں
پیڑھی پیڑھی قرض چکایا جاتا ہے

بھائی ظفرؔ پہلے جیتو اُس کا وشواس
دھیرے دھیرے رنگ جمایا جاتا ہے

زندگی نے مجھے سوغات انوکھی دی ہے
تیشہ اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں سینی دی ہے

کون جانے کہ ہوس جسم سے کیا کیا لے جائے
چور کے ہاتھ میں صندوق کی کنجی دی ہے

کتنی آسانی سے مشہور کیا ہے خود کو
میں نے اپنے سے بڑے شخص کو گالی دی ہے

زندگی دی ہے مجھے آگ کے دریا کی طرح
پار اترنے کے لیے موم کی کشتی دی ہے

بے تحاشا میں ترے گھر کی طرف بھاگا ہوں
ان مشینوں نے ذرا دیر جو چھٹی دی ہے

کیسے بھیگے ہوئے ہاتھوں سے سنبھالو گے ظفرؔ
اس نے کاغذ پہ بنا کر تمھیں تتلی دی ہے

شجر کے قتل میں اس کا بھی ہاتھ ہے شاید
بتا رہا ہے یہ بادِ صبا کا چپ رہنا

نفرت کی جنگ پیار سے جیتی نہ جائے گی
کچھ زہر بھی رگوں میں اتر جانا چاہیے

میرا مکان جلانے میں ان کا بھی ہاتھ ہے
یوں ہی تو بدگمان نہیں پڑوسیوں سے میں

سالم تھا اپنے گاؤں کی کچی سڑک پہ میں
ٹکڑوں میں کس نے بانٹ دیا مجھ سے پوچھ

جدائی پی گئی بیوی کے رخساروں کی شادابی
میں خوشحالی لیے جب تک سمندر پار سے آتا

گھر کو پہنچے تھے ظفر صاحب کہ زخمی ہو گئے
منظر آنکھوں نے ایسا کھینچ کر مارا اب مجھے

ہمارے گھر میں شرافت کا بچپنا گذرا
ہوئی جوان تو راس آ گئی کمینوں کو

ماں نے اک بوسہ لیا تھا مرے ہونٹوں پہ ظفر
جانے وہ سکہ کہاں پھینک دیا ہے میں نے

میں خوشبوؤں کا ابر تھا دن پی گیا مجھے
میں نور کا شجر تھا مجھے کھا گئی ہے رات

سینہ ہو زخم زخم تو ڈھلتے ہیں کیسے گیت
فرصت اگر ملے تو کبھی بانسری سے پوچھ

نفرت کی تلوار سے مجھ کو اور کہاں تک کاٹو گے
میرا آنگن بانٹنے والو میرا غم کب بانٹو گے

میں بادل تھا مجھے تو بجلیاں ہونا تھا ویسے بھی
زمیں تجھ کو تو سبزے کا دوشالہ دے دیا میں نے

پتہ تو کچھ چلے اس کو خوشی بھی بوجھ ہوتی ہے
وہ ذرہ مانگنے آیا ہمالہ دے دیا میں نے

روشنی سر میں لیے پھرتے ہو دیوانے ہو
کبھی دیوار کسی در کے حوالے کر دو

زندہ ہے میری روح میں تیرا وجود بھی
تجھ کو بھی زخم آئیں گے پتھر نہ مار دوست

شناخت نام ہے شاید اسی اذیت کا
کہ پانیوں میں رہو رنگ بھی جدا رکھو

کسی معصوم بچے کے تبسم میں اتر جاؤ
تو شاید یہ سمجھ پاؤ خدا ایسا بھی ہوتا ہے

جب پیاس بجھانی ہی ٹھہری تو ظفر صاحب
دریا پہ تو پہرے ہیں مقتل کی طرف چلیے

اپنی پرچھائیاں ساتھ لیتے چلو
کیا ضروری وہاں کوئی برگد بھی ہو

تیری رحمت خدا کس کے گھر جائے گی
نیک لوگوں میں ہم سا کوئی بد بھی ہو

میں ظفر اپنے دکھ سکھ کی آواز ہوں
وہ نظریہ نہیں ہوں جو کل رد بھی ہو

وہ کاغذ کی ناؤ تمہاری کہو ظفر کیسے ڈوبی؟
تم تو یار بہت ماہر تھے ایسی ناؤ چلانے میں

زہر پچھلی نسلوں نے ہم سا کیا پیا ہوگا
اپنا جسم نیلا ہے ان کے کنٹھ نیلے تھے

تو نہیں تو ان کا بھی شہد مر گیا جانم
نیم جیسے یہ لگے آم سے رسیلے تھے

یاد کا آخری پیپل بھی گرا چاہتا ہے!
اب کہاں دھوپ میں بیٹھے گا بتا آوارہ

کیا زمیں ہے کہ ٹھہرتی ہی نہیں پاؤں تلے
آسماں سر پہ ہے، مانگ دعا آوارہ

رشتہ نہیں زمیں سے تو ٹھہر پا گے کتنے روز — یہ فصل بے جڑوں کے شجر لے کے آئی ہیں

ہوتی نہ اگر جسم کی تہذیب کوئی شے — جینے کے لیے ایک تیری یاد بہت تھی
قیدی کی طرح وقت کی مٹھی میں انا ہے — کم بخت مرے جسم میں آزاد بہت تھی
اک تاج محل ہی مری بستی میں نہیں تھا — کاٹے ہوئے ہاتھوں کی بھی تعداد بہت تھی
بھگوان تو بس چودہ برس گھر سے ہے دور — اپنے لیے بن باس کی میعاد بہت تھی

بدن کجلا گیا تو دل کی تابانی سے نکلوں گا — میں سورج بن کے اک دن اپنی پیشانی سے نکلوں گا

مچھلی جال سمندر، طوفاں ساحل موجیں شیخ مجیب — جانے کیا کیا سوچ رہی تھی وہ بنگالن رات گئے

بچا لے آج جو کشکول تو غنیمت ہے — یہ بات سچ ہے تو ماضی میں شاہزادہ تھا
شفق کے رنگ میں نہلا گیا مجھے کل شام — وہ ایک شخص کہ جس کا لباس سادہ تھا

معلوم نہیں بابا کب چور ادھر آئے — ہر جسم کوئی ٹوٹا دروازہ نظر آئے

مداریوں کا تماشا ہے زندگی میری — کھڑی ہیں گھیر کے جھوٹی شہادتیں مجھ کو

کھاتا جا حالات کے پتھر خود راحت ہو جائے گی — دو دن زخم اذیت دیں گے پھر عادت ہو جائیگی

بہت مشکل سے نکلی ایک مٹھی راکھ آنگن سے — لٹیرے پا کے پچھتائے خزانہ میرے حصے کا

وضعداری کا جنازہ لئے پھرتا ہوں ظفر — شہر کی بھیڑ میں کنگال امیروں کی طرح

زندگی ہے فقیر کی جھولی — درد کی بھیک ڈالتے جاؤ

مرے لیے کسی قاتل کا انتظام نہ کر — کریں گی قتل خود اپنی ضرورتیں مجھ کو

دن کو بھی اتنا اندھیرا ہے میرے کمرے میں — سایہ آتے ہوئے ڈرتا ہے مرے کمرے میں

چھائیں گے جس وقت ضرورت کے بادل — بہ جائے گی سب خودداری آنکھوں سے

جب بھی کوئی سمجھوتا زندگی سے کرتا ہوں — زور سے لگاتا ہے مجھ میں قہقہہ اک شخص

سونا لینے پیا گئے، سونا کر گئے دیس — سونا ملا نہ پی ملے روپا ہو گئے کیس

زیادہ بھیک انھیں دے کے مطمئن رکھئے — کہ پھیل جائے نہ شورش گداگروں میں کہیں

مری خوش فہمیاں مجھے دے دو — آئینہ دیکھ کر اداس ہوں میں

جھوٹے سچے انسانوں کی نگری میں — دادی تیری باتیں اچھی لگتی ہیں!

دیکھیں قریب سے بھی تو اچھا دکھائی دے
اک آدمی تو شہر میں ایسا دکھائی دے

تمام گاؤں ترے بھولپن پہ ہنستا ہے
دھوئیں کے ابر سے برسات مانگنے والے

ظفرؔ نے کیسے سہے ہوں گے روزگار کے وار
یہ آدمی تو بڑا دھان پان لگتا ہے

مسائل اتنے زیادہ تھے اپنے ساتھ ظفرؔ
کہ خود سے ملنے کا موقع کبھی ملا ہی نہیں

راہ میں اس کی گلی بھی ہے، مرا مقتل بھی ہے
اب کے موسم اور خوشبو دار ہو کر آئے گا

اب اپنا گاؤں بھی پتھر کا ہو گیا ہے ظفرؔ
یہ آرزو تھی پرندوں کے ساتھ کھیلوں گا

بجلی سڑکیں، بھرے بازار، چمکتی سڑکیں
دوست سب کچھ ہے مگر جینا کہاں بستی میں

چاند کا حسن، گلابوں کی مہک جلتی ہے
جب سے خاموش ہے یہ چولہے کا دھواں بستی میں

وہ جو ہنس بول کے دکھ بانٹ لیا کرتے ہیں
مجھ کو بتلا دو وہ رہتے ہیں کہاں بستی میں

اب بھیک مانگنے کے طریقے بدل گئے
لازم نہیں کہ ہاتھ میں کاسہ دکھائی دے

جس عہد میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اس عہد کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

پھر آج شہر کی سب سے بڑی حویلی میں
تمام دن کی کمائی فقیر چھوڑ گیا

بس زندگی کا نام ہی سننے میں لطف ہے
ملے گا زندگی سے تو مر جائیے گا آپ

زندگی بچی ہے اس کا دل نہ توڑ
خواب کی ننھی سی گڑیا بھیج دے

زندگی یہ بھی بہت ہے کہ اداسی میں تجھے
دو گھڑی کھیل کھلونوں سے ہنسائے جاؤں

کبھی تو دھوپ کا بھی چکھ سکوں مزہ یارب
مکان دے مگر اتنا بھی سایہ دار نہ دے

کانٹوں کے ہونٹ اتنے ملائم نہ تھے کبھی
پیوست ہوں گے میرے لبوں کے نشاں ضرور

اکیلے پن میں چھناکوں کا لطف دیتا ہے
کبھی کبھی تری آوازِ پا کا چپ رہنا

پھر ایک بار ملیں ہم کھلی فضا میں کہیں
میں اپنے خول سے نکلوں تو اپنے گھر سے نکل

تیرے انصاف میں صدیوں کی ہے تاخیر ابھی
شاید اس وقت کوئی شے نہ سلامت ہو گی

تو پھر یہ قاتلانِ وقت کس کو مار کر خوش ہیں!
سنا ہے وہ نہیں اس کا بدن مقتل میں حاضر تھا

کوئی بہروپ، کوئی شور، کوئی ہنگامہ
حافظِ شہر کا ناقص ہے خبر میں رہیے

ہم ظفرؔ موت سے مرنے والے نہ تھے
ہم تو ائی میں ہی جو مار ڈالے گئے

کفنِ ضمیر کو بخشا، جبیں کو دی دستار
بہت دیا مجھے دربار کی سلامی نے

اونچی دیوار کو چھونے والا
میرے کاندھے پہ کھڑا ہے شاید

جب بڑے ہوں تو قتل کر دینا
خواب بچے ہیں پالتے جاؤ!

دیکھو وہ موج، خود نہ کہیں ہو شریکِ غم
جو ناؤ ڈوبنے کی خبر لے کے آئی ہے

آدرشوں پر جما ہوا گرد و غبار دیکھ
چوراہے پہ کھڑے ہوئے پتلے کے پاس جا

تیز بارش کی دعا میں نے ظفر مانگی تھی
یہ بھی لازم ہے کہ اب گرتی ہوئی چھت دیکھوں

دردِ دل ہوں کوئی اوڑھی ہوئی تہذیب نہیں
چھوڑ دوں میں جو بدن کو تو بدن مر جائے

یہ تعاون بھی ہے بستی کے بسانے میں بہت
میں اگر اپنی ہی دیوار اٹھائے جاؤں

اس مہذب شہر میں ہر شخص سے ملنے کے بعد
اک مری آوارگی تھی جو مجھے اچھی لگی!

اپنے ہاتھوں کے طمانچے ہوں گے اپنے گال پر
ٹھہریے کچھ روز، وہ بھی مرحلہ آ جائے گا

کس طرح مرے شہر میں جنگل ہوا داخل
فردا کے مورخ کو جواب آپ ہی دیں گے

تاریخ مرے خون کے قطروں کو گنے کیوں
جب آپ ہیں قاتل تو حساب آپ ہی دیں گے

ستم شعاروں کی موجودگی سے لگتا ہے
ابھی زمیں پہ کوئی معرکہ ہوا ہی نہیں

دیوار وہ جو بوجھ اٹھائے مکان کا
دیوار وہ نہیں جو رکاوٹ کھڑی کرے

باڑھ آئی تھی ظفر لے گئی گھر بار مرا
اب کسے دیکھنے جاؤں میں وطن بارش میں

بھائی خلش بھی جاتی نہیں کچھ دیے بغیر
ہوں انگلیوں میں خون تو کانٹے کے پاس جا

کس حال میں ہے شہر یہ دیکھیں گے پھر کبھی
پہلے ذرا پڑوس کا گھر دیکھتے چلیں

کھڑکیاں کھول کے اک بھول ہوئی ہو جیسے
سارا باہر کا اندھیرا ہے مرے کمرے میں

چل رہی ہے مری آنکھوں میں گھڑی کی سوئی
یہ رکے تو ترے چہرے کی عبارت دیکھوں

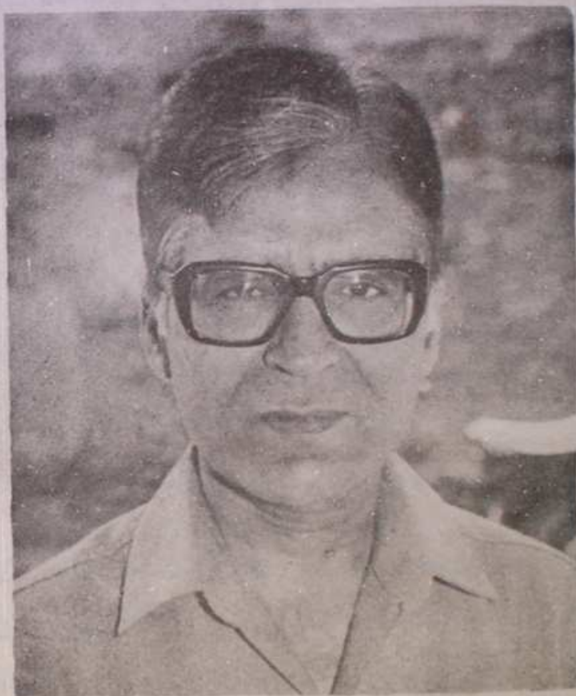
گذشتہ رت میں تو آنکھیں گئیں مگر اس بار
بچا سکیں گے نہ شاید یہ چند خواب بھی ہم

دل کہتا ہے بھاگ چلیں اس دنیا سے
دل کو بھی کچھ باتیں اچھی لگتی ہیں

پی رہا ہوں میں ابھی احسان اس کا بوند بوند
تشنگی مٹ جائے تو بادل سے غداری کروں

••

عرفان صدیقی



عرفان صدیقی　　　　　　پ ۱۹۳۹ء

عکسِ تحریر

غزلیں

عرفان صدیقی

جب رزق مقدر ہے تو کیوں خاک سے لے آؤں
توشہ ہی جو لانا ہے تو افلاک سے لے آؤں

آتے ہی کئی جال رہیں لیکن دلِ نادان
پہلے تو تجھے زلف کے پیچاک سے لے آؤں

کیا گنجِ گہر کی مرے دامن کو کمی ہے
چاہوں تو ابھی دیدۂ نمناک سے لے آؤں

دکھلاتا ہوں گم گشتہ قبیلوں کی نشانی
کچھ تار کسی پیرہنِ چاک سے لے آؤں

چمکے تو اندھیرے میں مرا طرۂ دستار
وہ چاند ستارے تری پوشاک سے لے آؤں

یاراں! مجھے ان چیزوں سے نسبت نہیں ہوتی
ورنہ تو یہ شے میں بھی رگِ تاک سے لے آؤں

تم نے کبھی دیکھا نہیں آہوئے تتاری
اچھا تو میں اس صید کو فتراک سے لے آؤں

یوں ہے کہ مجھے گرمیِ محفل کا نہیں شوق
میں آگ تو اپنے خس و خاشاک سے لے آؤں

گھبرا سا بہت جی جب گیا ہے کہ دل کو
تیری ہی طرف اس رہِ کاواک سے لے آؤں

دلِ ناداں طرفِ موجِ ہوا سوچ کے چل
پھر نہیں لوٹ کے آنے کی ذرا سوچ کے چل

تازہ تیروں کے لیے کوچ مبارک لیکن
ہے وہی ساری زمینوں کا خدا سوچ کے چل

کشتگانِ رہِ تسلیم تھے کچھ اور ہی لوگ
یہ نئی صف ہے سو اے تیغِ جفا سوچ کے چل

ایک وحشی سے خرابہ بھی نہیں ہوتا آباد
خاک اڑتی ہے سرِ شہرِ وفا سوچ کے چل

اب وہ آنکھوں سی کشش اُن کو بلاتی ہے کہاں
مجھ سے کہتا ہے مرا کوہِ ندا سوچ کے چل

ایک خواہش کی صدا آئی کہ رک جا لیکن
ایک اندیشے نے چپکے سے کہا سوچ کے چل

ایک اُس مردِ ہنر کا نقشہ ہے اٹل
کچھ ہنر اور بھی اے ربِّ دعا سوچ کے چل

عرفان صدیقی

عنایت نامہ ملا۔ اس کرم فرمائی اور غزلوں پر توجہ، دونوں کے لیے بہت شکر گذار ہوں:

اگر میں فرض نہ کر لوں کہ سن رہا ہے کوئی ۔ تو پھر مرا سخنِ بے زباں کہاں جائے

حسب ارشاد تین نئی غزلیں اور پچاس پچپن متفرق اشعار بھیج رہا ہوں۔ کوئی خاص وجہِ ترجیح نہیں ہے۔ بس اپنی پسند اور یادداشت سے تحریر کر دیے ہیں۔ مزید انتخاب آپ چاہیں تو خود فرمالیں اپنے نئے شعری مجموعے 'سات سماوات' کی ایک جلد بھی علیحدہ ڈاک سے حاضر خدمت ہے۔



آپ نے خود نوشت کے طور پر کچھ بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ حیران ہوں کیا لکھوں۔ واقعی زندگی میں کوئی خاص قابل ذکر بات نظر نہیں آتی۔

بدایوں میں ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوا۔ بریلی کالج، آگرہ یونیورسٹی تعلیم مکمل کی۔ غالباً ۱۹۶۲ء میں وزارت اطلاعات و نشریات کی مرکزی اطلاعاتی سروس سے وابستہ ہو گیا۔ ملازمت کے سلسلے میں دلی، لکھنؤ وغیرہ قیام رہا۔ پچھلے بیس سال سے لکھنؤ ہی مستقر بنا لیا ہے اگرچہ بسلسلہ ملازمت ادھر ادھر جاتا رہتا ہوں۔

جیسا کہ 'سات سماوات' میں مذکور ہے، شاعری کے تین مجموعے، دو ترجمے اور (یہ مذکور نہیں ہے) دو تین کتابیں ابلاغ و ترسیل وغیرہ سے متعلق موضوعات پر چھپیں۔ شاعری کے تین مجموعے، کینوس، شب درمیاں، سات سماوات۔

والسّلام ــــ مخلص ــــ عرفان صدیقی



انتخابِ کلام

دلِ ناداں، طرفِ موج ہوا سوچ کے چل ۔ پھر یہیں لوٹ کے آنا ہے ذرا سوچ کے چل
تازہ قریوں کے لیے کوچ مبارک، لیکن ۔ ہے وہی ساری زمینوں کا خدا سوچ کے چل
کشتگانِ رہِ تسلیم تھے کچھ اور ہی لوگ ۔ یہ نئی صف ہے سوائے تیغِ جفا سوچ کے چل
ایک وحشی سے خرابہ نہیں ہوتا آباد ۔ خاک اڑتی ہے سرِ شہرِ وفا سوچ کے چل
اب وہ اگلی سی کشش اس کے بلاوے میں کہاں ۔ مجھ سے کہتا ہے مرا کوہِ ندا سوچ کے چل
ایک خواہش کی صدا آئی کہ رکنا کیسا ۔ ایک اندیشے نے چپکے سے کہا سوچ کے چل
اب کے اس معرکۂ صبر کا نقشہ ہے الگ ۔ کچھ ہنر اور بھی اے دستِ دعا سوچ کے چل



جب رزق مقدر ہے تو کیوں خاک سے لے آؤں ۔ توشہ ہی جو لانا ہے تو افلاک سے لے آؤں

آگے بھی کئی جال ہیں لیکن دلِ ناداں
پہلے تو تجھے زلف کے پیچاک سے لے آؤں

کیا گنج گہر کی مرے دامن کو کمی ہے
چاہوں تو ابھی دیدۂ نمناک سے لے آؤں

دکھلاتا ہوں گم گشتہ قبیلوں کی نشانی
کچھ تار کسی پیرہنِ چاک سے لے آؤں

چمکے تو اندھیرے میں مرا طرۂ دستار
دو چار ستارے تری پوشاک سے لے آؤں

یاراں، مجھے ان چیزوں سے نشہ نہیں ملتا
ورنہ تو یہ شے میں بھی رگِ تاک سے لے آؤں

تم نے کبھی دیکھا نہیں آہوئے تتاری
اچھا، تو میں اس صید کو فتراک سے لے آؤں

یوں ہے کہ مجھے گرمیِ محفل کا نہیں شوق
میں آگ تو اپنے خس و خاشاک سے لے آؤں

گمراہ سہی پھر بھی عجب کیا ہے کہ دل کو
تیری ہی طرف اس رہِ کاواک سے لے آؤں

○

پرند نامہ بری میں کہاں سے آتے ہیں
سخن یہ بے خبری میں کہاں سے آتے ہیں

ہمیں بھی یاد نہیں ہے کہ ہم شرر کی طرح
ہوا کی ہمسفری میں کہاں سے آتے ہیں

دروں میں آنکھیں، گھروں میں چراغ جلتے ہوئے
یہ خواب دربدری میں کہاں سے آتے ہیں

مسافتیں کوئی دیکھے کہ ہم سرابوں تک
گمانِ خوش نظری میں کہاں سے آتے ہیں

یہ کون جادۂ گم گشتگاں اُجالتا ہے
فرشتے دشت و تری میں کہاں سے آتے ہیں

اگر تراوشِ زخمِ جگر نہیں کوئی چیز
تو رنگ بے ہنری میں کہاں سے آتے ہیں

○

آج پھر تیر رگِ جاں پہ گراں گزرا ہے
آج پھر وہم سا ہوتا ہے کہ زندہ ہوں میں

یہ بھی ممکن ہے یہیں حشر نوا برپا ہو
یہ بھی سچ ہے کہ ابھی شہر میں تنہا ہوں میں

مجھ سے پوچھو مری سیرابیِ جاں کا احوال
یہ تو دریاؤں کا کہنا ہے کہ پیاسا ہوں میں

خاک کو آگ دکھائیں تو یہی ہوتا ہے
اب یہ عالم ہے کہ جلتا ہوں نہ بجھتا ہوں میں

میں طلبگار بھی تھا کام کی آسانی کا
حکم ہے مجھ کو خرابوں کی نگہبانی کا

اس ہوس میں کہ مرے ہاتھ نہ خالی رہ جائیں
کتنا نقصان ہوا ہے مری پیشانی کا

یہ جو اک وہم مجھے دشت کی تسخیر کا ہے
سب تماشا یہ مری وسعتِ زنجیر کا ہے

لاؤ، یہ راکھ ہی خرمن کا اٹھا لوں کہ سوال
میرے حاصل کا نہیں ہے، مری تدبیر کا ہے

ایک دن تو بھی مرے شہرِ سخن کی سیر کر — یہ جو اک چھوٹی سی دنیا ہے، تماشا یہ بھی ہے

دیر سے منظرِ افلاک صدا دیتا ہے — اور میں چپ ہوں کہ بے بال و پری کے دن ہیں

آخرِ کار گزرنے کو ہے یہ ساعتِ صبر — اس کے آگے مری شوریدہ سری کے دن ہیں

ملنا ہیں کاٹ مرے ساتھ بادبانوں کی — میں تجھ کو سیر کراؤں نئے جہانوں کی

ابھی وہ چاند سا چمکا تھا مری آنکھوں میں — کہ ساعتوں پہ گھٹا گھر گئی زمانوں کی

رزق تک میں بھی زمیں زاد ہوں لیکن یارو — اس کے آگے مرا میدانِ طلب دوسرا ہے

کیا عجب ہے کہ ہوس روح کو کر دے کندن — جسم اس آگ میں جل جائے گا جل جانے دے

اے خدا کتنے کو ہے مجھ سے زمیں کا رابطہ — دیکھ میں دستِ دعا ہوں اور قلم ہونے کو ہوں

یہاں وہ حشر بپا تھا کہ میں بھی آخرِ کار — اگرچہ نقش تھا دیوار سے نکل آیا

مری بلا سے جو ہو کاروبارِ شوق تباہ — میں خود کو بیچ کے بازار سے نکل آیا

دشت میں اگنا بھی کچھ دیوانگی کا کام ہے — خیر چندے انتظارِ پائمالی کیجیے

اب سخن کرنے کو ہیں نو واردانِ شہرِ درد — اٹھیے صاحب مسندِ ارشاد خالی کیجیے

مجھے سراب دکھاتا ہے روز عرصۂ خاک — میں روز فائدۂ آب و نم اٹھاتا ہوں

جہاں سروں کو جھکاتے ہیں کج کلاہ وہاں — میں اور طرّۂ پر پیچ و خم اٹھاتا ہوں

خاک پڑے مرا قاتل یہ تماشا کیا ہے — کہ نشانے پہ تو مدت سے خدایا میں تھا

اب لہو تم کو بھی پیارا لگے چلو یوں ہی سہی — ورنہ یہ رنگ تو اس دشت میں لایا میں تھا

کہیں تو لٹنا ہے پھر نقدِ جاں بچانا کیا — اب آ گئے ہیں تو مقتل سے بچ کے جانا کیا

گرا تو کوئی جزیرہ نہ تھا سمندر میں — کہ پانیوں پہ کھلے بھی بہت تھے پَر میرے

ہوشیاری دلِ ناداں بہت کرتا ہے — رنج کم سہتا ہے اعلان بہت کرتا ہے

رات کو جیت تو پاتا نہیں لیکن یہ چراغ — کم سے کم رات کا نقصان بہت کرتا ہے

یاد آتی ہوئی خوشبو کی طرح زندہ ہم — کسی گزرے ہوئے موسم کے نمائندہ ہم

اس اندھیرے میں کہ پل بھر کا چمکنا بھی محال — رات بھر زندہ و رخشندہ و تابندہ ہم

پرانی خوشبوؤ، اب میرے ساتھ ساتھ نہ آؤ — یہاں سے اگلی رتوں کا سفر کروں گا میں

مجرم ہوں اور خرابۂ جاں میں اماں نہیں — اب میں کہاں چھپوں کہ یہ گھر بھی اسی کا ہے

غبارِ تیرہ شبی بھر گیا ہے آنکھوں میں ___ یہیں چراغ جلے تھے دھواں کہاں جائے

رات کی رات وہی رنگ ترنگوں کی پکار ___ صبح تک خون بھی خاموش حنا بھی خاموش

اور ہی شرط ہے پرواز کی، دیکھا تم نے ___ اب تو وہ مسئلۂ بے پر و بالی بھی نہیں

سرِ شوریدہ کو تہذیب سکھا بیٹھا ہوں ___ ورنہ دیوار مجھے روکنے والی بھی نہیں

تو نے مٹی سے الجھنے کا نتیجہ دیکھا ___ ڈال دی میرے بدن نے تری تلوار پہ خاک

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک ___ مسندِ خاک پہ بیٹھا ہوں برابر اپنے

بجھا چکے ہیں پرانی رفاقتوں کے چراغ ___ بچھڑنے والے شبِ درمیاں سے پہلے بھی

شمعِ تنہا کی طرح، صبح کے تارے جیسے ___ شہر میں ایک ہی دو ہوں گے ہمارے جیسے

ریت پر تھک کے گرا ہوں تو ہوا پوچھتی ہے ___ آپ اس دشت میں کیوں آئے تھے وحشت کے بغیر

یہ کائنات مرے بال و پر کے بس کی نہیں ___ تو کیا کروں سفرِ ذات کرتا رہتا ہوں

ذرا سے لمسِ شرر نے عجب کمال کیا ___ میں سوچتا تھا مرے خار و خس میں کچھ بھی نہیں

اس نے پوچھا تھا کہ سر بیچنے والا ہے کوئی ___ ہم نے سر نامۂ جاں نذر گزارا ہے کہ ہم

اٹھو یہ منظرِ شب تاب دیکھنے کے لیے ___ کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لئے

یہ کس نے دستِ بریدہ کی فصل بوئی تھی ___ تمام شہر میں نخلِ دعا نکل آئے

طلوع ہونے کو ہے پھر کوئی ستارۂ غیب ___ وہ دیکھ پردۂ افلاک ہٹتا جاتا ہے

دیکھئے کس صبحِ نصرت کی خبر سنتا ہوں میں ___ لشکروں کی آہٹیں تو رات بھر سنتا ہوں میں

ہم تو رات کا مطلب سمجھیں، خواب، ستارے، چاند، چراغ ___ آگے کا احوال وہ جانے جس نے رات گزاری ہو

اور ایک جست میں دیوار سے ٹکرائے گا سر ___ قید پھر قید ہے زنجیر کی وسعت پہ نہ جاؤ

میرے اندر ابھی محفوظ ہے اک لوحِ طلسم ___ اک طلسم اور ابھی میرے مقابل ہے تو کیا

ایک کوشش کہ تعلق کوئی باقی رہ جائے ___ سو تری چارہ گری کیا مری بیماری کیا

یہ راز کھلا روزنِ زنداں کی بدولت ___ سورج میں ہے جو بات کرن میں بھی وہی ہے

تم اس حریف کو پامال کر نہیں سکتے ___ تمہاری ذات ہے دنیا نہیں بکھر جاؤ

بہت ہے یہ بھی کہ موجوں کے روبرو کچھ دیر ___ رہا ہے ریگِ رواں پر نشاں ہمارا بھی

وہ سب اک بجھنے والے شعلۂ جاں کا تماشا تھا ___ دوبارہ ہو وہی رقصِ شرر ایسا نہیں ہوگا

○

حلقۂ بے طلباں رنجِ گراں باری کیا
اُٹھ کے چلنا ہی تو ہے کوچ کی تیاری کیا

ایک کوشش کہ تعلق کوئی باقی رہ جائے
سو تری چارہ گری کیا مری بیماری کیا

وہی زنداں کی فصیلیں وہی صحرا کے حدود
ٹوٹ سکتی ہے یہ زنجیرِ گرفتاری کیا

تم سے کم اور کسی شخص پہ راضی نہیں دل
ہم سمجھتے تھے کہ دیوانے کی ہشیاری کیا

وہ بھی طرفہ سخن آراء ہیں، چلو یوں ہی سہی
اتنی سی بات پہ یاروں کی دل آزاری کیا

○

ایسا تو نہیں کہ اُن سے ملاقات نہیں ہوئی
جو بات میرے دل میں تھی وہ بات نہیں ہوئی

تیرے بغیر بھی غمِ جاں ہے وہی کہ نہیں
نکلا نہ ماہتاب تو کیا رات نہیں ہوئی

پیشِ طلب تھا خوانِ دو عالم سجا ہوا
اس رزق پر مگر بسر اوقات نہیں ہوئی

بہتر یہ ہے کہ وہ تنِ شاداب ادھر نہ آئے
برسوں سے میرے شہر میں برسات نہیں ہوئی

ہم کون پیرِ دل زدگاں ہیں کہ عشق میں
یاراں بڑے بڑوں سے کرامات نہیں ہوئی

یاقوت لب تو کارِ محبت کا ہے صلہ
اُجرت ہوئی حضور یہ سوغات نہیں ہوئی

کیا سہل اُس نے بخش دیا چشمۂ حیات
جی بھر کے سیرِ وادیِ ظلمات نہیں ہوئی

میرے جنوں کو ایک خرابے کی سلطنت
یہ تو کوئی تلافیِ مافات نہیں ہوئی

کب تک یہ سوچ سوچ کے ہلکان ہوجیے
اب تک تری طرف سے شروعات نہیں ہوئی

اپنا نسب بھی کوئے ملامت میں بار ہے
لاکھ اپنے پاس عزتِ سادات نہیں ہوئی

○

فقیری میں یہ تھوڑی سی تن آسانی بھی کرتے ہیں
کہ ہم دستِ کرم دنیا پہ ارزانی بھی کرتے ہیں

درِ روحانیاں کی چاکری بھی کام ہے اپنا
بتوں کی مملکت میں کارِ سلطانی بھی کرتے ہیں

یہ وحشت اور یہ شائستگی طرفہ تماشا ہے
رفو بھی چاہتے ہیں چاک دامانی بھی کرتے ہیں

اگر سمجھو تو اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں میں
کہ طائر میرے سینے میں پر افشانی بھی کرتے ہیں

مجھے کچھ شوقِ نظارہ بھی ہے گلزارِ خوباں میں
مگر کچھ پھول چہرے میری نگرانی بھی کرتے ہیں

ہمارے دل کو اک آزار ہے ایسا نہیں لگتا
کہ ہم دفتر بھی جاتے ہیں غزل خوانی بھی کرتے ہیں

○

حاصلِ سیرِ بے دلاں کون و مکاں نہیں نہیں
کوئے حرم نہیں نہیں شہرِ بتاں نہیں نہیں

جسم کی رسمیات اور دل کے معاملات اور
بیعتِ دست ہاں ضرور، بیعتِ جاں نہیں نہیں

درد کی کچھ بساط ہے جس پہ یہ پیچ و تاب ہو
دیکھ عزیز صبر صبر دیکھ میاں نہیں نہیں

ہم فقرا کا نام کیا پھر بھی اگر کہیں لکھو
لوحِ زمیں تو ٹھیک ہے لوحِ زماں نہیں نہیں

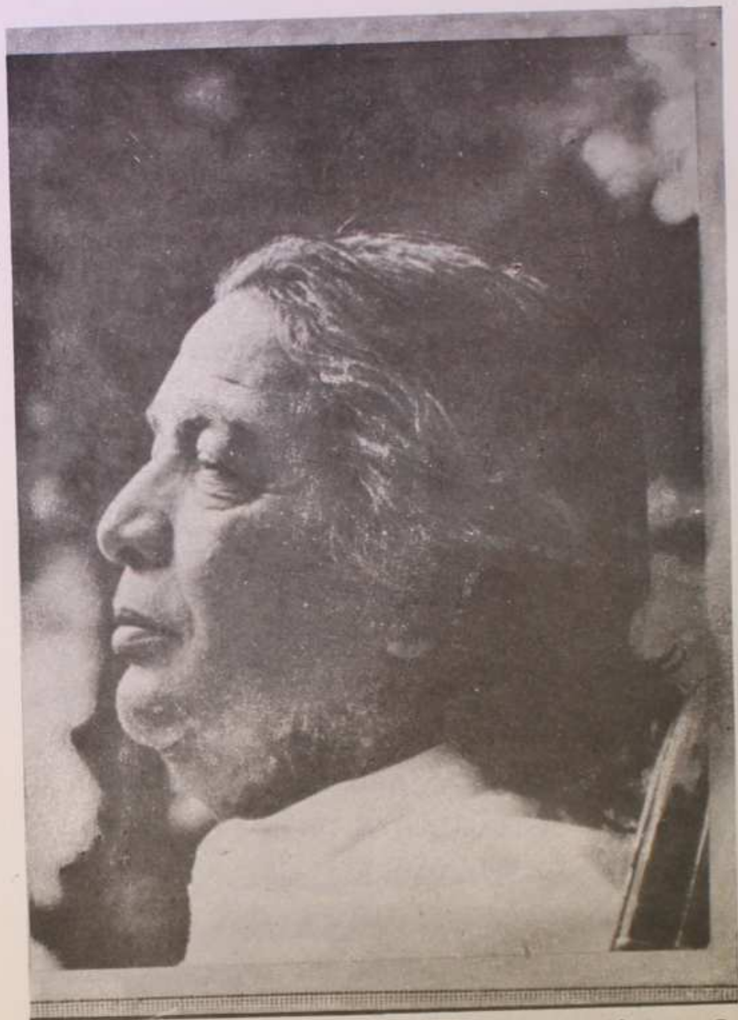
پوچھ رہا تھا وہ صنم کیا میں نہیں خدا پرست
ہم بڑے حق پرست تھے کہہ اٹھے ہاں نہیں نہیں

دونوں تباہ ہو گئے ختم کرو یہ معرکے
اہلِ ستم نہیں نہیں دل زدگاں نہیں نہیں

گرمیِ شوق کا صلہ دشت کی سلطنت غلط
چشمۂ خوں کا خوں بہا جوئے رواں نہیں نہیں

●●

کیفی اعظمی



کیفی اعظمی

عکسِ تحریر

برادرم [illegible] آپ نے جو دو غزل [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] والسلام

نیازمند
[illegible]

کیفی اعظمی

تاریخ پیدائش: یاد نہیں　　　　تاریخ وفات: معلوم نہیں

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

والد مرحوم کا نام سید فتح حسین رضوی تھا۔ وہ زمیندار تھے لیکن گھر پر کھیتی بھی ہوتی تھی اچھی خاصی خوشحالی تھی لیکن ابا کی دوربین نگاہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اب ہندستان میں زمینداری کا کوئی مستقبل نہیں ہے اس لیے انھوں نے گاؤں سے نکل کر اودھ کی ایک مشہور ریاست بلہرہ میں ملازمت کر لی اور بچوں کو لکھنؤ میں رکھا تاکہ ان کی تعلیم و تربیت ٹھیک سے ہو سکے۔ میں پانچ بھائی ہوں، میرا نمبر چوتھا ہے۔ مجھ سے تینوں بڑے بھائی گریجوئیٹ ہیں جب میرے پڑھنے کے دن آئے تو نجانے کیوں ابا مرحوم نے مجھے مولوی بنانا چاہا اور میں شمالی ہند کی مشہور دینی مدرسے سلطان المدارس میں داخل کر دیا گیا۔ خیر میں وہاں مولوی تو نہیں بنا مگر اردو، فارسی اور عربی کے کئی امتحانات لکھنؤ اور الٰہ آباد یونیورسٹیوں سے پاس کئے لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر ماہر، دبیر کامل اور مولوی، الٰہ آباد یونیورسٹی سے منشی، منشی کامل اور اعلیٰ قابلیت کے امتحانات میں نے اس لئے پاس کئے تھے کہ اس کے بعد انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر دوں گا لیکن انھیں دنوں سیاست اور شاعری کا جنون سر پر سوار ہو گیا اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا، شاعری گیارہ برس کی عمر میں شروع ہو گئی کہ اس عمر میں میں نے پہلی غزل لکھی۔

میں نے جس ماحول میں جنم لیا شاعری اس میں رچی بسی ہوئی تھی، شیعہ گھرانے میں جنم لینے کی وجہ سے ایک تو میر انیس کے مرثیے برابر سننے کو ملتے تھے۔ ابا مرحوم باقاعدہ شاعر نہیں تھے کبھی کبھار فارسی میں کچھ کہہ لیا کرتے تھے لیکن ان کے شاعری کا ذوق بہت اعلیٰ تھا اس وجہ سے گھر میں اردو اور فارسی کے تمام اساتذہ کے دواوین اور کلیات تھے۔ مجھے بچی عمر میں فن کے مطالعے کا موقع ملا حالانکہ اس وقت جتنا پڑھتا تھا اس کا بہت کم حصہ سمجھ میں آتا تھا لیکن مطالعے کی عادت ہو گئی جو اب کام آرہی ہے۔ میرے تینوں بڑے بھائی شاعر تھے۔ بڑے بھائی سید ظفر حسین رضوی کا تخلص مجروح تھا۔ منجھلے بھائی سید شبر حسین رضوی کا تخلص وفا تھا، یہ خوش فکر بھی تھے اور خوش گو بھی۔ بھائی صاحبان چھٹیوں میں جب گھر آتے اور ابا کو اپنا کلام سناتے تو میں بھی بڑے شوق سے وہاں کھڑا ہو جاتا اور غور سے ان کا کلام سنتا لیکن جب کسی بزرگ کی نظر پڑ جاتی تو وہ فوراً ڈانٹ دیا کرتا "تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا، گھر میں جاؤ

اور پان بنوا کر لاؤ۔ مجھے اس بات سے بہت تکلیف پہونچی لیکن سوائے رو دینے کے اور کرتا کیا، میں روتا ہوا گھر میں جاتا اور باجی سے کہتا یہ لوگ مجھے سمجھتے کیا ہیں، دیکھ لیجئے گا ایک دن میں ان سے بڑا شاعر بن کے دکھاؤں گا۔ باجی مسکراہٹ چھپا کے کہتیں ضرور تم ایک دن بڑے شاعر بنو گے۔ ابھی تو یہ خاصدان اٹھاؤ اور باہر جا کے پان دے آؤ۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا لیکن ہوا ایسا ہی کہ جب میں نے شاعری شروع کی تو بھائی صاحبان نے شاعری ترک کر دی، شاعری اور سیاست کا شوق ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ سیاست میں ہمیشہ مَیں بائیں بازو کی سیاست کی طرف مائل رہا، میرے خاندان میں اور کسی کو سیاست سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی، مجھے اس بات پر بہت فخر ہے کہ میرے خاندان میں کبھی کوئی فرد فرقہ پرست سیاست سے نہ متاثر ہوا اور نہ اس کا حامی۔

اس وقت کہ میری عمر لگ بھگ ۶۵ برس سے تجاوز کر چکی ابتک میرے پانچ شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں اردو اکادمیوں اور ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ کے علاوہ مجھے لوٹس ایوارڈ بھی مل چکا ہے جو بین الاقوامی اہمیت کا ایوارڈ ہے۔ میری رفیقہ حیات شوکت کیفی اسٹیج کی بہت کامیاب آرٹسٹ ہیں۔ میری بیٹی شبانہ اعظمی فلم کی بہت مشہور اور بہت ہی کامیاب فنکارہ ہیں۔ میرا بیٹا احمر اعظمی فلم کا بہت بڑا کیمرہ مین ہے۔ بیوی بچے زیادہ تر بمبئی میں رہتے ہیں، میں اپنی بچی کھچی عمر اپنے چھوٹے سے گاؤں مجواں ضلع اعظم گڑھ میں گذارنا اور گاؤں کی کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں، اپنی شاعری سے اب تک نہ مطمئن ہوں نہ مایوس۔ غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لکھتا ہوں۔ ایک بڑا ایپک لکھنے کا ارادہ ہے شروع بھی کر چکا ہوں اگر زندگی نے جلدی ساتھ نہ چھوڑا تو شاید وہ ایپک مکمل ہو سکے، اس کے بعد موت تو آئیگی لیکن میں مروں گا نہیں۔

انتخاب کلام

اک تم کہ تم کو فکر نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے

مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

توڑ کے دل کو نہ اس پیار کے انداز سے دیکھ
کہ یہ کم بخت نہ پھر پیار کے قابل ہو جائے

جس پہ ٹھہرا ہو گلستاں کا گلستاں ہونا
ہائے اس پھول کا کھلتے ہی پریشاں ہونا

وہ سب کی سن رہے ہیں سب کو داد شوق دیتے ہیں
کہیں ایسے میں میرا قصۂ غم بھی بیاں ہوتا

شل ہو رہے ہیں بازو اک ناؤ کھیتے کھیتے
تنگ آ گیا ہوں یارب میں سانس لیتے لیتے

بس اک جھجک ہے یہی حال دل سنانے میں
کہ تیرا ذکر بھی آئے گا اس فسانے میں

اسی میں عشق کی قسمت بدل بھی سکتی ہے
جو وقت بیت گیا مجھ کو آزمانے میں

یہ کہکے ٹوٹ پڑا شاخِ گل سے آخری پھول
اب اور دیر ہے کتنی بہار آنے میں

سرخرو وہ ہے، بدنام جفا بھی نہ ہوئی
دل اس انداز سے توڑا کہ صدا بھی نہ ہوئی

اتنا مایوس نہ ہو اپنے خدا سے کوئی
ہاتھ اٹھے رہ گئے اور ہم سے دعا بھی نہ ہوئی

سنا کرو مری جاں اِن سے اُن سے افسانے
سب اجنبی ہیں یہاں کس کو کون پہچانے

یہاں سے جلد گذر جاؤ قافلے والو
ہیں میری پیاس کے پھونکے ہوئے یہ ویرانے

بہار آئے تو میرا سلام کہدینا
مجھے تو آج طلب کر لیا ہے صحرا نے

جہاں سے پچھلے پہر کوئی تشنہ کام اٹھا
وہیں پہ توڑے ہیں یاروں نے آج پیمانے

تمہیں نے دل کو دل سمجھا نہیں ہے
کوئی ارماں نہ ہو ایسا نہیں ہے

مرے سینے میں اپنا درد بھر دو
اکیلے بوجھ یہ اٹھتا نہیں ہے

مری باہوں سے آگے جا رہی ہو
مگر آگے کوئی دنیا نہیں ہے

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا
کسی کے ہاتھ کا اس پر نشان نہیں ملتا

کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے ایک جنگل میں
تمہارے چہرے کا کچھ بھی یہاں نہیں ملتا

جو اک خدا نہیں ملتا تو کیا ستم یہ ہے
مجھے خود اپنے قدم کا نشاں نہیں ملتا

کھاتا رہا تھا ٹھوکریں رستے میں ساتھ ساتھ
منزل پہ ڈھونڈھتا ہوں کہ کیا ہو گیا کوئی

سجدے تمام عمر کے بیکار ہو گئے
اس عمر میں جو مجھ سے قضا ہو گیا کوئی

دیوانہ پوچھتا ہے یہ لہروں سے بار بار
کچھ بستیاں یہاں تھیں بتاؤ کدھر گئیں

پایا بھی ان کو کھو بھی دیا چپ بھی ہو رہے
اک مختصر سی رات میں صدیاں گذر گئیں

پیمانہ ٹوٹنے کا کوئی غم نہیں مجھے
غم ہے تو یہ کہ چاندنی راتیں بکھر گئیں

جو وہ مرے نہ رہے میں بھی کب کسی کا رہا
بچھڑ کے ان سے سلیقہ نہ زندگی کا رہا

زمیں نے بوجھ اٹھایا نجانے کس کس کا
رہا جو نقشِ قدم تو کسی کسی کا رہا

یہ حقیقت ہے مالک گماں تو نہیں
میرا چھپر ترا آسماں تو نہیں

آج سرگرم ہیں کچھ لٹیرے بہت
راستے میں کوئی کارواں تو نہیں

رکھ حویلی کی بنیاد یہ دیکھ کر
اس زمیں پر کوئی آسماں تو نہیں

کوئی جب سے شریکِ کارواں ہے
مرے قدموں کے نیچے آسماں ہے

ہماری آرزو کا امتحاں ہے
چلو دیکھیں کہاں تک آسماں ہے

آج سوچا تو آنسو بھر آئے
مدتیں ہو گئیں مسکرائے

ہر قدم پر ادھر مڑ کے دیکھا
اس کی محفل سے ہم اٹھ تو آئے

رہ گیا درد بن کے سراپا
درد دل میں چھپائے چھپائے

دل کی نازک رگیں ٹوٹتی ہیں
یاد اتنا بھی کوئی نہ آئے

اندھیرے ڈھونڈھتے ان کو پہونچ گئے گھر تک
جو گھر میں بیٹھ رہے اور روشنی کر لی

اب آگے جو بھی ہو انجام دیکھا جائے گا
خدا تراش لیا اور بندگی کر لی

لائی پھر اک لغزشِ مستانہ تیرے شہر میں
پھر بنیں گی مسجدیں میخانہ تیرے شہر میں

آج پھر ٹوٹیں گی تیرے گھر کی نازک کھڑکیاں
آج پھر دیکھا گیا دیوانہ تیرے شہر میں

ننگی سڑکوں پر بھٹک کر دیکھ جب مرتی ہے رات
رینگتا ہے ہر طرف ویرانہ تیرے شہر میں

دور تک چھائے تھے خشک سائے
ہم اس آنگن سے دھوپ اٹھا لائے

ایسے لمحے بھی عشق میں آئے
حسن سے ناز ہم نے اٹھوائے

حاصلِ زندگی ہے اک وہ رات
چاند باہوں میں جب پگھل جائے

پتھر کے خدا وہاں بھی پائے
ہم چاند سے آج لوٹ آئے

دیواریں تو ہر طرف کھڑی ہیں
کیا ہو گئے مہربان سائے

جنگل کی ہوائیں آ رہی ہیں
کاغذ کا یہ شہر اڑ نہ جائے

وہ بھی سراہنے لگے اربابِ فن کے بعد
دادِ سخن ملی مجھے ترکِ سخن کے بعد

اعلانِ حق میں خطرۂ دار و رسن تو ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد

انساں کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں
دو گز زمیں بھی چاہیئے دو گز کفن کے بعد

ہونٹوں کو سی کے دیکھیے پچھتائیے گا آپ
ہنگامے جاگ اٹھتے ہیں اکثر گھٹن کے بعد

دستور کیا یہ شہرِ ستمگر کے ہو گئے
جو سر اٹھا کے نکلے تھے بے سر کے ہو گئے

یہ شہر تو ہے آپ کا آواز کس کی تھی
دیکھا جو ہم نے مڑ کے تو پتھر کے ہو گئے

جب سر ڈھکا تو پاؤں کھلے پھر یہ سر کھلا
ٹکڑے اسی میں پرکھوں کی چادر کے ہو گئے

ہم پر بہت ہنسے تھے فرشتے سو دیکھ لیں
ہم پھر قریب گنبدِ بے در کے ہو گئے

دل سے خلشِ دردِ جدائی نہیں جاتی
وہ آئے ہیں اور آنکھ ملائی نہیں جاتی

خار و خس تو اٹھیں راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے

اتنی لاشیں میں کیسے اٹھا پاؤں گا
آپ اینٹوں کی حرمت بچا تو چلے

بیلچے لاؤ، کھولو زمیں کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتہ تو چلے

ایک روٹی کے تعاقب میں چلا ہوں اتنا
کہ مرا پاؤں کسی اور ہی کا پاؤں لگے

جیسے دیہات میں لو لگتی ہے چرواہوں کو
بمبئی میں یونہی تاروں کی حسیں چھاؤں لگے

دال روٹی کی طلب جس کو کچل دیتی ہے
اس کی للکار بھی اک سہمی ہوئی میاؤں لگے

کہیں سے لوٹ کے ہم لڑکھڑائے ہیں کیا کیا
ستارے زیرِ قدم رات آئے ہیں کیا کیا

نشیبِ ہستی سے افسوس ہم ابھر نہ سکے
فرازِ دار سے پیغام آئے ہیں کیا کیا

چھٹا جہاں سے اس آواز کا گھنا بادل
وہیں سے دھوپ نے تلوے جلائے ہیں کیا کیا

ہاتھ آ کر لگا گیا کوئی
میرا چھپر اٹھا گیا کوئی

لگ گیا اک مشین میں میں بھی
شہر میں لے کے آ گیا کوئی

میں کھڑا تھا کہ پیٹھ پر میری
اشتہار اک لگا گیا کوئی

دل غم سے جل رہا ہے جلے پر دھواں نہ ہو
ممکن ہے اس کے بعد کوئی امتحاں نہ ہو

دنیا تو کیا خدا سے بھی گھبرا کے کہہ دیا
وہ مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہ ہو

خدا ہمیشہ ترے گلستاں کو مہکائے
گئے تھے پھول کی چاہت میں زخم کھائے

تری نظر نے بہت کچھ جہاں میں دیکھ لیا
خدا کرے اسے دل کی پرکھ بھی آ جائے

نیا حسن

کتنی رنگیں ہے فضا کتنی حسیں ہے دنیا
کتنا سرشار ہے ذوقِ چمن آرائی آج

اس سلیقے سے سجائی گئی بزمِ گیتی
تو بھی دیوارِ اجنتا سے اتر آئی آج

○

رونمائی کی یہ ساعت یہ تہی دستیٔ شوق
نہ چرا سکتا ہوں آنکھیں نہ ملا سکتا ہوں

پیار سوغات، وفا نذر، محبت تحفہ
یہی دولت ترے قدموں پہ لٹا سکتا ہوں

○

کب سے تخئیل میں لرزاں تھا یہ نازک پیکر
کب سے خوابوں میں مچلتی تھی جوانی تیری

میرے افسانے کا عنوان بنی جاتی ہے
ڈھل کے سانچے میں حقیقت کے کہانی تیری

○

مرحلے جھیل کے نکھرا ہے مذاقِ تخلیق
سعیٔ پیہم نے دیئے ہیں یہ خد و خال تجھے

زندگی چلتی رہی کانٹوں پہ، انگاروں پر
جب ملی اتنی حسیں اتنی سبک چال تجھے

○

تیری قامت میں ہے انساں کی بلندی کا وقار
دخترِ شہر ہے، تہذیب کا شہ کار ہے تو

اب نہ جھپکے گی پلک اب نہ ہٹیں گی نظریں
حسن کا میرے لیے آخری معیار ہے تو

○

یہ ترا پیکرِ سیمیں، یہ گلابی ساڑی
دستِ محنت نے شفق بن کے اڑھا دی تجھ کو

جس سے محروم ہے فطرت کا جمالِ رنگیں
تربیت نے وہ لطافت بھی سکھا دی تجھ کو

○

آگہی نے تری باتوں میں کھلائیں کلیاں
علم نے شکریں لہجے میں نچوڑے انگور

دلربائی یہ انداز کسے آتا تھا
تو ہے جس سانس میں نزدیک اسی سانس میں دور

○

یہ لطافت، یہ نزاکت، یہ حیا، یہ شوخی
سو دیئے جلتے ہیں امڈی ہوئی ظلمت کے خلاف

لبِ شاداب پہ چھلکی ہوئی گلنار ہنسی
اک بغاوت ہے یہ آئینِ جراحت کے خلاف

○

حوصلے جاگ اٹھے سوزِ یقیں جاگ اٹھا
نگہِ ناز کے بے نام اشاروں کو سلام

تو جہاں رہتی ہے اس ارضِ حسیں پر سجدہ
جن میں تو ملتی ہے ان راہگذاروں کو سلام

○

آ قریب آ کہ یہ جوڑا میں پریشاں کر دوں
تشنہ کامی کو گھٹاؤں کا پیام آ جائے

جس کے ماتھے سے ابھرتی ہیں ہزاروں صبحیں
میری دنیا میں بھی ایسی کوئی شام آ جائے

○



کبھی جمود کبھی صرف انتشار سا ہے
جہاں کو اپنی تباہی کا انتظار سا ہے
منو کی مچھلی، نہ کشتیِ نوح اور یہ فضا
کہ قطرے قطرے میں طوفان بیقرار سا ہے
میں کس کو اپنے گریباں کا چاک دکھلاؤں
کہ آج دامن یزداں بھی تار تار سا ہے
سجا سنوار کے جس کو ہزار ناز کیے
اسی پہ خالق کونین شرمسار سا ہے
تمام جسم ہے بیدار فکر خوابیدہ
دماغ پچھلے زمانے کی یادگار سا ہے
سب اپنے پاؤں پہ رکھ رکھ کے پاؤں چلتے ہیں
خود اپنے دوش پہ ہر آدمی سوار سا ہے
جسے پکارئیے ملتا ہے اک کھنڈر سے جواب
جسے بھی دیکھئے ماضی کا اشتہار سا ہے
ہوئی تو کیسے بیاباں میں آکے شام ہوئی
کہ جو مزار یہاں ہے مرا مزار سا ہے
کوئی تو سود چکائے کوئی تو ذمہ لے
اُس انقلاب کا جو آج تک ادھار سا ہے





جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں
پھول کیا، شگوفے کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں
رقص کرنے لگتی ہیں مورتیں اجنتا کی
مدّتوں کے لب بستہ غار گانے لگتے ہیں
پھول کھلنے لگتے ہیں اجڑے اجڑے گلشن میں
پیاسی پیاسی دھرتی پر ابر چھانے لگتے ہیں
لمحے بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحے بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں



مجروح سلطانپوری



مجروح سلطانپوری (پ ۱۹۱۵ء)

عکسِ تحریر

۲۶ جنوری سنہ ۹۰ء

بمبئی

خود فراموش نمودی و تفحص کردی

ورنہ این تکیۂ درویش ہماں است کہ بود

بدعائے عافیت عزیزاں

مجروح

مجروح سلطانپوری

• تاریخ پیدائش: ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک کے کسی ماہ میں • تعلیم: عربی، فارسی، طب یونانی • طبابت: صرف ایک سال ۱۹۳۹ء • ۱۹۴۵ء سے ذریعۂ معاش: فلموں میں نغمہ نگاری • میرا مجموعہ کلام: غزل، اس بار ۱۹۸۹ء میں میرے بھانجے آباد احمد خاں نے ۶/۱۲ ۴۳۔ بی۔ گلبرگ۔ فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸ سے شائع کیا ہے ۱۹۵۶ء سے اب تک نام غزل ہی ہے آئندہ بھی یہی نام رہے گا۔

میں ایک زمیندار نما کسان کا اکیلا بیٹا ہوں۔ میرا نام اسرار حسن خاں اور تخلص مجروح سلطانپوری ہے نسلاً مسلم راجپوت ہوں۔ تعلیم عربی، فارسی کی ہے۔ اور عربی ہی میں طب یونانی کی سند تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے لی۔ ایک سال تک کامیابی کے ساتھ پریکٹس کرنے کے باوجود اپنے وطن سلطانپور میں جہاں شعر و شاعری کا اودھ کے دوسرے چھوٹے شہروں کی طرح ماحول تھا، خود بھی ایک شاعر کی حیثیت سے پہلی بار اس ماحول میں قدم رکھا اور ۱۹۴۰ء سے اسی کا حصہ بن کر رہ گیا یعنی حکیمی چھوڑی اور شاعری اختیار کی، مشاعروں میں جانے لگا پہلے دو چار غزلیں کہیں، پھر نظمیں کہنے لگا۔ نظمیں اتنی غنائی ہوتی تھیں کہ اگر انھیں ہم ادبی گیت کہیں تو درست ہوگا۔ البتہ کچھ نظمیں اور بھی ہیں جو اس زمرے میں نہیں آتیں، مگر وہ ہی تین سال بعد طبیعت پھر غزل کی طرف مائل ہوگئی۔ جس میں سب سے زیادہ

خاموش تصرف پیر و مرشد جناب رشید احمد صدیقی صاحب کا رہا ہے حالانکہ میری بعض غلطیوں پر سب سے سخت تنقیدی جملہ بھی انھیں کا ہے، ابتدائی دور میں اپنے کلام پر مولانا عبدالباری آسی لکھنوی سے دو چار مہینے مشورہ سخن کیا، پھر یہ سلسلہ کبھی اور کہیں پھر سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گو حضرت جگر مرادآبادی میری تعمیر و تہذیب میں پہلے اہم شخص ہیں جن سے میں نے مصرعوں پر تو اصلاح نہیں لی مگر میری طبع شاعرانہ کی اصلاح میں ان کا بڑا ہاتھ ہے ۱۹۴۵ء میں انھیں کے ساتھ ایک مشاعرے میں بمبئی آیا اور فلموں کے وسیلے سے یہیں رہ گیا۔ تب سے فلموں سے وابستگی ہی میرا ذریعہ معاش ہے۔ فلمی گیتوں کو میں نے اپنا کوئی بڑا فنی کارنامہ کبھی نہیں سمجھا، اگرچہ اس میدان میں بھی لفظیات کے اضافے کے ساتھ نئی راہیں بھی نکالیں، جن پر آج کے گیت کار گامزن ہیں اور وہ زمانہ بھی ۱۹۴۵ء ہی کا ہے جب میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے وابستہ ہوا اور ترقی پسند زاویے سے زندگی اور فن کو دیکھنا شروع کیا اور غزلوں میں اُن کے برتنے کی ابتدا کی مگر چونکہ اس وقت تک غزل کی اپنی کوئی ایسی روایت نہیں تھی جسے ترقی پسند نقطۂ نظر سے واضح اور مستقل کہہ سکیں اس لیے اس راہ کے تنہا مسافر ہونے کی حیثیت سے ٹھوکریں بھی کھائیں اور جہاں یہ ٹھوکریں مخالفین کے لیے سنگ باری کا بہانہ بنیں، وہیں یہ بھی ہوا کہ یہی ٹھوکریں میرے بعد آنے والوں کی راہ آسان بھی کر گئیں بہ قول ثاقب لکھنوی:

بہت کانٹے نکل آئے سر رہِ منزل سے
دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو

شبلی، اقبال سہیل، حسرت موہانی اور ان کے بعد جمیل مظہری، مجاز اور جذبی نے غزل میں ان موضوعات پر جستہ جستہ طبع آزمائی ضرور کی مگر کوئی ایسی مستقل روایت قائم نہیں ہو سکی جس کے سہارے آسانی اور سلامت روی کے ساتھ آگے بڑھا جا سکے، اور غزل میں طبقاتی شعور کا تو اس وقت تک دُور دُور پتہ نہ تھا۔ میر کے صرف دو شعر ایسے ہیں جنھیں ایک اشارہ کہا جا سکتا ہے، ورنہ طبقاتی شعور تو ان میں بھی نہیں تھا۔ اور اس عہد میں یہ ممکن بھی نہیں تھا، چنانچہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۱ء / ۱۹۵۳ء تک کے اس چھ سات سال کے عرصے کو اپنی پیش روی کے نام سے منسوب کرتا ہوں، جس کے قائل کچھ لوگ تو ہیں اور کچھ لوگ جن کی نظر اس پر نہیں ہے وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

میں نے بہت زیادہ نہیں کہا ہے یعنی اتنا کہ اُس سے کوئی ضخیم دیوان مرتب کر سکتا مگر میں اپنی جگہ مطمئن ہوں کہ میں نے اردو زبان کو کئی ایسے اشعار دیے ہیں جو ہندستان پاکستان اور دوسرے ممالک کے اردو داں حلقے میں زبان زد محاوروں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، اس دلچسپ مگر دردناک حقیقت کے ساتھ کہ اُن میں کے بیشتر اشعار میرے نام کے بجائے دوسروں کے نام سے جانے جاتے ہیں مثلاً:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر ۔۔۔۔ لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار ___ رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح ___ اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں ___ ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ ___ جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے ___ میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ ___ اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

اور غزل کی روایت کے علی الرغم محبوب کو منزل کے بجائے رفیقِ سفر کہتے ہوئے یہ شعر

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے ___ ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ ___ پھاڑے ہوں گے ہم نے عزیزو! چاک گریباں تم نے زیادہ

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے ___ جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

یوں تو میں نے کچھ قابلِ ذکر اشعار اور بھی کہے ہیں مگر یہ نوشتہ اشعار وہ ہیں جو ملک اور ملک سے باہر اُردو دنیا میں زبان زد ہیں۔ اور ان جیسے کئی اشعار جن میں سے کئی رہ جاتے ہیں کہ یہاں اُن کے تفصیل کی جگہ نہیں ہے۔ میں نے کہیں کہا ہے کہ میری غزلوں کا پہلا اڈیشن انجمن ترقی اُردو نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا تھا مگر یہ میری یادداشت کی غلطی ہے۔ دراصل پہلا اڈیشن ٹائپ پر ۱۹۵۶ء میں کیمو پریس سے انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا تھا' اس کے بعد اس انجمن نے اور بھی کئی اڈیشن شائع کیے' پھر بمبئی کے ایک ادارے 'فن کار' نے ایک اڈیشن شائع کیا پھر ۱۹۷۰ء میں خود میں نے اور ۱۹۸۴ء میں حسامی بک ڈپو، حیدر آباد نے شائع کیا۔ اس پورے عرصے میں نیا کلام بھی نئے اڈیشنوں میں شائع ہوتا رہا۔ اور بہت سا پرانا کلام رد بھی ہوتا رہا' اس لیے کتاب کی ضخامت 'تقریباً ہمیشہ وہی رہی اور یہ چوں کہ اندازِ سخن میں کوئی قابلِ ذکر موضوعاتی تبدیلی نہیں ہوئی اسی لیے ہر اڈیشن میں کتاب کا وہی پہلا نام رہا یعنی 'غزل' حالانکہ ایک صاحب کی اطلاع اگر صحیح ہے تو لطیفہ سے کم نہیں کہ میری کتاب ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کی انتخابی فہرست تک میں بھی کبھی شامل نہیں کی گئی اس لیے کہ اس کو وہی پرانی کتاب "غزل" سمجھا گیا۔ مگر چونکہ یہ ایوارڈ وغیرہ عام لوگوں کی نظر میں ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کی نظر میں کسی ادبی سلسلے میں ملک سے باہر کے سفر بھی ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اس لیے یہ اظہار بے محل نہ ہوگا کہ مجھے دو مرتبہ یو پی اردو اکادمی سے ایوارڈ مل چکے ہیں اور ۹۰ء میں دہلی سے غالب نیشنل ایوارڈ سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔ اور دو تین ماہ قبل لکھنؤ سے میر اکادمی نے شعری خدمات کے اعتراف

کے طور پر ایوارڈ کی اطلاع دی ہے اور اب اس بار آپ کی طرف سے اس نوازش کی اطلاع آئی ہے۔

غیر ممالک کے سلسلے میں ۱۹۶۹ء میں غالب صدی میں شرکت کے لیے ماسکو اور تاشقند مدعو کیا گیا، ۱۹۷۹ء میں ماریشس ایک اردو ہندی ورکشاپ میں شرکت کے لیے اپنی وزارت خارجہ کی جانب سے بھیجا گیا اور ۱۹۸۳ء میں انجمن اردو کناڈا نے مشاعرے میں شرکت کے لیے مدعو کیا اور اسی زمانے میں امیر خسرو[۱] سوسائٹی شکاگو، برکلے یونیورسٹی کی انجمن اردو اور مینے سوٹا یونیورسٹی کی ادبی انجمن نے بھی دعوت دی۔ رہا پاکستان وہاں تو ہم اردو والوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔ اب تک تین بار میں بھی جا چکا ہوں۔

انتخابِ کلام :

مہ و خورشید بھی ساغر بکف ہو کر اتر آئے / بوقت بادہ نوشی جب نچوڑی آستیں میں نے
وہ بعد عرض مطلب ہائے شوقِ جواب اپنا / کہ وہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں سنیں میں نے

دستِ منعم مری محنت کا خریدار سہی / کوئی دن اور میں رسوا سرِ بازار سہی
جست کرتا ہوں تو لڑ جاتی ہے منزل سے نظر / حائلِ راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

دل سے ملتی تو ہے اک راہ کہیں سے آکر / سوچتا ہوں یہ تری راہ گذر ہے کہ نہیں
دیکھ کلیوں کا چٹکنا سرِ گلشن صیاد / زمزمہ سنج مرا خونِ جگر ہے کہ نہیں

اہلِ تقدیر یہ ہے معجزۂ دستِ عمل / جو خزف میں نے اٹھایا وہ گہر ہے کہ نہیں
اک ستم گر تو کہ وجہ صد خرابی تیرا درد / اک بلاکش میں کہ تیرا درد کام آ ہی گیا
ہم قفس صیاد کی رسمِ زباں بندی کی خیر / بے زبانوں کو بھی اندازِ کلام آ ہی گیا

گو خاکِ نشیمن پر اب بھی ہیں گریہ کناں اربابِ چمن / جب برق تڑپ کر ٹوٹی تھی اس وقت کا عالم کیا ہوگا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر / لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق / خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

سنتے ہیں کہ کانٹے سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے / کہتا ہے مگر یہ عزمِ جنوں صحرا سے گلستاں دور نہیں

یہ آگ اور نہیں دل کی آگ ہے ناداں / چراغ ہو کہ نہ ہو جل بجھیں گے پروانے
فریبِ ساقیِ محفل نہ پوچھیے مجروح / شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیمانے

۱؎ انھوں نے میری کئی غزلوں کا میری ہی آواز میں ایک البم (لانگ پلے ینگ ریکارڈ) بھی بنایا ہے۔

فریب کھا کے ان آنکھوں کا کب تلک اے دل — شراب خام پئیں رقصِ ناتمام کریں
غمِ حیات نے آوارہ کر دیا ورنہ — تھی آرزو کہ ترے در پہ صبح و شام کریں
یہ شوق کامیاب، یہ تم، یہ فضا، یہ رات — کہہ دو تو آج روک دوں بڑھ کر سحر کو میں
زندگی کی قدر سیکھی شکریہ تیغِ ستم — ہاں ہمیں تھے کل تلک جینے سے اکتائے ہوئے
اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم — اٹھنے کو اُٹھ تو آئے ترے آستاں سے ہم
سیاہیاں شبِ فرقت کی ہم نفس مت پوچھ — کسی کو یاد جو کیجے تو یاد آ نہ سکے
بڑھائی مے جو محبت سے آج ساقی نے — یہ کانپے ہاتھ کہ ساغر بھی ہم اُٹھا نہ سکے
اس طرح سے کچھ رات کو ٹوٹے ہیں ستارے — جیسے وہ تری لغزشِ پا دیکھ رہے ہوں

نہ مٹ سکیں گی یہ تنہائیاں مگر اے دوست — جو تو بھی ہو تو طبیعت ذرا بہل جائے
کس کس کو ہائے تیرے تغافل کا دوں جواب — اکثر تو رہ گیا ہوں جھکا کر نظر کو میں
اللہ رے وہ عالمِ رخصت کہ دیر تک — تکتا رہا ہوں یوں ہی تری رہگذر کو میں
قدم کو فیضِ جنوں سے وہ آبلہ ہے نصیب — جو خارِ راہ کو بھی شمعِ رہگذار کرے
جگائیں ہمسفروں کو اٹھائیں پرچمِ شوق — نہ جانے کب ہو سحر کون انتظار کرے
دیارِ جور میں رستہ ہے اک یہی ورنہ — کسے پسند ہے اے دل کہ سیر دار کرے
ستم اک تیغِ ستم دیں اسے جو اے مجروح — غزل کو قتل کرے نغمے کو شکار کرے
گلوں سے بھی نہ ہوا جو مرا پتہ دیتے — صبا اڑاتی پھری خاک آشیانے کی
جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے — تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی
دل کی تمنا تھی مستی میں منزل سے بھی دور نکلتے — اپنا بھی کوئی ساتھی ہوتا ہم بھی بہکتے چلتے چلتے
ہم ہی کعبہ، ہم ہی بت خانہ، ہمیں ہیں کائنات — ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجیے
کچھ بتا تو ہی نشیمن کا پتہ — میں تو اے بادِ صبا بھول گیا
دلِ سادہ نہ سمجھا ما سوائے پاک دامانی — نگاہِ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے
کہیں ظلمتوں میں گھِر کر ہے تلاشِ دستِ رہبر — کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں
ترے خانماں خرابوں کا چمن کوئی نہ صحرا — یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ ـــــ تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دیں ہیں باہیں

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن، جوشِ بہار ـــــ رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

ڈرا کے موجِ تلاطم سے ہم نشینوں کو ـــ یہی تو ہیں جو ڈبویا کیے سفینوں کو
شراب ہو ہی گئی ہے بقدرِ پیمانہ ـــ بہ عزمِ ترک نچوڑا جو آستینوں کو
جمالِ صبح دیا، روئے نوبہار دیا ـــ مری نگاہ بھی دیتا خدا حسینوں کو
ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں ـــ چراغِ راہ کیے خوں چکاں جبینوں کو

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں ـــ نغمۂ سحر بھی ہے، آہ صبح گاہی بھی
شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا ـــ میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی، راہی بھی

کہاں وہ شب کہ ترے گیسوؤں کے سائے میں ـــ خیالِ صبح سے ہم آستیں بھگو دیتے
بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لیے ـــ ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے
بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ ـــ کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ ـــ سوچتی رہے دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے
میرے شکوۂ غم سے عالمِ ندامت میں ـــ اس لبِ تبسم پر شمع سی فروزاں ہے

ہٹ کے روئے یار سے تزئینِ عالم کر گئیں ـــ وہ نگاہیں جن کو اب تک رائیگاں سمجھا تھا میں

پاکبازی میں ہے نورِ عارضِ لالہ رخاں ـــ ہیں سیہ کاری میں کحلِ نرگسِ مستانہ ہم

بس پھیر کے منہ خار قدم کھینچ رہے تھے ـــ دیکھا تو نہاں قافلۂ ہم سفراں ہے
کام آئے بہت لوگ سرِ مقتلِ ظلمات ـــ اے روشنیٔ کوچۂ دلدار کہاں ہے
اے فصلِ جنوں ہم کو پئے شغلِ گریباں ـــ پیوند ہی کافی ہے اگر جامہ گراں ہے

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی ـــ کبھی اک چراغ بجھا دیا، کبھی اک چراغ جلا دیا

الگ بیٹھے ہیں پھر بھی آنکھ ساقی کی پڑی تھی ہم پر ـــ اگر ہے تشنگی کامل تو پیمانے بھی آئیں گے

سیلِ رنگ آ ہی رہا ہے مگر اے کشتِ چمن ـــ ضربِ موسم تو پڑی، بند بہاراں تو کھلا

دستِ پُرخوں کو کفِ دستِ نگاراں سمجھے ـــ قتل گہ تھی جسے ہم محفلِ یاراں سمجھے

ترے سوا بھی کہیں تھی پناہ بھول گئے ـــ نکل کے ہم تری محفل سے راہ بھول گئے

حرم سے میکدے تک منزلِ یک عمر تھی ساقی
سہارا اگر نہ دیتی لغزشِ پیہم تو کیا کرتے

سوال اُنکا، جواب اُنکا، سکوت اُنکا، خطاب اُنکا
ہم ان کی انجمن میں سر نہ کرتے خم تو کیا کرتے

خودکشی ہی راس آئی دیکھ بدنصیبوں کو
خود سے بھی گریزاں ہیں بھاگ کر زمانے سے

نظارہ ہائے دہر بہت خوب ہیں مگر
اپنا لہو بھی سرخیِ شام و سحر میں ہے

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

جھونکے جو لگ رہے ہیں نسیمِ بہار کے
جنبش میں ہے قفس بھی اسیرِ چمن کے ساتھ

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

کہاں بچ کر چلی اے فصلِ گل مجھ آبلہ پا سے
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ، ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے، مرے شعر و نغمہ میں آ گئی
وہی لب نہ میں جنھیں چھو سکا قدحِ شراب میں ڈھل گئے

وہی آستاں ہے، وہی جبیں، وہی اشک ہے، وہی آستیں
دلِ زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

تجھے چشمِ مست پتہ بھی ہے کہ شباب گرمیِ بزم ہے
تجھے چشمِ مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

مرے کام آ گئیں آخرش یہی کاوشیں، یہی گردشیں!
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

○

ہمیں شعورِ جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے
نگاہ بن کے حسینوں کی انجمن میں رہے

تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جُنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے

نہ ہم قفس میں رُکے مثلِ بوئے گل صیّاد
نہ ہم مثالِ صبا حلقۂ رسن میں رہے

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے ق
بنے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

سرشکِ رنگ نہ بخشے تو کیوں ہو بارِ مژہ
لہو حنا نہیں بنتا تو کیوں بدن میں رہے

مجھے نہیں کسی اسلوبِ شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

ہجومِ دہر میں بدلی نہ ہم سے وضعِ خرام
گری کلاہ، ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

یہ حکم ہے رہے مٹھی میں بند سیلِ نسیم
یہ ضد ہے بحرِ تپاں کوزۂ کہن میں رہے

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروحؔ
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

○

اہلِ طوفاں آؤ، دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو، بھنور کو چشمِ جانانہ کہیں

دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلفِ صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں

وہ شہِ خوباں کدھر ہے پھر چلیں اُس کے حضور
زندگی کو دل کہیں اور دل کو نذرانہ کہیں

سرخیِ مے کم تھی میں نے چھو لیے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب اربابِ میخانہ کہیں

تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیے میکدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

پارۂ دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

اے رخِ زیبا بتا دے اور ابھی ہم کب تلک
تیرگی کو شمع، تنہائی کو پروانہ کہیں

آرزو ہی رہ گئی مجروحؔ کہتے ہم کبھی
اک غزل ایسی جسے تصویرِ جانانہ کہیں

○

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
ہاتھ آ گیا ہے دولتِ بیدار کی طرح

وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہِ یار کی طرح

سیدھی ہے راہِ شوق پہ یونہی کہیں کہیں
خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

اب جا کے کچھ کھلا ہنرِ ناخنِ جنوں
زخمِ جگر ہوئے لب و رخسار کی طرح

مجروحؔ لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

○

گو رات مری صبح کی محرم تو نہیں ہے
سورج سے ترا رنگِ حنا کم تو نہیں ہے

کچھ زخم ہی کھائیں چلو کچھ گل ہی کھلائیں
ہر چند بہاراں کا یہ موسم تو نہیں ہے

چاہے وہ کسی کا ہو لہو دامنِ گل پر
صیاد یہ کل رات کی شبنم تو نہیں ہے

اتنی بھی ہمیں بندشِ غم کب تھی گوارا
پردے میں تری کاکلِ پُرخم تو نہیں ہے

اب کارگہِ دہر میں لگتا ہے بہت دل
اے دوست کہیں یہ بھی ترا غم تو نہیں ہے
صحرا میں بگولا بھی ہے مجروحؔ صبا بھی
ہم سا کوئی آوارۂ عالم تو نہیں ہے

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے سات چلے
دیارِ شام نہیں، منزلِ سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے
ہوا اسیر کوئی ہمنوا تو دُور تلک !
بپاسِ طرزِ نوا ہم بھی ساتھ سات چلے
ہمارے لب نہ سہی وہ دہانِ زخم سہی!
وہیں پہنچتی ہے یارو کہیں سے بات چلے
ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
بچا ہی لائے ہم اے یار پھر بھی نقدِ وفا
اگرچہ لٹتے ہوئے رہزنوں کے ہات چلے
پھر آئی فصل کہ مانندِ برگِ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے
قطارِ شیشہ ہے یا کاروانِ ہم سفراں
خرامِ جام ہے یا جیسے کائنات چلے
بلا ہی بیٹھے جب اہلِ حرم تو اے مجروحؔ
بغل میں ہم بھی لیے اک صنم کا ہات چلے

سُوئے مقتل کہ پئے سیرِ چمن جاتے ہیں
اہلِ دل جام بہ کف سر بہ کفن جاتے ہیں
آ گئی فصلِ جنوں، کچھ تو کرو دیوانو
ابر صحرا کی طرف سایہ فگن جاتے ہیں
اس کو دیکھا نہیں تم نے کہ یہی کوچہ و راہ
شاخِ گل شوخیِ رفتار سے بن جاتے ہیں
بلبلو، اپنی نوا فیض ہے اُن آنکھوں کا
جن سے ہم سیکھنے اندازِ سخن جاتے ہیں
جو ٹھہرتی تو ذرا چلتے صبا کے ہمراہ
یوں بھی ہم روز کہاں سوئے چمن جاتے ہیں
لُٹ گیا قافلۂ اہلِ جنوں بھی شاید
لوگ ہاتھوں میں لیے تارِ رسن جاتے ہیں
روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو، ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کیے ہیں ہم نے عزیزو، چاک گریباں تم سے زیادہ
چاکِ جگر محتاجِ رفو ہے آج تو دامن صرفِ لہو ہے
اک موسم تھا ہم کو رہا ہے شوقِ بہاراں تم سے زیادہ

عہدِ وفا یاروں سے نبھائیں، نازِ حریفاں ہنس کے اٹھائیں
جب ہمیں ارماں تم سے سوا تھا، اب ہیں پشیماں تم سے زیادہ

ہم بھی ہمیشہ قتل ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دور سے لیکن
یہ نہ سمجھنا ہم کو ہوا ہے جان کا نقصاں تم سے زیادہ

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشنِ چراغاں تم سے زیادہ

دیکھ کے الجھن زلفِ دوتا کی کیسے الجھ پڑتے ہیں ہوا سے
ہم سے سیکھو ہم کو ہے یارو فکرِ نگاراں تم سے زیادہ

زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے تو مجروحؔ مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں عالمِ زنداں تم سے زیادہ

○

چمن ہے مقتلِ نغمہ اب اور کیا کہیے
بس اک سکوت کا عالم جسے نوا کہیے

اسیرِ بندِ زمانہ ہوں صاحبانِ چمن
مری طرف سے گلوں کو بہت دعا کہیے

یہی ہے جی میں کہ وہ رفتۂ تغافل و ناز
کہیں ملے تو وہی قصۂ وفا کہیے

اسے بھی کیوں نہ پھر اپنے دلِ زبوں کی طرح
خرابِ کاکل و آوارۂ ادا کہیے

یہ کوئے یار، یہ زنداں، یہ فرشِ میخانہ
انھیں ہم اہلِ تمنا کے نقشِ پا کہیے

وہ ایک بات ہے کہیے طلوعِ صبحِ نشاط
کہ تابشِ بدن و شعلۂ حنا کہیے

وہ ایک حرف ہے کہیے اسے حکایتِ زلف
کہ شکوۂ رسن و بندشِ بلا کہیے

رہے نہ آنکھ تو کیوں دیکھیے ستم کی طرف
کٹے زبان تو کیوں حرفِ ناروا کہیے

پکاریے کفِ قاتل کو اب معالجِ دل
بڑھے جو ناخنِ خنجر، گرہ کشا کہیے

پڑے جو سنگ تو کہیے اسے نوالۂ زر
لگے جو زخم بدن پر اسے قبا کہیے

فسانہ جبر کا یاروں کی طرح کیوں مجروحؔ
مزہ تو جب ہے کہ جو کہیے برملا کہیے

○

بنامِ کوچۂ دلدار گل برسے کہ سنگ آئے
ہنسے جب چاکِ پیراہن نہ کیوں چہرے پہ رنگ آئے

بچاتے پھرتے آخر کب تلک دستِ عزیزاں سے
انھیں کو سونپ کر ہم تو کلاہِ نام و ننگ آئے

ہنسو مت اہلِ دل اپنی سی جانو بزمِ خوباں میں
چلے آئے ادھر ہم بھی بہت جب دل سے تنگ آئے

کہاں صحنِ چمن میں بات کوئے سرفروشاں کی
ادھر سے سادہ رو نکلے ادھر سے لالہ رنگ آئے

کرو مجروحؔ تب دار و رسن کے تذکرے ہم سے
جب اس قامت کے سائے میں تمہیں جینے کا ڈھنگ آئے

اس باغ میں وہ سنگ کے قابل کہا نہ جائے
جب تک کسی ثمر کو مرادِ دل کہا نہ جائے

شاخوں پہ نوکِ تیغ سے کیا کیا کھلے ہیں پھول
اندازِ لالہ کاری قاتل کہا نہ جائے

یہ خارِ شوخ رنگ ہیں کس کے لہو کے رنگ
کیا گل کتر گئی رہِ منزل کہا نہ جائے

یاراں کے منتظر ہیں سمندر پہ تشنہ لب
احوال میزبانیِ ساحل کہا نہ جائے

میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیرِ بام و در
میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کہا نہ جائے

زنداں کھلا ہے جب سے ہوئے ہیں رہا اسیر
ہر گام ہے وہ شورِ سلاسل کہا نہ جائے

ہم اہلِ عشق میں نہیں حرفِ گنہ سے کم
وہ حرفِ شوق جو سرِ محفل کہا نہ جائے

جس ہاتھ میں ہے تیغِ جفا اس کا نام لو
مجروح سے تو سائے کو قاتل کہا نہ جائے

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب کے جنوں خیز بہت ہے

اِس آئے تو ہے چھاؤں بہت برگ و شجر کی
ہاتھ آئے تو ہر شاخ ثمر ریز بہت ہے

لوگو مری گل کاری وحشت کا صلہ کیا
دیوانے کو اک حرفِ دل آویز بہت ہے

منعم کی طرح پیرِ حرم پیتے ہیں وہ جام
رندوں کو بھی جس جام سے پرہیز بہت ہے

مصلوب ہوا کوئی سرِ راہِ تمنا
آوازِ جرس پچھلے پہر تیز بہت ہے

مجروح سنے کون تری تلخ نوائی
گفتارِ عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

[1] داغ سے مہکی ہوئی زخموں سے لالہ پیرہن
کس قدر ملتی ہے شاخِ درد سے شاخِ چمن

فرشِ گل مینائے مے، شمعِ سحر، سازِ سخن
سب اٹھے لیکن نہ اٹھا میں خرابِ انجمن

مژدہ اے یارانِ تشنہ دل سے پھوٹا پھر لہو
اے شبِ تارِ عزیزاں پھر جلا داغِ کہن

ساز میں یہ شورشِ غم لائے مطرب کس طرح
اس کی دھن پابندِ نے نغمہ ہمارا نے شکن

دیکھیے کب تک بلائے جاں رہے اک حرفِ شوق
دل حریصِ گفتگو اور چشمِ خوباں کم سخن

سچ تو ہے مجروح نے اس گل سے کچھ پیماں لیے
یہ خبر لیکن کہاں سے لے اڑا مرغِ چمن

---

[1] یہ غزل محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی فرمائش پر کہ "اقبال کی کسی غزل کو سامنے رکھ کر غزل کہہ کر بھیجو" تعمیلِ ارشاد کے طور پر کہی گئی۔ زمانہ اقبال صدی کے جشنوں کا ہے۔ مجروح



وہ تو گیا یہ دیدۂ خوں بار دیکھیے
دامن پہ رنگ پیرہن یار دیکھیے

دکھلا کے وہ تو لے بھی گیا شوخی خرام
ابتک ہیں رقص میں درو دیوار دیکھیے

اُکتا کے ہم نے توڑی تھی زنجیر نام و ننگ
ابتک فضا میں ہے وہی جھنکار دیکھیے

سینے میں چھپ گیا ہے طلوع سحر کے ساتھ
اب شاخ دل پہ وہ گل رخسار دیکھیے

برق تپیدہ، باد صبا، شعلہ اور ہم
ہیں کیسے کیسے اس کے گرفتار دیکھیے

پہلے بھی تیز رو تھے پر اس دل نشیں کے ساتھ
یہ چشم نم پہ مستی رفتار دیکھیے

مجروح کے لبوں سے یہ خوشبو نہ جا سکی
بخشی جو اس نے دولت بیدار دیکھیے

مسعود حسین خاں



مسعود حسین (پ۔ ۱۹۱۸ء)

عکسِ تحریر

میری غزل

ترے خیال سے رقصِ رواں ہے میری غزل
تری نگاہ سے اب تک جواں ہے میری غزل

یہ لفظ و معنی کا رشتہ، یہ میرا تیرا وجود
ذرا میں پیدا، ذرا میں نہاں ہے میری غزل

ہدف شناس! یہ دل ترے انتظار میں ہے
تری نظر کو دے تو کماں ہے میری غزل

ترے وجود میں پنہاں ہوں مثلِ آتشِ گل
مرے وجود میں جیسے نہاں ہے میری غزل

تری نگاہ نے بخشی وہ رفعتِ جذبات
کہ اس زمین میں بھی آسماں ہے میری غزل

کہاں سے اہلِ سخن لائیں طالعِ مسعود
وہاں گزر نہیں ممکن جہاں ہے میری غزل

۱۳/ مئی ۱۹۸۷ء

مسعود حسین

مسعود حسین

میرا تعلق قائم گنج، ضلع فرخ آباد (یو۔ پی) کے ایک آفریدی پٹھان گھرانے سے ہے جو سیف و قلم دونوں کے لیے مشہور رہا ہے۔ میرے مورثِ اعلیٰ حسین خاں، معروف بہ "بڑے آخون" (بڑا استاد) محمد شاہ کے عہد میں دیگر آفریدی 'خیلوں' کے ساتھ تیرہ کے آزاد علاقے سے تلاشِ معاش میں محمد خاں بنگش کے آباد کردہ قصبے قائم گنج آ کر "متول خیل" محلے میں آباد ہو گئے۔ دیگر پٹھان گھرانوں کے برخلاف انھوں نے تلوار کے مقابلے میں قلم کو ترجیح دی اور نوارد پٹھانوں کے بچوں کی تربیت و تدریس کا پیشہ اختیار کر کے 'بڑے استاد' کی عرفیت حاصل کی۔ ان کے بعد تین نسلوں تک پیشۂ آبا سپہ گری رہا تا آں کہ میرے دادا فدا حسین خاں نے حیدر آباد میں سکونت اختیار کی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ اس پیشے میں نہایت کامیاب رہے لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ۳۹ سال کی عمر میں ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا۔ میرے والد مظفر حسین خاں نے اپنی والدہ کے ساتھ شمالی ہند واپس آ کر اٹاوہ اور علی گڑھ میں اپنی تعلیم مکمل کی اور لوٹ کر ریاست حیدر آباد میں سب ججی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور ۲۹ برس کی عمر میں ۱۹۲۲ء میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے وقت میری عمر چار سال کی تھی۔ دو سال کے بعد میری والدہ فاطمہ بیگم نے بھی انتقال کیا جو قائم گنج کے رئیس اعظم جان عالم خاں کی دختر تھیں۔ میری ابتدائی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ دس برس کی عمر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ جا کر دوسرے درجے میں داخلہ لیا۔ بچپن میں میں اپنی نانی 'بی' کی شخصیت سے بہت متاثر رہا، بڑی شاندار اور رکھ رکھاؤ کی خاتون تھیں۔ ۶ سال تک جامعہ کا طالب علم رہنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں اپنے چھوٹے چچا ڈاکٹر محمود حسین کے ہمراہ ڈھاکے چلا گیا، جہاں ان کا ریڈر شعبۂ تاریخ کی حیثیت سے تقرر حال میں ہوا تھا۔ ڈھاکہ بورڈ سے میں نے ۱۹۳۵ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۳۷ء میں انٹرمیڈیٹ اعزازات کے ساتھ پاس کیے۔ بی۔ اے کے لیے پھر دہلی مراجعت کی اور اینگلو عربک کالج (دہلی یونیورسٹی) سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ ۱۹۳۹ء میں ایم۔ اے اردو میں جا کر مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اور ۱۹۴۱ء میں پہلے درجے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد کچھ

عرصے تک آل انڈیا ریڈیو کے دہلی اسٹیشن پر ہندی، اُردو ٹاکس انچارج کی حیثیت سے کام کیا۔ دل نہ لگا تو پھر علی گڑھ مراجعت کی اور پی۔ ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا۔ سال بھر کے اندر شعبۂ اردو میں عارضی لکچرر ہو گیا اور پھر مستقل۔ ۱۹۵۰ء میں بغرض اعلیٰ تعلیم یورپ کا سفر اختیار کیا۔ لندن میں ۹ ماہ کے قیام کے بعد بالآخر پیرس یونیورسٹی منتقل ہو گیا جہاں سے ڈی۔ لٹ (ڈاکٹر۔ آف یونیورسٹی) کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں علی گڑھ واپس آ کر ریڈر ہو گیا۔ جہاں سے ۱۹۶۲ء میں پروفیسر صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے عثمانیہ یونیورسٹی چلا گیا۔ اس سے قبل ۶۰-۱۹۵۸ء تک امریکہ میں قیام کیا۔ پہلے سال ایسوسی ایشن آف ایشین اسٹڈیز کے سینئر فیلو کی حیثیت سے اور دوسرے سال کیلیفورنیا یونیورسٹی (برکلے) میں استاد کی حیثیت سے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں چھ سال تک قیام کرنے کے بعد بحیثیت صدر شعبہ لسانیات پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آ گیا۔ ۱۹۷۳ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ وائس چانسلر ہو کر چلا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں ایک بار پھر علی گڑھ کا رخ کیا۔ بالآخر ۱۹۸۰ء میں وہاں سے ریٹائر ہو گیا۔ اس کے بعد سوا سال تک کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت وزٹنگ پروفیسر کام کیا اور وہیں "اقبال کی عملی و نظری شعریات" تصنیف کی جس پر ساہتیہ اکیڈمی نے ۱۹۸۴ء کا ایوارڈ دیا۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۵ء تک ترقی اُردو بیورو کی اردو لغت کا چیف ایڈیٹر رہا۔ ۱۹۷۳ء سے جامعہ اردو کے اعزازی شیخ الجامعہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔

میں نے اپنے تعلیمی کیریئر میں ایک درجن سے زائد کتابیں شاعری، تنقید، تدوینِ متن، لسانیات اور لغات پر لکھیں اور تقریباً چار درجن مضامین اور خطبات جن میں سے بعض مجموعوں کی شکل میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۶ء تک انہماک کے ساتھ شاعری بھی کی۔ "دو نیم" کے نام سے میرا مجموعۂ کلام پہلے ۱۹۵۶ء اور طبع ثانی کے طور پر ۱۹۸۶ء میں بہ اضافہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں گیت بھی ہیں، نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ میں اپنی غزلوں سے منتخب اشعار ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

انتخابِ کلام

نہیں، اے جانِ بے قرار! نہیں
کہ وہ اتنے بھی خام کار نہیں

تیرے کہنے سے جا رہے ہیں اُدھر
مگر اے دل! یہ بار بار نہیں

سب حنا بندیٔ نظر ہے مری
ورنہ عالم میں کچھ بہار نہیں

میری آنکھوں میں نمی بھی ہو تو واللہ کیا ہے
کوئی بھی جس کو نہ دیکھے وہ تماشا کیا ہے

وہ نہ چاہیں تو مزہ چاہ میں پھر خاک ملے
ہم اگر چاہیں بھی بالفرض تو ہوتا کیا ہے

جی سُلگتا ہے، سُلگتا رہے، جلتا ہے جلے
ایسی باتوں سے بھلا عشق میں بنتا کیا ہے

ہم سے منسوب ہیں اُمّید و تمنا و خیال کوئی دیکھے تو ذرا آپ کا نقشا کیا ہے
عقل سمجھائے گی، بہلائے گی، پھسلائے گی ____ دل کی چھلنی سے مگر دیکھیے چھنتا کیا ہے

ابھی سے تیز جو امواجِ نبض ہیں مسعود ____ ہے اُس کے جام میں کچھ ماہتاب سے بڑھ کر

اے دل! اُنھیں ہم بلائیں گے کیا وہ آئیں گے کیا، نہ آئیں گے کیا
جب لاکھوں چتائیں دل میں بھڑکیں ____ آنسو بھی انھیں بجھائیں گے کیا

بڑھے گا اور زمانے میں اضطرابِ خرد ____ مگر جنوں میں بھی گہرائیاں بڑھیں گی ابھی

عشق میں اضطراب رہتا ہے جی نہایت خراب رہتا ہے
خواب سا کچھ خیال ہے لیکن ____ جان پر اک عذاب رہتا ہے

وہ قطعِ تعلق کے ڈھونڈھیں بہانے ہمیں حوصلے دل کے ہیں آزمانے
کوئی اتنے دن تک خفا کیسے ہوگا ____ انھیں جائیں گے ہم کسی دن منانے

دکھ درد کو حیواں سے کہو کیا حاصل غم اپنا بیاباں سے کہو کیا حاصل
جس نے کسی انساں کی پرستش ہی نہ کی اس طور کے انساں سے کہو کیا حاصل
جس سے نہ پڑے دل پہ اک ہلکی سی پھوار اُس خندۂ خوباں سے کہو کیا حاصل
دل رکھ بھی دیں ہم نوک پہ سوزن کی مگر اس مشکلِ آساں سے کہو کیا حاصل
یہ زخم نہ بھر پائے گا کوئی جا کر ____ اس زود پشیماں سے کہو کیا حاصل

آپ کی شوخیٔ گفتار سے جی ڈرتا ہے آج تک ایک جفاکار سے جی ڈرتا ہے
مدتوں گھر کے خیالوں میں جہاں کھویا رہا آج اس سایۂ دیوار سے جی ڈرتا ہے
ہم نے مسعود کو دیکھا ہے ملول و اداس ____ اس کا ہر شوخ طرحدار سے جی ڈرتا ہے

وہ تیرے پھول سے بولوں کی مار سہہ نہ سکا ____ غمِ جہاں پہ نہ کی جس نے آج تک فریاد

ہزار ربط رہا اُن سے یار ہا گھاتیں مگر کسی نے نہ پایا کبھی کسی کا راز
میں ما چپ ہوں یوں کہ ترا حسنِ گفتگو کھرے ____ طویل تیرا سخن ہے، مرا خیال دراز

مری دعا بھی وہی، میرا مدعا بھی وہی مجھے بتاؤ کہ ایسے میں ہے خدا بھی وہی
اک عمر میں بھی نہ آئینِ عشق بدلا یہاں ____ وہی ہے جرمِ محبت بھی اور سزا بھی وہی

آپ کو دیکھ، مرے ذوقِ فنا کو بھی دیکھ یہ تری شیشہ گری دردِ سری ہے اے دوست!

مے گلفام میں کچھ دُردِ تہِ جام سہی
وہ خوشی کیسی خوشی جس میں کمی ہے اے دوست!

تابِ پرواز تھی جن کو وہ گئے بھی مسعود
ہم کہاں جائیں کہ بے بال و پری ہے اے دوست!

ہے بجلیوں کو اشارہ کہ ہم اسیروں پر
کھلیں جو بندِ سیاست تو بندشِ غم ہو

دیارِ ہند سے جاتے ہوئے بتانِ فرنگ
وہ داغ دے گئے جس کا نہ کوئی مرہم ہو

مسعود اُس کے طرزِ ستم کو سمجھ سکے
خود چل دیا، اُمید پہ تم کو چلا دیا

اے سوزشِ دل! اب کیا دھرا ہے
کیا مدعا ہے، کیا مدعا ہے؟

کہتے ہیں ترکِ الفت کریں گے!
یہ حوصلہ ہے، یہ حوصلہ ہے!!

کیا کیا نہ سمجھیں، کیا کیا نہ سوچیں
کیا سُن رہے تھے، کیا ہو رہا ہے!

آج خوابیدہ بہاریں کیوں ہیں؟
سوچتا ہوں کہ وہ غافل تو نہیں؟

میں نے کہا کہ راز چھپایا نہ جائے گا
بولے کسی سے منہ بھی لگایا نہ جائے گا

ہو ایک دو گھڑی کا تو ہم جی پہ سہہ بھی لیں
آٹھوں پہر کا غم تو اٹھایا نہ جائے گا

کس بھاری دل سے جاتے ہیں ہم اسکے در پہ آج
سر جھک گیا وہاں تو اٹھایا نہ جائے گا

کاٹ کر تیرگی شبِ غم کی
سخت گزری دمِ سحر کی شکست

حوصلہ دیکھیے تو غنچے کا
اک تبسم! اور عمر بھر کی شکست

اس رہ گزر سے اب وہ نہ گزرے گا اے ندیم
کچھ میں نے کہہ دیا تھا، مگر اُس نے کیا کیا

میں اُس سے سرخوشی میں وہی بات کہہ گیا
کتنا بُرا کیا، اسے کتنا بُرا کیا!

کیا کیا جتن کیے نہ محبت میں اے ندیم!
کیا پوچھتے ہو کیا نہ کیا اور کیا کیا!

بازیِ عشق میں گر سود و زیاں کا ہے سوال
کس کی رسوائی گئی آپ کی شہرت سے پرے

رات کے دل میں بھی تھے گہرے خیالوں کے بھنور
کرنیں بجتی رہیں اک خواب بھی ظلمت سے پرے

سحر تھا سحرِ فرنگی کی فسوں کاری کا
وہ سیہ رات بھی اور یہ شبِ مہتاب بھی ہے

قتلِ آدم کا میں الزام صنم! کس کو دوں
تیرے ابرو پہ بھی ہے، برسرِ محراب بھی ہے

کبھی محفل سے گریزاں، کبھی جانِ محفل
تیرا مسعود بہت عام بھی، کمیاب بھی ہے

عزیز زہر ہے مجھ کو کہ جاں عزیز نہیں
مگر یہ کھا نہ سکا میں غمِ غیور کے ساتھ

مجھے گماں میں بھی اندیشۂ بہار نہیں
وہ اعتبارِ کرم ہے کہ اعتبار نہیں

جو انہونی تھی ہو نہ سکی یعنی ہونی تھی ہو بھی گئی
اُس بات کو کیوں اب دہرائیں، وہ بات جو ہمدم ہو نہ سکی

مسعود و رُود تمہارا اب اس بار محبت میں کیوں ہے
تم ہوش و خرد کے دیوانے، اک آرزو تک کم نہ ہو سکی

محبتوں کا وطیرہ بھی کیا نرالا ہے
کوئی بتا نہ سکے اور کوئی چھپا نہ سکے

اسی سے عہدِ وفا پھر سے باندھیے مسعود
ہزار بار چلے جس کے در کو جا نہ سکے

مسعود! دیکھو تم نے پھر جامِ غم پیا نہ
کہتے تھے ہم نہ کرنا وہ کام پھر کیا نہ

اب آگ سی لگی ہے اب آگ سی لگی ہے
اک داغ تم نے دل پر ناحق کو پھر لیا نہ

گر ہم سے پوچھتے ہو چاہت کا گر تو سُن لو
دل ایک بار دے کر ہم نے تو پھر دیا نہ

ترے خیال میں دل آج سوگوار سا ہے
مجھے گمان ہے کچھ اس کو انتظار سا ہے

میں سادہ دل تھا کہ دامن پہ ان کے رو بھی دیا
مگر گلوں کے دلوں میں ابھی غبار سا ہے

تجھی پہ کچھ نہیں موقوف اے دلِ محروم!
جہاں بھی دیکھیے عالم میں انتشار سا ہے

ہزار بار اسے ناکامیوں نے سمجھایا
مگر یہ دل تری الفت سے باز کب آیا

وہی لگن ہے کہ چلیے جہاں کہیں تو ہو
وہی چبھن کہ محبت سے ہم نے کیا پایا

گلوں کے گھاؤ بھی شبنم سے دُھل سکے ہیں کبھی
کہ اشک نے مرے زخموں کو اور مہکایا

یہاں بہار نہ جانِ بہار ہے مسعود
کہاں سے طرفہ غزل آج پھر یہ کہہ لایا

کہیں وہ ہو کے خفا پھر جدا نہ ہو جائے
مجھے تو ڈر ہے وہی ماجرا نہ ہو جائے

کسی کی تابشِ رُخ بھی فقط فریبِ نظر
مرے خیال سے جب تک جلا نہ ہو جائے

بُروں کی بات کہوں تجھ سے جانِ معصومی!
اگر یہ دل ترا مجھ سے بُرا نہ ہو جائے

بلاؤں زلفوں کو، آنکھوں، لبوں کو، بانہوں کو
خیالِ یار کہیں پھر بلا نہ ہو جائے

محبتوں میں مری اہتمام میر کہاں
مری نوا کہیں حسنِ گلہ نہ ہو جائے

جستجو جب بھی ہو چلے بے نام
اس گھڑی اس کے نام کی چھیڑ دو

چلو کہیں غمِ الفت کو جا کے بہلائیں
کہ جس سے ہلکا ہو جی اک غزل ہی کہہ لائیں

نیا جنوں ہے جو اپنا نئی جفا ہو گی
نہ جانے طرزِ ستم اس کی کیا سے کیا ہو گی

اگر وہ شوخ ہے آمادۂ ستم مسعود
تو اس کے سامنے ہرگز نہ التجا ہو گی

کبھی تو آئے گی یہ اعتبار کیا کم ہے
تمہیں کہو کہ خیالِ بہار کیا کم ہے

اگر نہ دیکھیں تو ہے رنگ و بو کی طغیانی
اگر وہ دیکھیں تو زخمِ بہار کیا کم ہے

بنے نہ کچھ بھی تو پھر گردِ کارواں ہی بنو
کہ راہِ شوق میں موجِ غبار کیا کم ہے

ابھی چمن میں کوئی فتنہ کار باقی ہے
بہار باقی ہے، زخمِ بہار باقی ہے

طلسمِ غیر نہیں تارِ عنکبوت سے کم
ہزار لوٹ چکا ہے، ہزار باقی ہے

مرے رفیق! نگارِ سحر پہ کیا گزری
ہم ایسے تیرہ نصیبوں کے سر پہ کیا گزری

حریرِ شب پہ تبسم ہے یہ ستاروں کا
مرے یقیں! ترے حسنِ نظر پہ کیا گزری

وہ رہ گزر جو سرِ کہکشاں سے ملتی تھی
بتا بتا کہ اسی رہ گزر پہ کیا گزری

یہ چمن سے پھر کوئی طوفانِ رنگ و بو نہ بہا
خبر نہیں کہ نسیمِ سحر پہ کیا گزری

کسے بتائیں کہ دیر و حرم کی راہوں میں
تمہاری زلف پہ اور اپنے سر پہ کیا گزری

جو ارضِ پاک میں گزری ہیں وہ سب معلوم!
رشی کے دیس میں لیکن بشر پہ کیا گزری

تو کاوشِ مژگاں سے تراشے جو صنم اور
آئے گا نظر عشق کا اندازِ دگر آج

اب فیصلہ کر لیجیے شمشیر و قلم میں
یہ پیشِ نظر کل تھا، وہ ہے پیشِ نظر آج

مرا نصیب نہیں وہ کہ یوں رہیں بگڑے
ہمارے گھر میں وہ آئیں، مگر یہ خوب کہی

نگاہیں پھیر لیں وہ مہر و ماہ و انجم سے
غبارِ راہ پر اتنی نظر، یہ خوب کہی

ہزار باتوں میں مسعودِ نکتہ داں نے فقط
بشر ہے آج زمانے کا شر، یہ خوب کہی

مری غزل ترا صدقہ، مری نوا ترا غم
یہ صوتِ حرف ہے اور توڑ دوں میں قلم

ترا خیال، تری یاد، میرا فن، مرا شوق
ہنر کا باقی ہے کوئی بھی نہ پیچ و خم

وہ انتظار کہ آنکھوں نے آہٹیں سن لیں
وہ دھڑکنیں ہیں کہ ہوتیں نہیں کبھی مدھم

تری وفا کے تصور سے کانپ اٹھتا ہوں
مرے جنوں میں یہ انداز ہیں مگر کم کم

گلوں میں، غنچوں میں، تاروں میں ڈھونڈھتا ہی رہا
مگر وہ آنکھ جو ہر دم کسی کے غم میں نم

جنوں نے بخیہ گری آج بھی نہیں سیکھی
تری مژہ کا تصور مگر رہا پیہم

کس نے دیکھا ترا اندازِ جمیل
کبھی محدود، کبھی لامحدود!

آپ دامانِ صبا باندھتے ہیں
کس سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

کتنے پُرکار ہیں خوبانِ فرنگ
دل کو زلفوں سے سوا باندھتے ہیں

تجھے بہار ملی مجھ کو انتظار ملا
اس انتظار میں لیکن کسے قرار ملا

کسی کی آنکھوں میں تاروں کی مسکراہٹ ہے
کسی کی آنکھوں کو شبنم کا کاروبار ملا

یہ میرے جیب و گریباں پہ کچھ نہیں موقوف
کہ تیرا دامنِ رنگیں بھی تارتار ملا

خیالِ دامنِ الفت کہاں، کہاں مسعود
وہ نارسا ہی رہا اور شرمسار ملا

یہ سوچنا تھا نہ ہو جائیں اس قدر مجبور
یہ دیکھنا تھا ترے اختیار میں کیا تھا

لبوں نے پھول تراشے، نظر نے برسائے
مگر وہ کاوشِ مژگانِ یار میں کیا تھا

اُدھر خیال تھا رخسار و چشم و لب کا، اِدھر
خبر نہیں دلِ امیدوار میں کیا تھا

نگہ میں رمزِ غزل، لب پہ مقطعِ تمکیں
بیاں تو کیجئے اس اختصار میں کیا تھا

دلِ گرفتہ میں صدہا تہیں تبسم کی
گرہ یہ کاوشِ مژگاں سے باز ہو جائے

تجھ سے معاملے کا تو دیکھا نہ خواب تک
لیکن ترے خیال سے خلوت حسین ہے

اک دم اُنہ کہہ کے ٹالیے ہم آئیں گے ضرور
رگ رگ کے وعدہ کیجئے طوالت حسین ہے

سلکِ گہر، ستارۂ مژگاں، حنائے دل
دنیا پڑی جو آپ کو قیمت حسین ہے

تیشے کو تیرے ساتھ اٹھا تو لیا رفیق!
لیکن نظر میں ایک روایت حسین ہے

جہاں بھی بات چھڑی ہم نے مختصر نہ کہا
یہ اور بات ہے جتنا تھا، اس قدر نہ کہا

مرے وطن، مرے ہندستان، عزیز وطن!
تجھے بہشت کہا، ہم نے اپنا گھر نہ کہا

کہا فسانہ تو نازک مقام بھی آئے
مگر زباں سے کبھی تجھ کو فتنہ گر نہ کہا

خیالِ رخ سے جو پہنچے ہیں زلف تک وحشی
یہی ہے جرم کبھی شام کو سحر نہ کہا

کہو تو وہ بھی کہیں، حکم دو تو وہ بھی کریں
جو عمر بھر نہ کیا ہے، جو عمر بھر نہ کہا

کبھی یہ غم ہے کہ ملنا ترا قیامت ہے
کبھی یہ فکر کہ مل کر وبال کیا ہوگا

آج خوں چکاں دل سے پوچھتے ہیں ہم اپنے
تجھ کو یہ ہوا کیا ہے، تجھ کو کچھ ہوا بھی ہے

اپنی نسبتیں ساری اب بھی اُس کے در سے ہیں
جس کی آرزو بھی ہے، جس سے دل خفا بھی ہے

رفیق! اپنا بھی دستِ جنوں سلامت ہے
جو وہ قمیص و قبا و لبادہ رکھتے ہیں

ہے اپنی سادگیٔ شوق زلفِ پُرخم سے
کہ ہم تصور پُرکار و سادہ رکھتے ہیں

تمام حوصلۂ غم ہو یا اُمیدِ کرم   وہ جس قدر کہیں اس سے زیادہ رکھتے ہیں
ہزار تنگیٔ دوراں سہی مگر مسعودؔ   دلِ فراخ و جبینِ کشادہ رکھتے ہیں

قتل کرتے سرِ بازار، نہ دیکھا نہ سُنا   ہم نے تجھ سا کبھی کوئی یار، نہ دیکھا نہ سُنا
تیری انگشتِ حنائی پہ گماں ہے کیا کیا   اس قدر سادہ و پرکار، نہ دیکھا نہ سُنا
ہم جو جینے پہ مصر ہیں تو فقط ہے یہ خیال   آپ سا شوخ ستمگار، نہ دیکھا نہ سُنا
رات بھر ساتھ رہے صبح کو پھر قتل کیا   یہ تماشا مری سرکار! نہ دیکھا نہ سُنا

ہم تو اس بات پہ قائم ہیں ابھی تک لیکن   ہو گئی آپ کے نزدیک بہت دور کی بات

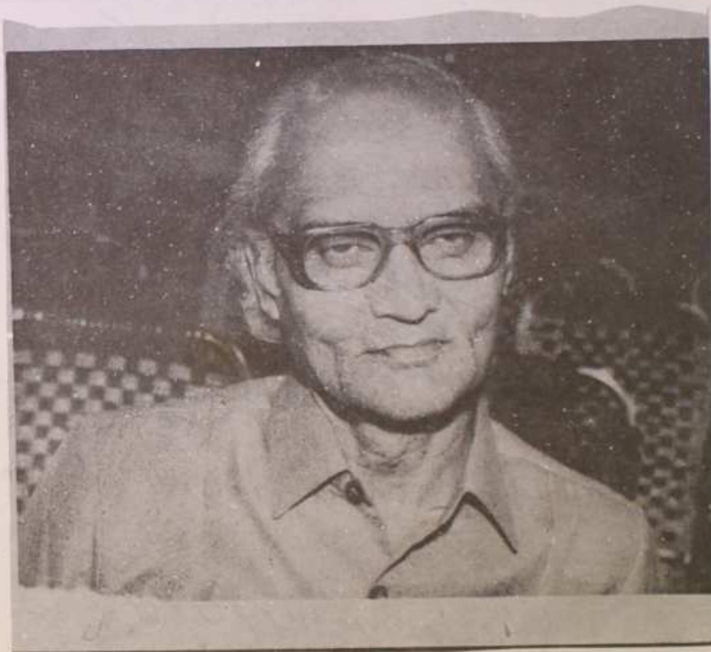
ذرّہ خاک میں جب ہو چکی شیطاں کی تلاش   پھر زمانے کو ہوئی حضرتِ انساں کی تلاش
میری آوارہ خرامی انھیں منظور نہیں   نکہتِ گل کے لیے کرتے ہیں زنداں کی تلاش
وہ جو اک سانحہ گزرا تھا سو گزرا لیکن   ہے نہیں آج تلک اپنے دلِ جاں کی تلاش
ڈھونڈنے اہلِ حرم ہند میں آتے ہیں مجھے   ہے صنم خانے میں اِک مردِ مسلماں کی تلاش
جیتے جی ہم نے تجھے ہائے! نہ جانا مسعودؔ   ہاں ترے بعد ہوئی تجھ سے سخنداں کی تلاش

میری افسردہ دلی گردشِ ایام سے ہے   لوگ کہتے ہیں محبت کسی گلفام سے ہے
چشمِ ساقی نے بھی یہ مشورۂ نیک دیا   کہ علاجِ غمِ دل، تلخیٔ بدنام سے ہے
درد اٹھتا ہے کہ جی بیٹھتا ہے جانِ کرم!   جو بھی ہوتا ہے یہاں آپ کے احکام سے ہے
چاندنی رات میں یہ اور چمک اٹھّے گا   درد کچھ دل میں سوا آج سرِ شام سے ہے

یہ سچ نہیں ہے کہ چھٹنے کے بعد جانِ وصال   تجھے زمیں نہ ملی، مجھ کو آسماں نہ ملا
ادائے خاص ملی اور صلائے عام ملی   مگر کہیں بھی وہ اندازِ جانِ جاں نہ ملا
گداشناسیٔ اہلِ کرم مسلّم ہے   ہم اٹھ کے جس کے قدم لیں وہ پاسباں نہ ملا
وہ دل ہی کیا جو محبت سے آشنا نہ ہوا   سفینہ کیا وہ جسے بحرِ بے کراں نہ ملا

ترے خیال سے رقصِ رواں ہے میری غزل   تری نگاہ سے اب تک جواں ہے میری غزل
یہ لفظ و معنی کا رشتہ، یہ میرا تیرا وجود   ذرا میں پیدا ذرا میں نہاں ہے میری غزل
ترے وجود میں پنہاں ہوں مثلِ آتشِ گل   مرے وجود میں جیسے نہاں ہے میری غزل
تری نگاہ نے بخشی وہ رفعتِ جذبات   کہ اس زمیں میں بھی آسماں ہے میری غزل
کہاں سے اہلِ سخن لائیں طالعِ مسعودؔ   وہاں گزر نہیں ممکن جہاں ہے میری غزل

مضطرمجازؔ



مضطر مجاز

پ - ۱۹۳۵ء

٥

آدم کا لہو دیر و حرم مانگ رہے ہیں
انسان سے جینے کا بھرم مانگ رہے ہیں

کالی ہوئی شب آگ سے کھلتے ہوئے دینار
اکڑی ہوئی سانسوں کے درم مانگ رہے ہیں

دشمن ہیں ادھر تیغ بکف ہم تہِ محراب
لطفِ کششِ کافِ کرم مانگ رہے ہیں

سناٹے کے گلکار میں گرتی ہوئی چھت سے
بیٹھی ہوئی دیوار سے رم مانگ رہے ہیں !

میں تاش فروشِ دلِ صد پارہ ہوں مضطر
اور لوگ جفا جور کرم مانگ رہے ہیں !

٥

سوانحی خاکہ

نام : سید غلام حسین رضوی   قلمی نام : مظفر مجاز

میرا تعلق بلند شہر (یوپی) کے قصبۂ پنڈروال کے ایک سادات گھرانے سے ہے۔ میرے والد تلاش معاش میں حیدرآباد آگئے۔ میری پیدائش (۱۹۳۵ء) یہیں ہوئی جہاں عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کے بعد میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہوا اور ۱۹۹۳ء میں اسپیشل کیڈر ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹیو کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبان وادب سے گہری دلچسپی رہی ہے، ہندی اور تیلگو سے بھی شد بد واقفیت ہے۔

میں نے اقبالؔ کی تین تصنیفات "جاوید نامہ" "پس چہ باید کرد" اور "ارمغانِ حجاز" کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ "پیامِ مشرق" کی رباعیات "لالۂ طور" کا ترجمہ بھی "شعر و حکمت" میں شائع ہوا۔ میرا ایک مجموعہ کلام بہ عنوان "موسمِ سنگ" ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ "اک سخن اور" طباعت کی آخری منزلوں میں ہے۔ "جاوید نامہ" "موسمِ سنگ" اور "پس چہ باید کرد" کے تراجم علمی مجلس (لندن) سے بھی شائع ہوئے (۱۹۹۳ء)

ہندستان کے مختلف شہروں کے کل ہند مشاعروں کے علاوہ دور درشن پر بھی اپنا کلام پیش کرنے کا موقع ملا۔ جدید فکر و نظر سے لگاؤ ہے۔ میرے اظہار میں زندگی کے کرب و آلام کا عکس ضرور ہے لیکن اس میں امید کی رمق اور کسی قدر طنز کی لہر محسوس کی جاسکتی ہے۔ نظمیں بھی میں نے کہی ہیں لیکن غزل میں میرا دل زیادہ لگتا ہے۔

••

انتخاب کلام

("موسمِ سنگ" سے)

ذرہ سہی، سنبھال قلم: آفتاب لکھ!
قطرے کی آنکھ کے لئے دریا کا خواب لکھ!

چہروں کو دیکھنے کی تو فرصت کہاں مگر
چہرے کے جس نقاب کو دیکھا جمیل تھا!

نجلت وہ یاقوتِ یمن ہم نے بنایا
جس سنگ کو موضوعِ سخن ہم نے بنایا

کوئی نہ تھا کہ اٹھ کے دریچہ ہی کھول دے
ہر شخص دیکھنے کو تو بھوکا ہوا کا تھا

کچھ نہ کچھ ہر حسین چہرے میں
اپنے معشوق کی جھلک ہے میاں

بام شہرت کو اچک لیں گے بڑی تیزی کے ساتھ
اک غزل ہر روز کہتے ہیں عرق ریزی کے ساتھ

سر میں ائی ہے دھول تو کانٹے ہیں ہاتوں میں
کہنے کو ہم بھی ہیں تیری خلوت سراؤں میں

کتنی لچکیلی نکیلی نکلی
شاخِ گل اس کی سہیلی نکلی

اس کو بہلا کے میں گھر لے آیا
شامِ غم جب بھی اکیلی نکلی

کتنا آباد تھا ویرانۂ دل
ہر کھنڈائی میں حویلی نکلی

ہاتھ ہمارا کھل جائے تو دل کا لہو بھی دینگے ہم
اب تو یہی کچھ آنسو ہیں تم کر لو اگر قبول میاں

سنسر نہیں ہوئی تو خبر یہ کدھر گئی
کس حادثے میں دخترِ امید مر گئی

دل کا فسانہ یا شکمِ آشوب کیا سناؤں
جب تاب کار ریت مرے منھ میں بھر گئی

ہر چیز میرے دور میں ناچیز ہو گئی
تریاق میں اثر ہے نہ تاثیر زہر میں!

میری غزل کو چھوڑ، مری شاعری پہ خاک
مجھ کو خوشی یہ ہے ترا اخبار چل گیا!

اچھی تو تھی کتاب مگر نیند آگئی
پکچر تو تھی خراب مگر دل بہل گیا!

کوئی نہیں جو کھینچ کے باہر نکال لے
دریا ہوں چلتے چلتے سمندر میں گر پڑا

روداد میکدہ ہے یہی تیس سال کی
بیٹھا میں کھیلتا رہا خالی گلاس سے

نازک بہت ہے کھیل کسی دن الٹ نہ جائے
پتھر کا ہاتھ پھول کی پتی سے کٹ نہ جائے

لوٹ ایسی مچ رہی ہو تو ڈر ہے کہ ایک دن
خوشیوں کی طرح غم بھی امیروں میں بٹ نہ جائے

گل کی کب تک یہ بتا، اوڑھ کے پتھر نکلوں
موسم سنگ ہے بھیس اپنا بدل کر نکلوں

خود مرے پانو مرے پانو کی زنجیر بنے
چاہتا تھا کہ کبھی جسم سے باہر نکلوں

کوئی جھرنا ہوں کہ بت ہوں یہ کھلے گا کیسے
قید سنگینِ حجر ٹوٹے تو باہر نکلوں

کسوتِ شاخ میں ہوں دیر سے غلطاں پیچاں
پھول جاؤں تو خوشبو کے سفر پر نکلوں

تپشِ دل کبھی وہ دن بھی دکھائے مضطر
بارشِ سنگ بھی ہو، میں بھی کھلے سر نکلوں

("اک سخن اور" سے)

میری تصویر کو لب، نقش کو گویائی دے
اس تماشے کو کوئی چشمِ تماشائی دے

کاسۂ نطق پہ الفاظ کی ارزانی کر
کیسۂ فکر کو مضمون کی مہنگائی دے

میری تنہائی کو دے دودِ چراغِ محفل
میری محفل کو سلگتی ہوئی تنہائی دے

آہستہ آہستہ ایسا وقت بھی آئے گا
جب روشن سورج کا تعارف دیا کرائے گا

میں بھی مضطر شاعر بن کر گاڑوں گا جھنڈے
جس دن اپنا نام مجھے لکھنا آجائے گا

پھول کاغذ کے تو گلدان میں بس جائینگے
گھر کے جو لوگ ہیں خوشبو کو ترس جائینگے

صدیوں کی زندگی میں الٹ پھیر ہو گئی
اور لطف یہ کہ جیت میں اک لمحہ تک نہ تھا

یہ ہم زمیں پہ چل کر رواروی میں گرے
یہ آپ اتنی بلندی سے کس خوشی میں گرے

ہماری راہ میں گہرا انا کا کھڈ بھی تھا
اسی میں گرنے کا ڈر تھا ہمیں اسی میں گرے

ہوا کے زور پہ اڑتے تھے آسمانوں میں
ہوا کے رکتے ہی ردی کی ٹوکری میں گرے

پھینک دیا موجوں نے اسے کنارے پر
میں کشتی میں ڈوب گیا آسانی سے

لاکھ رہیں دریا میں مونگے اور موتی!
دریا کا تو پیٹ بھرے گا پانی سے

نت نئی بیماریاں بٹتی رہیں
دیر و کعبہ کے مسیحاؤں کے بیچ

گوشت کنبے کے برہمن کھا گئے
خوں بہا کاشی کے مُلّاؤں کے بیچ

یوں پو پھٹی کہ صبح کی توقیر گھٹ گئی
سورج چڑھا تو دھوپ اندھیروں میں بٹ گئی

سائے میں آیا میں تو عجب واقعہ ہوا
سائے کا ساتھ چھوڑ کے دیوار ہٹ گئی

شاخساروں سے اتر کر دیکھوں
دام کیا کیا ہیں زمیں پر دیکھوں

کان بھر کوک سنوں کوئل کی
آنکھ بھر روئے گل تر دیکھوں

آج دیکھا جو سمندر تو مجھے یاد آیا
میرے سینے میں بھی اٹھتی تھی کبھی لہرا لیے!

بالا والا' بندی دِندی، جھومر و دمر کیا
زیور تیرا چہرہ تجھ کو زیور ویور کیا

پل دو پل کو پڑے رہنا ہے رکھ کے سرہانے ہاتھ
گھر ور کیا، تکیہ وکیہ کیا، بستر وستر کیا

جیون اک چڑھتا دریا ہے تو ڈوبے کر جا پار
اس دریا میں کشتی وشتی لنگر ونگر کیا

دنیا ہے وہ بے شرم کہ ہر گھر میں چلی آئی
مجھ کو بھی نہ چھوڑا مری ٹھوکر میں چلی آئی

روز سحر ہوگی ہونے کو، روز شب آئے گی
کتنے سورج نکل چکے ہیں، صبح کب آئے گی!

یہ غلط ہے کہ تھا گلاس میں سانپ
چھپ کے بیٹھا تھا میری پیاس میں سانپ

دفعتاً اس جگہ نکلتا ہے
نہیں ہوتا جہاں قیاس میں سانپ

اک نہ اک دن نکل کے ڈستا ہے
ہے ہر انسان کی اساس میں سانپ

○

آدم کا لہو دیر و حرم مانگ رہے ہیں
انسان سے جینے کا بھرم مانگ رہے ہیں

کاٹی ہوئی شہ رگ سے کھنکتے ہوئے دینار
اکڑی ہوئی سانسوں کی درم مانگ رہے ہیں

دشمن ہیں ادھر تیغ بکف ہم تہِ محراب
لطف کشش کاف کرم مانگ رہے ہیں

سائے کے طلبگار ہیں گرتی ہوئی چھت سے
بیٹھی ہوئی دیوار سے رم مانگ رہے ہیں

میں تاش فروش دلِ صد پارہ ہوں مضطر
اور روگ چنا چور گرم مانگ رہے ہیں

○

اراکان سے بوسینا تک برپا ہے کہرام
مالا ہم اشکوں کی پروئیں تو کس کس کے نام

بھائی بندی، صدق، وفا، اخلاص، محبت، پیار
اللہ اللہ کرکے ٹوٹے آخر سب اصنام
کل یُگ میں یہ بھگتوں کی ہے ایک پرانی ریت
مال پرایا اپنا لیکن جپنا رام کا نام
سورج اپنا ابھر کے جب ڈوبا تو ڈوب گیا
جانے کب تک پنچھے گاڑے بیٹھی رہے گی شام

○

کیا تھا وہ اور دیکھنے والوں کو کیا لگا
میں نے جو کچھ کہا تو سبھی کو برا لگا
پیتا ہوں آپ اپنا لہو، گھونٹ گھونٹ میں
جس دن سے مجھ کو اپنے لہو کا مزا لگا
بیٹھا تھا فرشِ خاک پہ قرنوں سے سر جھکائے
اٹھا تو آسمان سے سر میرا جا لگا
بت بھی نہ تھا وہ غیر سے لیکن مزہ یہ ہے
میک اپ کا تھا کمال کہ اک دیوتا لگا

○

نازک بہت ہے کھیل، کسی دن الٹ نہ جائے
پتھر کا ہاتھ پھول کی پتی سے کٹ نہ جائے
یہ جنگ ہی کچھ ایسی عجب ہے کہ دوستو
خود میری ذات میرے مقابل میں ڈٹ نہ جائے
گو چاندنی ہے کمیت مگر چودھویں کا چاند
پھر چودھویں کا چاند ہے ڈرتا ہوں گھٹ نہ جائے
لوٹ ایسی مچ رہی ہو تو ڈر ہے کہ ایک دن
خوشیوں کی طرح غم بھی پڑوس میں بٹ نہ جائے
کیسی یہ روک ٹوک ہے گوکل کے باسیو
رادھا کہیں بھی جائے پہ جمنا کے تٹ نہ جائے

○

یوں پو پھٹی کہ صبح کی توقیر گھٹ گئی
سورج چڑھا تو دھوپ اندھیروں میں بٹ گئی
ہر شام یوں لگا کہ قیامت کا دن ڈھلا
ہر صبح یوں لگا کہ صدی ایک کٹ گئی
سائے میں آیا میں تو عجب واقعہ ہوا
سائے کا ساتھ چھوڑ کے دیوار ہٹ گئی
محفوظ جس میں تھی تری دزدیدہ اک نظر
بازارِ زندگی میں وہی جیب کٹ گئی
اتنا مچایا شور بتوں نے درونِ سنگ
پتھر کی میٹھی نیند بھی آخر اچٹ گئی
تفصیل میں نہ جا کہ پیمبر تو میں نہ تھا
مضطر مری قمیص تھی اک روز پھٹ گئی

○

کتنی لچکیلی نکیلی نکلی
شاخِ گل تیری سہیلی نکلی

اسکو بہلا کے میں گھر لے آیا
شام غم جب بھی اکیلی نکلی
کتنا آباد تھا ویرانۂ دل
ہر کھنڈائی میں حویلی نکلی
نکلی جو بات بھی اُس کے منہ سے
اک پہیلی سی پہیلی نکلی
خشک سی چوب سے مضطرؔ کیسے
ہر صدا اتنی سریلی نکلی

○

یہ ہم زمین پہ چل کر روا روی میں گرے
یہ آپ اتنی بلندی سے کس خوشی میں گرے
ہوا کے دوش پہ اڑتے تھے آسمانوں میں
ہوا کے رکتے ہی ردی کی ٹوکری میں گرے

○

کب تک تصورات کے پیکر تراشیے
اپنی نجات کا کوئی پتھر تراشیے

○

خجلت دہِ یاقوت یمن ہم نے بنایا
جس سنگ کو موضوعِ سخن ہم نے بنایا
ہونٹوں کا تبسم تو زمانے کے لئے تھا
اپنے لیے زخموں کا یہ چمن ہم نے بنایا
تھی دھوپ بہت تیز زمانے کی تو مضطرؔ
ان جھیل سی آنکھوں میں وطن ہم نے بنایا

●●



(مابعد ایودھیا)

ثابت ہوا کہ صاحبِ ایمان میں بھی تھا
جلتے ہی گھر کھلا کہ مسلمان میں بھی تھا

سر کا تو ذکر کیا ہے کہ انگلی نہ کٹ سکی
کہنے کو دو رکعت کا مسلمان میں بھی تھا

اک بمبئی کے بابو سے کہنا ہے ایک دن
میں خیر کوئی بھی سہی انسان میں بھی تھا

یاروں سے حل یہ عقدۂ مشکل نہ ہو سکا
کیوں اپنی ماؤں بہنوں کا ارمان میں بھی تھا

مجھ کو مٹانے والوں نے یہ بھی بھلا دیا
اس خطۂ زمیں کا نگہبان میں بھی تھا

بریگیڈیئر سعید بھی، عبدالحمید بھی،
مردِ وغا و صاحبِ ایمان میں بھی تھا

یوں خاک میں کسی کو ملانا نہیں ہے سہل
دشوار تو یہی ہے کہ آسان میں بھی تھا

بیکاری، جہل، نشۂ سلم، بھوک، احتیاج
ہر شہرِ بے چراغ کی پہچان میں بھی تھا

تالاب، نہر، باغ، سڑک، گنبد، عطر، تاج
تہذیب کے عروج کا اعلان میں بھی تھا

لکھنے لگے ہیں بچے الف سے ایودھیا
پڑھ کر کے ب سے بمبئی حیران میں بھی تھا!

زر بفت پوش تھا نہ عبا و قبا بہ دوش
بے خانماں و چاک گریباں میں بھی تھا!

مضطرب ایک چیخ ہو، دل دوز ایک چیخ
وہ دن بھی تھا کہ صوتِ خوش الحان میں بھی تھا

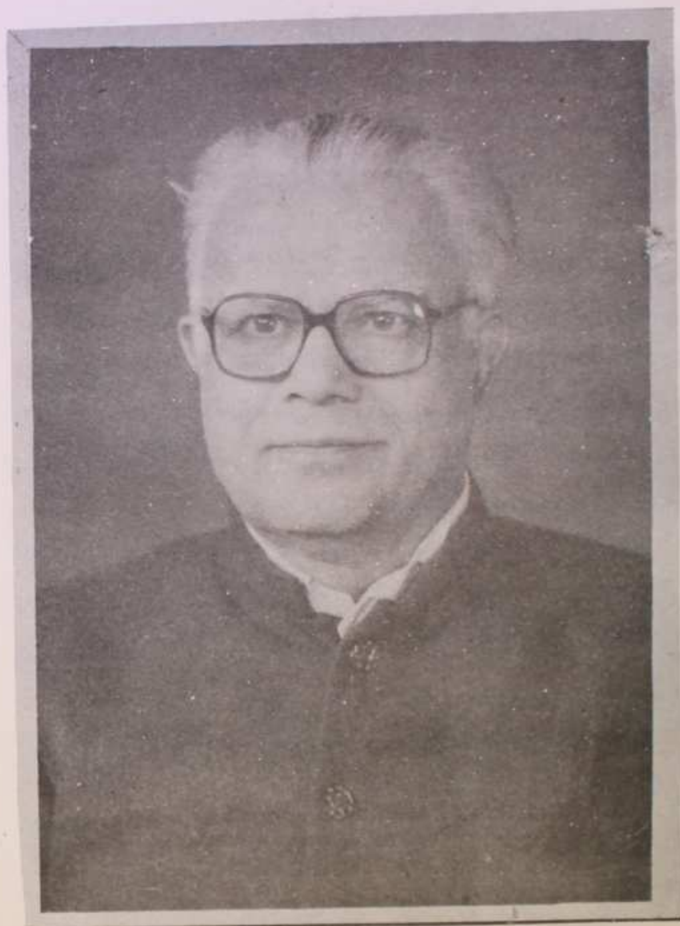


(آہ! ایودھیا)

پھرتے ہیں دندناتے ہوئے فیل! چپ رہو — غائب ہیں آسماں سے ابابیل! چپ رہو
بوجوں کا جس میں ناچ تھا دریا کا جس میں قتل — سنسر کی نذر ہو گئی وہ ریل! چپ رہو
طالوت کے لباس میں جالوت آگیا — ہابیل کی قبا میں قابیل چپ رہو
پرسان ان کٹی ہوئی لاشوں کا کون ہے؟ — آئے گی آسماں سے کوئی چیل چپ رہو

پانی میں بھی لہو کا مزہ ہے تو دوستو! — اپنے ہی ذائقے ہوئے تبدیل چپ رہو
مرمرے ہو گئی ہے ہوا کی ملی بھگت — سن کر زبان خارے تاویل چپ رہو
ذرے نے مسکرا کے ہمالہ نگل لیا — قطرے کے پاس رہتی ہوئی نیل چپ رہو!
سر پر علامتوں نے فلک کو اٹھا لیا! — رو رو کے چیختی رہی تمثیل چپ رہو!
دل چپ تھی کشاکشِ تحلیل و تجزیہ — دل دوز ہے نتیجۂ تحلیل چپ رہو!
ہے فصلِ قتل عام، وتد کیا، زحاف کیا — فعلن نہ فاعلن نہ مفاعیل چپ رہو!
مضطر نواحِ شہر بہائم میں دن ڈھلے — 'انسانیت' کی ہو گئی تکمیل! چپ رہو!

مغیث الدین فریدی



مغیث الدین فریدی   ۱۹۲۶ء

عکسِ تحریر

غزل

ہستی کے ہر اک موڑ پہ آئینہ بنا ہوں
مٹ مٹ کے اُبھرتا ہوا نقشِ کفِ پا ہوں

وہ دستِ طلب ہوں جو دعا کو نہیں اُٹھتا
جو لب پہ کسی کے نہیں آتی وہ دعا ہوں

بستی میں بسیرے کا ارادہ تو نہیں تھا
دیوانہ ہوں صحرا کا پتا بھول گیا ہوں

جاتی ہی نہیں دل سے تری یاد کی خوشبو
میں دورِ خزاں میں بھی مہکتا ہی رہا ہوں

پڑتی ہے نظر ہی تو مگر اب نہیں پڑھتے
ٹوٹا ہوا آئینہ ہوں رستے میں پڑا ہوں

رقصِ شررِ جاں دلِ گیتی کی ہے دھڑکن
میں اپنی بھی آواز ہوں سب کی بھی صدا ہوں

جھیلا ہے اسی وضع سے ہر تند ہوا کو
بجھتا بھی رہا ہوں کبھی جلتا بھی رہا ہوں

منیب الدین زبیری

مغیث الدّین فریدی

میں فتح پور سیکری میں حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی خانقاہ کے قریب اپنے آبائی مکان میں یکم مئی ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوا ابتدائی تعلیم خاندان کی روایت کے مطابق گھر پر ہوئی۔ فارسی اپنے والد پیرزادہ عظیم الدین فریدی سے پڑھی وکٹوریہ ہائی اسکول آگرہ سے ہائی اسکول کا امتحان دیا انٹرمیجیٹ آگرہ کالج سے اور بی۔اے سینٹ جانس کالج سے کیا ۱۹۴۶ء میں ایم۔اے (اردو) کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوا۔

شعر گوئی کا سلسلہ آٹھویں جماعت سے شروع ہوگیا تھا حضرت نظام فتحپوری سے کلام پر اصلاح لی اور علم و فن سیکھا اسکول میں مولوی سید حامد علی، آگرہ کالج میں پروفیسر محمد طاہر فاروقی، سینٹ جانس کالج آگرہ میں پروفیسر حامد حسن قادری اور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر مسعود حسین خاں کی توجہ اور شفقت میرے ادبی ذوق کی تربیت کرتی رہی۔ آگرے میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک مشاعروں میں پابندی سے شرکت کی۔ آگرے میں شعر و ادب کی محفلیں سیماب اکبرآبادی، احقر اکبرآبادی، میکش اکبرآبادی اور صبا اکبرآبادی کے دم سے بڑی باوقار اور پرلطف ہوتی تھیں۔ ان محفلوں میں اکثر جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، احسان دانش، اور حفیظ جالندھری کے ساتھ مجاز لکھنوی، معین احسن جذبی اور جاں نثار اختر بھی شریک ہوتے تھے۔

حضرت میکش اکبرآبادی کا دیوان خانہ شعر و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جوش، جگر، فراق، جذبی، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری اور مجاز لکھنوی آگرے میں میکش صاحب کے مہمان ہوتے تھے ۱۹۴۸ء میں علیگڑھ سے واپس آگرے آیا۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ آگرے کی تہذیبی بساط لٹ چکی تھی اس وقت مجھے سینٹ جانس کالج آگرہ میں اردو اور فارسی پڑھانے کی خدمت سپرد کی گئی ۱۹۶۲ء تک میں نے یہ خدمت انجام دی۔

۱۹۶۲ء سے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے وابستہ ہوں پہلے لکچرر رہا۔ پھر ریڈر ہوگیا۔ اردو میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی دہلی یونیورسٹی سے حاصل کی۔

غزلوں کا مجموعہ کفرِ تمنا ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا نظموں کا مجموعہ نیا افق اور تاریخی قطعات کا مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا۔

انتخاب کلام:

کیا ہوا جسم کے بام و در لٹ گئے، دل کے آنگن میں ہنگامہ ہوتا رہے
روح کے آئینے کو سجاتے رہو، بیتے لمحوں کی پرچھائیاں ہی سہی

طاقِ عشرت کی ایک ایک مشعل بجھی خیمہ ہائے طرب کی طنابیں کٹیں
وادیِ جاں کی رونق مگر کم نہ ہو تلخ یادوں کا اک کارواں ہی سہی

سینہ کوبی علاجِ ستم تو نہیں، دستِ قاتل میں تلوار رہنے نہ دو
ورنہ تلوار مانگے گی اپنا ہدف گردن و سر نہیں تو زباں ہی سہی

وہ دستِ طلب ہوں جو دعا کو نہیں اٹھتا — جو لب پہ کسی کے نہیں آئی وہ دعا ہوں
اس دور میں انساں کا چہرہ نہیں ملتا — کب سے میں نقابوں کی تہیں کھول رہا ہوں
بستی میں بسیرے کا ارادہ تو نہیں تھا — دیوانہ ہوں صحرا کا پتہ بھول گیا ہوں
جاتی ہی نہیں دل سے تری یاد کی خوشبو — میں دورِ خزاں میں بھی مہکتا ہی رہا ہوں

سلوک ایسا کیا ہے راہزن نے — نگاہیں جھک گئی ہیں رہبروں کی
پڑوسی کو جو طعنے دے رہے ہیں — خبر لیتے نہیں اپنے گھروں کی
ہم اپنا سر کہاں جا کر چھپائیں — چھتیں ٹوٹی ہوئی ہیں سب گھروں کی

ظرف سے کم، وقت سے پہلے نہیں ملتی یہاں — آج زہرِ غم ہی پی لو ارغوانی پھر سہی
تیغ کس کے ہاتھ میں تھی کون تھا سینہ سپر — یہ کہانی آج سن لو وہ کہانی پھر سہی
ذہن کو ماؤف کر دیتا ہے لفظوں کا طلسم — مدعا کہہ دیجیے جادو بیانی پھر سہی

غم دیدۂ تر مانگے، فن فکر و نظر مانگے — آئینے کا دل مانگے پتھر کا جگر مانگے
آنچل مہسی قاتل کا ہر دیدۂ تر مانگے — نقشِ کفِ پا جس کا سجدہ نہیں سر مانگے
طعنوں کا ہدف ٹھہرے جو ذوقِ نظر مانگے — دیوانہ کہاں جائے کس دشت سے گھر مانگے

جہاں ملاتا نہیں کوئی بھی نظر ہم سے — کلام کرتے ہیں اس گھر کے بام و در ہم سے
جدا ہوئے ہیں وہ جب بھی تو یہ ہوا محسوس — کہ جیسے اب نہ ملیں گے وہ عمر بھر ہم سے
جئیں تو کیسے جئیں، جان دیں تو کس پہ دیں — کہ ذرہ ذرہ یہاں مانگتا ہے سر ہم سے
بسے ہوئے ہیں جو لمحے تمہاری خوشبو میں — تمہارا ذکر ہی کرتے ہیں رات بھر ہم سے

عزمِ ترکِ طلب دل میں پیدا ہوا ان سے ملنے کی اک آرزو کی طرح
اب جنوں میں بھی رنگِ شعور آ گیا چاک کرتے ہیں دامن رفو کی طرح

ہم ہی مارے گئے، ہم ہی رسوا ہوئے تیرے دامن پہ کوئی بھی دھبہ نہیں
جم گئی ہے مگر دامنِ وقت پر یہ دفا دشمنی بھی لہو کی طرح
وقت کے ساتھ قدریں بدلتی رہیں مصلحت ہر قدم پر ڈبوتی رہی
غیرتِ دل اگر یونہی سوتی رہی جان بھی جائے گی آبرو کی طرح
حکم یہ ہے کہ رنگِ شکستہ بھی اب ترجمانِ غم و دردِ ہستی نہ ہو
بے زبانی پہ پابندیاں لگ گئیں آپ کی بزم میں گفتگو کی طرح
ہے فریدی تقاضائے رنگِ غزل ذہن کی روشنی روح کی تازگی
شعلہ احساس کا پیکرِ حرف میں ڈھل کے نکھرے کسی شعلہ رو کی طرح

اندازِ سخن مصلحت آمیز بہت ہے — پھر بھی یہ ادا تیری دلآویز بہت ہے
ہم اس سے جدا ہو کے بھی یوں جھوم رہے ہیں — جیسے کہ یہ لمحہ بھی طرب خیز بہت ہے
اک بار بھی تھرائی نہ لَو شمعِ وفا کی — سنتے تھے زمانے کی ہوا تیز بہت ہے
اب دیکھیے کس رنگ میں یہ شام ڈھلے گی — کچھ گردشِ حالات کی لَے تیز بہت ہے

ہم نے تنہا نشینی خریدی تو ہے رونق و شورشِ انجمن بیچ کر — شمع محرابِ دل میں جلائی تو ہے آرزوؤں کا اپنی کفن بیچ کر
کھو گیا دردِ ہنگامۂ شہر میں لٹ رہی ہے دکانِ متاعِ نظر — اب بھی توفیق اگر ہے تو اہلِ جنوں بڑھ کے لے لو یہ جان و تن بیچ کر
ہے فریدی عجب رنگ بزمِ جہاں مٹ رہا ہے یہاں فرقِ سود و زیاں — نور کی بھیک تاروں سے لینے لگا آفتاب اپنی اک اک کرن بیچ کر

اب کسی درد کا شکوہ نہ کسی غم کا گلہ — میری ہستی نے بڑی دیر میں پایا ہے مجھے
میں غمِ دہر کی چادر میں چھپا بیٹھا تھا — رات بھر آ کے تری یاد نے ڈھونڈا ہے مجھے

کسی نے زبانِ تمنا نہ سمجھی غلط فہمیوں سے بڑھی بے نیازی — ذرا جس کو چشمِ عقیدت سے دیکھا وہی رفتہ رفتہ خدا بن گیا ہے
کچھ اس طرح بدلی ہوا شہرِ دل کی دعا معصیت آرزو جرم ٹھہری — وفا سر بزانو ہے تیری گلی میں مذاقِ نظر سر برہنہ ملا ہے
ہوا ہلکی ہلکی فضا بھیگی بھیگی یہ پچھلے پہر بھینی بھینی سی خوشبو — مرے دیدہ و دل کا عالم نہ پوچھو کوئی آرزو جیسے محوِ دعا ہے

کم تو نہیں ہیں آج بھی دہر میں دردمند لوگ — ہاں دلِ خود پسند کو ملتے ہیں ناپسند لوگ
چاکِ قبا کا آئنہ دیکھ کے دنگ رہ گئے — سنگ اٹھا کے چل دیئے دشت سے ہوشمند لوگ

بے ذوقِ نظر روح کی منزل نہیں ملتی — جینے کے لیے دہر میں درکار ہیں آنکھیں
غم یہ ہے کہ کیوں دیکھ لیا دہر کو اتنا — بیداریِ احساس سے بیمار ہیں آنکھیں

اب جس میں رمق بھی نہیں آتش نفسی کی
اس خاک سے شعلے کی طلبگار ہیں آنکھیں

اس وقت کہ جب سارا بدن نیند میں گم ہے
کیا سحر کیا تو نے کہ بیدار ہیں آنکھیں

کاروانِ رنگ و بو کب کا چمن سے جا چکا
اب غبارِ کارواں کو کارواں کہتے رہو

حرف کی محتاج کب ہے شوخیِ فکرِ رسا
وقت نے لب سی دیے ہیں داستاں کہتے رہو

دار تھی جن کے لیے وہ سرِ منبر ہی رہے
میکدہ جن کے لیے تھا وہ سرِ دار ملے

دل کی بستی سے جو گذرا تری یادوں کا ہجوم
خاک اڑاتے ہوئے سب کوچہ و بازار ملے

دیکھیں کہ ہم اس کو سنیں ہیں کشمکش میں چشم و گوش
وہ آفتِ جاں سر بسر آواز ہی آواز ہے

اک بار اپنے آپ سے ملنے کی حسرت ہے مجھے
ہستی مری اس شہر میں کھوئی ہوئی آواز ہے

ہمیں تو کوئی بھی پہچانتا نہیں ہے یہاں
نگاہ کس سے ملائیں کسے سلام کریں

تمہارے جام کو پہلے نظر سے چھلکا دیں
پھر اپنے ہوش میں آ کر طوافِ جام کریں

دل کا عجب انداز ہے گلشن بھی ہے صحرا بھی ہے
دیوانہ اپنے رنگ میں محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

نازک سا رابطہ دل ہے یہ اس کو جنوں کہہ لیجیے
وہ ہم سے بیگانہ بھی ہے لیکن وہی اپنا بھی ہے

رنگِ جہاں کا عکس ہے ایک ایک چہرے پر یہاں
جو اپنے دل کا عکس ہو ایسا کوئی چہرا بھی ہے

بیاں کے رنگ لفظوں کی قبا کے بانکپن بدلے
زباں تک آتے آتے دل نے کتنے پیرہن بدلے

ہمیں اس انقلابِ دہر کی دعوت نہ دو جس میں
نہ پھولوں کی مہک بدلے نہ کانٹوں کی چبھن بدلے

کہاں گم ہو گیا وہ رات کا بھیگا ہوا لمحہ
جو تیرے دل کی ٹھنڈک سے مرے دل کی جلن بدلے

قتل کر کے عدل کی کرسی پہ جا بیٹھے ہیں وہ
خونِ ناحق بہہ چکا ہے خوں بہا رہ جائے گا

یا یہ خوشبو ہے تری یا ہے مرا رنگِ نظر
ورنہ اے دوستِ جہانِ گذراں کچھ بھی نہیں

صرف الفاظ پہ موقوف نہیں لطفِ سخن
آنکھ خاموش اگر ہے تو زباں کچھ بھی نہیں

دوستی کی شریعت میں جائز نہیں ایسا پر پیچ طرزِ بیاں دوستو
برگِ گل کی لطافت زباں میں تو ہے حرف لیکن ہیں نوکِ سناں دوستو
تیر تو سب تمہارے خطا ہو گئے توڑ دو اب یہ خالی کماں دوستو
آؤ بڑھ کر گلے سے لگا لو ہمیں ورنہ پھر تم کہاں ہم کہاں دوستو

کیسے اک دوسرے کو سمجھتے بھلا گفتگو سے بڑھا اور بھی فاصلہ
ہم تھے بے ربط سی داستانِ وفا تم تھے مبہم سا طرزِ بیاں دوستو
خود فریبی سے تم کو گماں بھی نہ تھا وقت بے درد نقاد بن جائے گا
میرے دامن سے کوئی الجھتا نہیں تم پہ اٹھنے لگیں انگلیاں دوستو

بکھرے ہوئے انسان سے کیا پوچھ رہے ہو
میزانِ جنوں عقل کا معیار کہاں ہے
سر اپنا ہتھیلی پہ جو رکھ لے دمِ گفتار
لو لو رسن و دار وہ سردار کہاں ہے
ٹوٹے ہوئے آئینے جہاں بکتے ہیں لوگو
اس شہر میں ایسا کوئی بازار کہاں ہے

دل میں جنھیں اتارتے دل سے وہی اتر گئے
جسم کو چومتے رہے روح پہ وار کر گئے
دشتِ توہمات میں اپنی صدا ہے اور ہم
حسنِ یقیں کے قافلے کس سے کہیں کدھر گئے
وقت کے قافلے میں جب کوئی نہ ہم سفر ملا
بن کے غبارِ رہگذر دشت میں ہم بکھر گئے

ہمارے خاک اڑانے پر نہ جا اے ناصحِ ناداں
غمِ دنیا کے سر پر ڈالتے ہیں خاک دیوانے
فریدتی ہے وہی شغلِ جنوں بے دست و پائی میں
کیا کرتے ہیں دامانِ تمنا چاک دیوانے

وہ بہارِ محفلِ آرزو، ہمہ نغمہ و ہمہ رنگ و بو
وہ نفس نفس میں شراب سی تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بغیر جام کے سرخوشی، وہ بغیر چاند کے چاندنی
وہ بغیر ساز کے راگنی تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
بڑی احتیاط سے اک نظر سرِ بزم تم نے اٹھائی تھی
وہ مری نظر سے بکھر گئی تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اب ہاتھ سے رکھ دو سازِ طرب اب نام نہ لو پیمانوں کا
ساغر سے چھلکنے والا ہے اس وقت لہو انسانوں کا
اب گردشِ ساغر بھی ہے نئی اب موجِ مئے رنگیں بھی نئی
دستور بدلتا جاتا ہے اے پیرِ مغاں میخانوں کا
ہو خیر ترے پیمانوں کی برہم ہے نظامِ میخانہ
اب رنگ پہ محفل آئی ہے اللہ نگہباں جانوں کا

وہ عالم دل پہ طاری کر گئی تیری پذیرائی
کہ جیسے عمرِ رفتہ ایک لمحے میں سمٹ آئی
غرورِ بیکسی نے سی دیے لب گھٹ گئیں آہیں
تمہیں آواز دینا چاہتی تھی میری تنہائی

پھر درد نے کروٹ سی بدلی جذبات کے شعلے لہرائے
کل یاد میں ایسا کیف نہ تھا کیا آج تمہیں ہم یاد آئے
آغوش میں دل کے یاد تری یوں آئی کہ جیسے کوئی کلی
خود اپنی مہک پر وجد کرے اور جھوم کے خود ہی کھل جائے
ہم جن کی توجہ کی خاطر شعلوں میں شگفتہ رہتے ہیں
اللہ کرے دل رکھنے کا ان کو بھی سلیقہ آ جائے

جو ترکِ طلب سے پہلے تھا دل کا وہی عالم آج بھی ہے　　آئینہ نہیں بدلا جاتا تصویر بدلتی رہتی ہے
جی بھر کے اسے دیکھا لیکن اب تک یہ نظر بھرتی ہی نہیں　　معصوم ادائیں سارہ رہ کر اک بات نکلتی رہتی ہے

میں گیا وقت ہوں اے زہرہ وشو، گل بدنو　　آئینہ ہاتھ میں لے کر مجھے آواز نہ دو
شیشۂ مے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں سرِ بزم　　پینے والو مرے بکھرے ہوئے ٹکڑے چن لو
انگلیوں پر ہے ابھی چاکِ گریباں کی خراش　　عقل والو مرے ہاتھوں میں ابھی ساز نہ دو

مرے دل کے ساتھ ہی چھین لے مری خودشناس نگاہ بھی　　میں ترے قریب نہ آؤں گا یہ توہمات لیے ہوئے
شبِ انتظار کے بعد پھر نہ ہوئی طلوع کوئی سحر　　مری عمر ساری گذر گئی یہی ایک رات لیے ہوئے

دنیا کی بہاروں میں کھو کر میں اپنی نظر سے چھپ جاتا　　صد شکر دلِ آگاہ مرا دل بن گیا جامِ جم نہ ہوا
بکھرے ہوئے تنکے چن چن کر تعمیرِ نشیمن کر تو لیا　　تعمیرِ نشیمن سے لیکن احساسِ تباہی کم نہ ہوا

ترے غرور نے کہیں مجھ کو بھلا دیا نہ ہو　　دل کو سکوں نہ آسکا آج دعا کے بعد بھی
ترے خلوص میں ضرور کوئی کمی کہیں تو تھی　　مجھ سے وفا نہ ہو سکی عزمِ وفا کے بعد بھی

مزہ تو یہ ہے جنوں سے ہے آگہی کا بھرم　　بہک نہ جائے تو سب راز کہہ دیے ہوتے

بیگانگی بھی ہے نگہِ مہرباں کے ساتھ　　جیسے غبارِ راہ چلے کارواں کے ساتھ
تو بھی ادائے رسمِ مروت نہ ترک کر　　ہم بھی نبھائے ہیں دلِ بدگماں کے ساتھ

کبھی جو شام کو مہکی کسی کی زلفِ رسا　　تو یاد آئی وہیں تیرے جسم کی خوشبو

تری جفا کو جفا ماننے نہیں دیتا　　تری شمیم سے مہکا ہوا مرا پہلو
میں تیری یاد کے ہمراہ جس طرف گذرا　　چھلک گئیں کئی آنکھیں بکھر گئے گیسو

کوئی لُٹ کر اتنا تنہا بھی نہ ہو　　جس پہ کوئی ہنسنے والا بھی نہ ہو
بات تو جب ہے دلِ بے مدعا　　آنکھ میں خونِ تمنا بھی نہ ہو
وہ کسی کا ہو نہیں سکتا کبھی　　جو کسی سے روٹھ سکتا بھی نہ ہو

حیات مجھ کو نہ جانے کہاں پہ لے آئی　　نہ شوقِ بزمِ طرب ہے نہ ذوقِ تنہائی
یہ زندگی ہے کہ جیسے کوئی ادھوری بات　　لبوں تک آئے تو چھن جائے تابِ گویائی

دیکھنا ہے مجھے اب عشق کی توفیقِ طلب　　حسن کے ہاتھ میں ساغر بھی ہے تلوار بھی ہے
منکرِ فنِ غزل تھا جو فریدی اب تک　　وہی اس جنسِ گرامی کا خریدار بھی ہے

میکش اکبرآبادی



میکش اکبرآبادی — ١٩٠٥ء

عکسِ تحریر

فتنۂ موہوم

ہے میرا رازِ جنوں ایک فتنۂ موہوم
ترا ہی ذکر ہے لیکن تجھے یہ کیا معلوم

کسے خبر کہ تو کس وقت باخبر ہو جائے
سرِ مژہ پہ رکھوں دل کا عرضِ بے مفہوم

ابھی چمن میں ترے خار ہیں نہ نکہتِ گل
ترا ستم بھی ہے محفوظ لطف بھی موہوم

ہے میری توبہ بھی قصدِ گناہ کی صورت
ترا گناہ بھی موہوم قصد بھی معصوم

حیات و موت ہے تفریحِ سادگی تو تری
مری حیات بھی افسردہ موت بھی مغموم

کچھ اس طرح ہے تری غنچگی میں آمدِ گل
پسِ غبارِ شفق جیسے فوجِ ماہ و نجوم

کبھی ہیں دل میں وہ سادہ نگاہیاں تیری
نظر میں گھوم رہی ہے وہ شوخیِ معصوم

تو ہی ہے درد تو دل کا علاج نامنظور
تو ہی دوا ہے تو دل کی شفا ہے نامعلوم

تری نگاہ میں اپنا مقام کیا ڈھونڈوں
نہیں ہے خود بھی مجھے اپنی حیثیت معلوم

معاف کر میں اگر دل کی بات کہہ نہ سکوں
نہیں ہیں راس محبت کو اس جہاں کے رسوم

ترا تپاک بھی ہے دل کی مصلحت کے خلاف
ترے نثار تو میکش کی نظم سن کے نہ جھوم

میکش اکبرآبادی
۲۸ر۷ر۱۹۷۲ء

میکش اکبرآبادی

میں اپنے والد کا بڑا بیٹا تھا اس لیے ان کے وصال کے بعد مجھے ان کی جگہ بٹھا دیا گیا صوفیوں کی اصطلاح میں اسے سجادہ کہتے ہیں اس وقت میری عمر پونے دو سال کی تھی۔ یہ محض ایک رسم تھی کیوں کہ میں نے نہ اپنے والد سے علم حاصل کیا تھا اور نہ انھوں نے مجھے اپنی جگہ بٹھایا تھا لیکن شہر کے بڑے بڑے سجادوں نے اسے جائز اور مناسب سمجھا اور "کردیم وشد" کے مطابق میں سجادہ ہو گیا۔ اگر میں آئندہ عمر میں ان علوم سے آشنا نہ ہوا ہوتا تو میں بھی ہندستان کے نوے فی صدی موروثی سجادوں کی طرح ہوتا۔ خیر عرض کرنا یہ تھا کہ توقعات اور میرے سرپرستوں کی خواہشات کے مطابق سب سے پہلے تو مجھے عربی، فارسی، معقولات، منقولات کا مستند عالم ہونا چاہیے تھا۔ علم باطن حاصل کرنے کے علاوہ ریاضت و مجاہدہ اور تقوی و طہارت کی زندگی گزارنا چاہیے تھی۔ خاندانی رسوم و روایات کا سختی سے پابند ہونا چاہیے تھا۔ شہر میں ایسا اثر اور ہر دلعزیزی حاصل کرنا چاہیے تھی کہ عوام میرے اشارے پر چلیں، حکام میرے سلام کے لیے حاضر ہوں اور ہزاروں آدمی میرے مریدوں میں شامل ہو جائیں، کیونکہ یہ سب چیزیں میرا حق اور میری میراث تھیں اور اسے مجھے حاصل کرنا ہی تھا!

لیکن میں ایسا نہ ہو سکا۔ سوائے اس کے کہ جتنا علم مجھے حاصل کرایا گیا اور جتنا میں حاصل کر سکا وہ کرلیا اور وہ میرے بہی خواہوں اور سرپرستوں کی توقعات سے زیادہ تھا در حقیقت وہ کتنا تھا اس سے بحث نہیں۔ اسی طرح علم باطن بھی بحیثیت علم کچھ نہ کچھ حاصل کیا لیکن اس پر عمل کے لحاظ سے کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ میں نے رسوم و روایات کی پابندی بھی نہیں کی۔ میں سنے ہوئے تھا کہ میرے والد بزرگوار اور جد محترم نے بہت سی رسموں اور رواجوں میں اصلاح کی تھی یہاں تک کہ لباس اور وضع میں بھی اصلاحیں کی تھیں مثلاً اس زمانے میں شرفا کی عورتیں کرتی پہنتی تھیں جس میں تقریباً پورا پیٹ ناف تک کھلا رہتا تھا ڈھیلے پائنچوں کا فرشی پاجامہ عورتوں کا معزز لباس سمجھا جاتا تھا جسے اٹھا کر چلنے میں پنڈلیاں تو ضرور ہی کھل جاتی تھیں اسی طرح مرد گول پردے کا انگرکھا پہنتے تھے اس کے نیچے اور کوئی کپڑا نہیں پہنا جاتا تھا اس لیے سینے کا تقریباً پورا نصف حصہ ننگا رہتا تھا۔ میرے جد محترم نے اپنے یہاں اور اپنے مریدین و معتقدین کے خاندانوں میں عورتوں کو کرتے

پہنائے اور پاجامے کے پائنچوں کا طول عرض اتنا کم کر دیا کہ اٹھا کر چلنے کی ضرورت ہی نہ ہو بالکل جیسے آج کل کے فیشنی پاجامے ہوتے ہیں۔ اور انگرکھا ایسا ایجاد کیا جو سامنے سے بالکل بند ہوتا تھا۔ میرے والد بزرگوار ریاکاری اور نمائش سے سخت نفرت کرتے تھے انھوں نے مرید کرنا بھی چھوڑ دیا تھا اور اپنی وضع دنیا داروں کی سی کر لی تھی۔ اس بارے میں میں نے ان کی تقلید کی اور ہدف ملامت بننے سے گریز نہیں کیا۔

میں نے اہل شہر کی خدمت کرنا چاہی اور اپنے بزرگوں کی روش کو قائم رکھنا چاہا مگر زمانہ بدل گیا اور میں زمانے کے ساتھ نہ بدل سکا۔ میرے دادا صاحب تو گوشہ نشین تھے مگر ان کے بھائی اور میرے والد وغیرہ کا طرز عمل یہ تھا کہ عوام سے محبت و خلوص سے پیش آتے اور حکام سے بے توجہی اور تکبر کے ساتھ۔ عوام ان کے ساتھ رہتے ان کے احکام کی تعمیل کرتے اس لیے حکام میرے بزرگوں کی خوشامد کرتے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ عوام ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اس طرح وہ حکام سے عوام کی سفارشیں کرتے اور ان کی کار برآری کرتے رہے میرے ابتدائی زمانے میں ایک حکام رس طبقہ ہندو مسلمانوں میں ایسا پیدا ہو گیا تھا جو عوام کو حکام کی مرضی پر چلانے لگا تھا گورنمنٹ ان لوگوں کی عزت افزائی کر کے عوام کو مرعوب کرتی تھی اور ان کی معرفت عوام کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتی تھی۔ یہ عوام کو لڑاتے تھے پھر سفارش کر کے ان کو بچاتے بھی تھے۔ ان حضرات کے بعد ایک طبقہ پیدا ہوا جو ارباب اختیار کی آب و رنگ سے تواضع کر کے ان سے کام نکالتا تھا مگر کچھ نہ کچھ وضع داری اور آبرو کو سنبھالے ہوئے یہ کام کرتا تھا اور اپنی شان بھی قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا پھر یہ شان بھی ختم ہو گئی اب معزز کوئی نہیں ہے جو ہیں وہ گھر بیٹھے ہو گئیں صرف اذلال رہ گئے ہیں۔ بعض دفعہ تو "لذیذ بود حکایت" کی وجہ سے "دراز تر" کہنا پڑتا ہے لیکن یہاں بے محل طول صرف اس لیے دیا گیا کہ کہنے سے کچھ جی ہلکا ہو جاتا ہے۔

ان سب باتوں کے علاوہ میں شاعر بھی ہو گیا اس لیے کہ میں فطرتاً اور طبعاً شاعر ہوں اس میں روایت کو دخل نہیں ہے کیوں کہ جب میں نے شعر کہنا شروع کیا تو مجھے اچھی طرح پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ میرے بزرگ بھی شعر کہتے تھے اور میرے جد اعلیٰ میر اور نظیر کے عہد کے صاحب دیوان اردو فارسی کے شاعر تھے۔ اور میرے جد محترم تصوف کی مشہور کتاب جواہر غیبی کے مصنف فارسی کے شاعر تھے اور والد صاحب اُردو فارسی میں شعر فرماتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ میں شاعروں کا ساگردار نہ بنا سکا نہ اپنے آپ کو پیش کرنے اور شاعری کو کسب معاش اور حصول شہرت کا ذریعہ بنا سکا برسوں میرے گھر کے افراد اور احباب ہی کو اس کا علم نہ ہو سکا کہ میں شعر کہتا ہوں۔ یہ کمی اور کمزوری میری روایات کی وجہ سے بھی ممکن ہے مگر غالباً اس کا سبب میری خوئے حجاب کم آمیزی ہے اور

شاید حریفوں اور ہم پیشہ حضرات کی حد سے بڑھی ہوئی "انا" اور طلبِ شہرت کا ردعمل بھی ع

"زننگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائی ہا"

جن شخصیتوں نے مجھے صرف متاثر ہی نہیں کیا بلکہ اپنی تربیت 'اخلاق و کردار سے میری تعمیر بھی کی ان میں سب سے پہلی میری مادرِ محترم کی ذات ہے۔ وہ اپنی زندگی بھر میرے دل و دماغ پر چھائی رہیں اور اپنی موت کے بعد دل پر ایک مستقل زخم اور دماغ و ذہن پر ایک غیر معمولی تقدس و حیرت کا احساس چھوڑ گئیں جس میں ان کی غیر معمولی قسم کی موت اور موت کے بعد کے عجیب و غریب انکشافات نے ان کی زندگی کی بہ نسبت کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ مجھے ان کا وہ افسردہ تبسم یاد ہے جب میں ایک عزیز کی ماں کی موت کی خبر سن کر رو دیا تھا تو انھوں نے مسکرا کر کہا تھا "تمہیں میرے مرنے کا خیال آگیا" بات دراصل یہی تھی۔ میں ان کی زندگی میں بھی انھیں بہت رو یا ہوں میں سوچا کرتا خدا نہ کرے ان کا کچھ ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گا۔ مستقبل پر جہاں تک نظر جاتی اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا یہ سنے ہوئے تھا کہ والد بزرگوار کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہم پر تباہی اور مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور اماں جب بیمار ہوتیں تو پھر ایسی ہی تباہی کا ہم پر سایہ ڈالتی معلوم ہونے لگتی۔ ہم دونوں بھائی جب شرارت کرتے اور وہ اکتا جاتیں تو وہ کہتیں اچھا نہیں مانو گے، لو میں مرتی ہوں پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتیں ہم پکارتے اماں اماں' وہ نہیں بولتیں ہم دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے۔ وہ آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھتیں، گلے سے چمٹا لیتیں، اب ایسا نہ کرنا نہیں تو میں مر ہی جاؤں گی۔ پھر ایک ایسے ہی موقع پر میں نے ان کے تلووں میں گدگدی کر کے انھیں زندہ کر لیا تھا۔ وہ ہنستی ہوئی پاؤں سمیٹ کر اٹھ بیٹھی تھیں۔ بڑا شریر ہے کہتے ہوئے انھوں نے میرے گال تھپ تھپائے تھے۔ انھوں نے ہم دونوں بھائیوں کو کبھی نہیں مارا وہ ایسی ہی کسی نہ کسی ترکیب سے تنبیہ کر دیا کرتی تھیں۔ اپنے بزرگوں کے ہمارے باپ دادا کے واقعات سنایا کرتیں اور ہم سوچتے بڑے ہو کر ہم بھی ایسے ہی ہوں گے۔

اماں کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے کبھی ہم دونوں بھائیوں کو اپنی بے چارگی اور یتیمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ چچا زاد پھوپی زاد بھائیوں کو دیکھ کر ہم میں یہ احساس پیدا ہونا یقینی تھا کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں ہم بھی کریں جو کچھ ان کے پاس ہے ہمارے پاس بھی ہو۔ وہ ہمارے ناز اٹھاتیں اور اکثر فرمائشیں بھی پوری کرتیں مگر ساتھ ہی ساتھ تربیت بھی کرتی جاتیں یہاں تک کہ ہم بچپن سے ہی کسی کی دیکھا دیکھی کوئی کام کرنے کو برا سمجھنے لگے تھے کسی کی (کھانے یا کھیلنے کی) چیز کی طرف دیکھنا ہمیں بہت ہی شرمناک فعل معلوم ہوتا تھا اس کی سی چیز حاصل کرنے کی کوشش کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہم ایسی جگہ کھڑے بھی نہ ہوتے جہاں کوئی ایسی چیز لیے بیٹھا ہو۔

کچھ کھا پی رہا ہو یا ہنس بول رہا۔ ہماری دادی پھوپی چچی ایک گھر میں ہوتے ہوئے بھی جب تک ہمیں نہ بلائیں ہم نہ جاتے۔ ہمارا جی بھی نہ چاہتا اور ہم اسے اچھا بھی نہیں سمجھتے تھے۔

دس سال سے پندرہ سال کی عمر تک کے ہم چھ سات چچازاد پھوپی زاد بھائی تقریباً ایک ہی گھر کے مختلف حصوں میں رہتے تھے سب نے مل کر ایک انجمن بنائی اور اس میں پندرھویں دن مشاعرے ہونے لگے کیوں کہ ہم میں دو تین لڑکے شعر کہنے لگے تھے اور مشاعرے اگرچہ دیکھے نہ تھے مگر اکثر اپنے بڑوں سے ان کا ذکر سنتے رہتے تھے جو شہر میں مختلف مقامات پر ہوا کرتے تھے۔ ہماری انجمن کے مشاعروں میں میری غزل پسند کی جاتی تھی۔ میرے چچازاد بھائی جو ہم سب میں بڑے اور ہم سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے میری غزلوں پر شک کیا کرتے حالانکہ بعد میں وہ قبول کرے کہ وہ خود اپنے والد مرحوم کی غزلیں تخلص بدل کر پڑھا کرتے تھے۔ میری اس زمانے کی غزلیں ایسی ہوتی تھیں کہ کوئی بھی شاعر انھیں اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے شرمائے گا مگر ان کی طنز آمیز پہلو دار داد کا مجھ پر بڑا شدید ردعمل ہوا اور میں نے اپنا معمول بنالیا کہ میرا شعر اگر کسی کے شعر کا ہم مضمون ہوتا تو میں اپنا شعر کاٹ دیا کرتا۔ پھر ایک عرصے بعد کچھ واقفِ فن حضرات نے مجھے سمجھایا کہ اگر تمہارا شعر ہم مضمون ہونے کے باوجود دوسرے کے شعر سے اچھا ہوا اور اس میں ترقی کا کوئی پہلو ہو تو اسے کاٹنا نہ چاہیے۔ میرا عمل اب تک اسی پر ہے پھر بھی متقدمین کے شعر سے اگر مضمون لڑ جائے تو میں اپنا شعر کاٹ دینا ہی اچھا سمجھتا ہوں ان کے تقدم اور احترام کا تقاضا بھی ہے۔ اس ضمن میں بعض موقعے ایسے بھی آئے کہ بعض نامور اور مشاہیر شعرا نے میرے کسی شعر کو سن کر یہ اعتراف کیا کہ یہ مضمون نیا ہے اور پھر تھوڑے دن بعد وہی مضمون ان حضرات نے اپنے شعر میں باندھ کر مجھے سنایا۔ غالباً یہ حضرات اس کو جائز سمجھتے ہوں مگر میں اسے جائز نہیں سمجھتا اور سخت معیوب سمجھتا ہوں۔ مشاعروں میں شریک ہونے اور دوسروں کو اپنے شعر سنانے کا مجھے کبھی شوق نہیں ہوا۔ مولانا سیماب اکبرآبادی مرحوم نے میری اس عادت کا تذکرہ شاعر آگرہ نمبر میں افسوس اور شکایت کے ساتھ کیا ہے" اور مولانا حامد حسن قادری مرحوم نے نقد و نظر میں لکھا ہے۔

"غزل سنانے کا کوئی اصرار کرتا ہے تو تین یا چار شعر پڑھ دیتے ہیں پوری غزل شاید ہی کبھی سنائی ہو"

مولانا سیماب مرحوم نے مجھے سمجھایا کہ یہ شعر عاقبت میں تو کام آئیں گے نہیں انھیں چھپا کر رکھنے سے کیا فائدہ ہے اس کے بعد سے میں نے مولانا کے رسالے "پیمانہ" میں کلام دینا شروع کر دیا اور پھر دوسرے رسالوں میں بھی چھپنا شروع ہو گیا لیکن اچھے شعر سن کر اچھے شعر کہہ کر اور انھیں معیاری رسائل میں شائع کرا کے اور اسی طرح دانشمندوں سے اپنے اشعار کی داد پا کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔

۱۹۴۰ء میں میرا سیدھا ہاتھ کندھے کے پاس سے ٹوٹ گیا اور مجھے شفاخانے میں داخل ہونا پڑا۔ کمپنی میں سوراخ

کراکے ایک لوہے کی کیل ڈال دی گئی اور اس میں لوہے کا وزن باندھ کر میرا ہاتھ لٹکا دیا گیا۔ دوسرے روز صبح ایک صاحب تشریف لائے یہ میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور میرے شناسا تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے ارے صاحب میں تو تلاش کرتا ہوا آپ کے دولت خانے پر گیا وہاں ملاقات ہی نہ ہوئی۔ میں نے عرض کیا میں خود ہی آپ کے ہسپتال میں حاضر ہو گیا فرمائیے کیا خدمت ہے۔ کہنے لگے بات یہ ہے کہ ہمارے پرنسپل صاحب جا رہے ہیں ہم انھیں رخصتی پارٹی دے رہے ہیں ان کے متعلق ایک نظم لکھ دیجیے۔

جس ہاتھ سے نظم لکھتا وہ تو یہ آپ کے سامنے لٹکا ہوا ہے، میں نے عرض کیا۔

صاحب آپ بولتے جائیے میں لکھتا جاؤں گا۔

آپ نے فلاں صاحب سے نظم کیوں نہیں لکھوالی وہ بہت اچھے شاعر ہیں۔

میں پہلے ان کے ہی پاس گیا تھا مگر وہ تو معاوضہ مانگتے ہیں۔

اس زمانے میں ایک اینگلو انڈین نرس نے میری پیٹھ پر اسپرٹ پاؤڈر ملتے ہوئے کہا:

میں نے سنا ہے آپ بڑے فیمس پوئٹ (FAMOUS POET) ہیں۔

پوئٹ تو ضرور ہوں فیمس ہوں یا نہیں یہ مجھے معلوم نہیں۔

تو پھر آپ لیٹے لیٹے کیا کرتے ہیں نرس پر ایک نظم لکھ دیجیے نا!

اور میں نے نرس پر ایک نظم لکھ دی یہ نظم حرفِ تمنا میں شامل ہے۔

حضرت سراج السالکین شاہ محی الدین احمد نبیرۂ حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی کا ذکر نہ کرنا بڑی حق ناشناسی اور کفرانِ نعمت ہوگا۔ کیونکہ حضرت کے فیض تعلیم ہی سے میں کفر و اسلام کی حقیقت سے آشنا ہوا اور مذہب و تصوف کے بہت سے نظریوں سے مجھے رہائی حاصل ہوئی۔ کشف و کرامات کی حقیقت معلوم ہو کر دل سے ان کی تمنا جاتی رہی اور انسان کے مقام اور کائنات کی حقیقت سے کچھ نہ کچھ روشناسی حاصل ہو گئی کیوں کہ میں نے حضرت کی صورت میں انسان کامل کی زیارت کر لی۔ یہ ضرور ہے کہ اپنی بے علمی کی وجہ سے میں علم کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا لیکن یقین کی وہ دولت جو مجھے ان کی خدمت میں حاصل ہوئی میرے لیے کافی ہے۔

تیرے مے خانے کی تلچھٹ بھی ہے کافی ساقی بھرے چلّو میں جو شیشے میں ہے باقی ساقی

میں جب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو میری عمر ۱۲، ۱۳ سال کی ہوگی اور میں ٹونک کے ایک نیم غیر مقلد مولوی سے مشکوٰۃ اور تفسیر جلال پڑھتا تھا اور تمام صوفیوں اور تصوف سے بدظن ہو چکا تھا یا کر دیا گیا تھا۔ اس لیے حضرت

کی ہر حرکت و سکون کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ پھر میں نے حضرت سے چند مختصر رسالے تصوف کے پڑھے چند تقریریں سنیں اور حضرت کا کردار و عمل دیکھا۔ میں اتنا ہی کہ سکتا ہوں کہ بایزید جنید شبلی و رومی ابن سینا و فارابی کے کرامات و مقامات اور علم و دانش کے افسانے کتابوں میں پڑھے تھے وہ ان آنکھوں سے دیکھے اور سمجھے۔ میں یہ تو نہیں کہ سکتا کہ میں ان کے کشف و کرامات سے متاثر نہیں ہوا۔ لیکن مجھ پر سب سے زیادہ اثر ان کے خارج از انداز و قیاس علم و دانش اور ان کے کردار و عمل کا ہوا۔ ان کی خدمت میں گزرے ہوئے چند لمحے میری ساری عمر کا حاصل ہیں:

وہ چند لمحے جو گزرے ہیں ان کی صحبت میں | نہ ہوتے یہ بھی تو اس زندگی کا کیا کرتے

اتنے سرد و گرم دیکھنے کے بعد ان واقعات کا لکھنے والا ذی ہوش اور پختہ کار ہو گیا ہو گا تو یہ غلط ہے۔ اب تک وہی بچوں کا سا سادہ مزاج قائم ہے سب کی بات کا یقین اور سب سے خلوص جو آدمی ایک مرتبہ دھوکا دے چکا ہو وہ پھر جب چاہے دے لے۔ جو ابھی ناخوش کر چکا ہو وہ ذرا سی دیر میں پھر خوش کر لے۔ حسن اور اچھی چیزوں میں وہی جذب و کشش جو بچپن سے شروع ہوئی تھی۔ علمی صحبتوں کا وہی شوق اور ذی علم حضرات سے وہی محبت جو ابتدائے طالب علمی میں تھی۔ غرض دیکھا بہت کچھ، سمجھا بہت کم اور عمل کچھ نہ کیا۔ اب کبھی امنگ اٹھتی بھی ہے تو یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں:

چراغ گشتہ لے کر ہم تری محفل میں کیا آتے | جو دن تھے زندگی کے وہ تو رستے میں گزار آئے (امیکش اکبرآبادی)

انتخاب کلام

حاصل عشق غم دل کے سوا کچھ بھی نہیں | اور اگر ہے تو سب ان کا ہے مرا کچھ بھی نہیں
جس پہ بنیاد تمنا رکھی ہے دل نے | ان کے انداز تخاطب کے سوا کچھ بھی نہیں
کر دیا مست مری جرأت رندی نے مجھے | ورنہ تیرے لب رنگیں کا مزا کچھ بھی نہیں
جو خدا دے تو بڑی چیز ہے احساس جمال | لیکن اس راہ میں ٹھوکر کے سوا کچھ بھی نہیں
آپ ہی آپ الجھتی ہے مری وحشت دل | اب کھلا یہ کہ خم زلف دوتا کچھ بھی نہیں
میں نہ دیکھوں تو ترے حسن کی قیمت کیا ہے | میں نہ تڑپوں تو یہ انداز جفا کچھ بھی نہیں
ان کی پلکوں پہ بھی شبنم سی گری تھی دم صبح | میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو کہا کچھ بھی نہیں
وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے دنیا میکش | جس پہ ہم جیتے تھے وہ عہد وفا کچھ بھی نہیں

[نوٹ: داستان شب پر یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ نے دو ہزار روپیہ کی رقم کا ایوارڈ دیا۔ نقد اقبال کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سید مظہر علی شاہ]

ہم نفس اس چمن دہر میں کم آتے ہیں
بوئے گل سے کہو ٹھہرے ابھی ہم آتے ہیں

عاشقوں کی سی تجھے تاب کہاں ہے اے دوست
ورنہ مجھ کو بہت انداز ستم آتے ہیں

کم نگاہی بھی تری مصلحت آمیز نہ ہو
دل سے نالے مرے لب تک بھی تو کم آتے ہیں

تری نظروں میں تو کچھ سحر ہے ظالم ورنہ
اپنے قابو میں بھی مشکل ہی سے ہم آتے ہیں

کیا برہمن میں بھی باقی نہ رہی بوئے وفا
آج کیوں لوٹ کے کعبے میں صنم آتے ہیں

ہے یہ انسان ہی وہ قبلہ برحق کہ جسے
سجدہ کرنے کے لیے دیر و حرم آتے ہیں

خوب تھا ان کی توجہ کا زمانہ میکش
اب تو شاید انہیں ہم یاد بھی کم آتے ہیں

خزاں کی تیغ پہ ہے خون نسترن باقی
ابھی ہے رنگ چمن نکہت چمن باقی

بدل گیا ہے چمن میں مزاج لالہ و گل
ہے اک مجھی میں تری بوئے پیرہن باقی

ہوا زمانہ کہ رستے ہیں عشق کے ویراں
نہ راہرو ہی کوئی ہے نہ راہزن باقی

چلے تھے چند قدم ہی وہ میرے ساتھ مگر
ہے آج تک رہ الفت میں بانکپن باقی

نہ بت کدے میں برہمن نہ شیخ کعبے میں
مگر ہے معرکہ شیخ و برہمن باقی

فسانے کیا مری وارفتگی کے تازہ ہیں
نہیں تو زلف بتاں میں ہے کیوں شکن باقی

مجھی کو قدر زمانہ نہیں ہے اے میکش
وگرنہ ہے تو زمانہ میں قدر فن باقی

ترے گیسو کی بو غم کے مسافر پا ہی جاتے ہیں
صبا کتنا سنبھالے یہ تو کچھ لہرا ہی جاتے ہیں

نہ ہوں خوش جب بھی نظریں کچھ نہ کچھ تو کہہ ہی دیتی ہیں
وہ بے مہکے ہوئے کچھ پھول تو برسا ہی جاتے ہیں

نہیں ہے منحصر غم اور خوشی پر آپ کیوں سوچیں
مری آنکھوں میں آنسو بے سبب بھی آ ہی جاتے ہیں

کبھی گذرے دنوں کی یاد ان کو آ ہی جاتی ہے
شکایت لے کے میری پاس میرے آ ہی جاتے ہیں

معلم ہوں کہ ناقد حضرت واعظ ہوں یا ناصح
نہ سمجھیں خود مگر اوروں کو تو سمجھا ہی جاتے ہیں

خوشی سے بھی دلوں کا خون ہو جاتا ہے اے میکش
یہ پھولوں کی طرح کھلتے ہیں تو مرجھا ہی جاتے ہیں

○

کلائی اس کی دلوں کی طرح دھڑک بھی گئی
نقاب اس نے سنبھالی مگر سرک بھی گئی

وہی چراغ تمنا وہی پیام اجل
جو برق راہ کو چمکا گئی تڑک بھی گئی

کبھی وہ طرزِ ستم بھا گئی مرے دل کو
کبھی وہ شانِ ترحم مجھے کھٹک بھی گئی

نسیم آئی ہے شاید گلے لگا کے انہیں
کہ میرے پاس تو آئی مگر جھجک بھی گئی

بدل دیا تری غفلت نے آرزو کا نظام
یقیں تو کب تھا مگر آبروئے شک بھی گئی

وہ اک نظر مری عقل و جنوں کی حامل ہے
جو اس نظر سے ملی اور پھر بہک بھی گئی

نگاہِ دوست سے دل میرا خوں ہوا میکش
نگاہِ دوست سے میری غزل مہک بھی گئی

○

شرکتِ دید جو آئینہ گوارا کرلے
بات کرنی ہے ترے عکسِ مقابل سے مجھے

○

یہ رنگ و نور بھلا کب کسی کے ہاتھ آئے
کہاں چلے ہیں اندھیرے یہ ہاتھ پھیلائے

بجھا نہ صبح کو وہ بھی چراغِ لالہ رُخاں
جو شام حسن میں نظروں سے ہم جلا آئے

میں اپنے عہد میں شمعِ مزار ہو کے رہا
کبھی نہ دیکھ سکے مجھ کو میرے ہمسائے

کہاں وہ اور کہاں میری پُرخطر راہیں
مگر وہ پھر بھی بہت دور میرے ساتھ آئے

حرم کی آبرو ہم نے بہت رکھی پھر بھی
کئی چراغ صنم خانے میں جلا آئے

چلے چلو کہ بتا دے گی راہ خود رستے
کہاں ہے وقت کہ کوئی کسی کو سمجھائے

میں اپنے دل کو تو کچھ کہہ کے دے بھی لوں تسکیں
وہ مضطرب ہیں بہت ان کو کون سمجھائے

سمجھ کے غیر وہ خوش ہیں تباہ کر کے ہمیں
اور ایک ہم ہیں کہ یہ بات کہہ کے شرمائے

○

ظلم کرتے ہیں وفا ہو جیسے
یا وفاؤں کا صلا ہو جیسے

یوں مری سمت نہ دیکھا اس نے
مجھ کو ہی دیکھ رہا ہو جیسے

ان کا اندازِ خموشی اللہ
ابھی کچھ مجھ سے کہا ہو جیسے

کچھ نہیں پھر بھی ہے سب کچھ یہ جہاں
اس کا نقشِ کفِ پا ہو جیسے

تمھیں پا کر بھی یہ حالِ دل ہے
آپ کچھ ڈھونڈ رہا ہو جیسے

ایسی کیا شے تھی محبت کی نظر
ہم نے کچھ جرم کیا ہو جیسے

اُن کی آغوش میں ہے میرا خیال
دامنِ گل میں صبا ہو جیسے

یہ بھی اک طرزِ کرم ہے میکش
ظاہرا مجھ سے خفا ہو جیسے

○

اس گھر کو ذرا سجا کے رکھنا
ٹھیرے ہیں یہاں بھی ایک شب ہم

اللہ یہ ذوقِ دردمندی
لڑ لیتے ہیں تم سے بے سبب ہم

ہر بار ملے ہم اُن سے ایسے
جیسے نہ کبھی ملیں گے اب ہم

کچھ سمجھا کسی نے کچھ کسی نے
تھے کس کا پیام زیرِ لب ہم

بیٹھے ہیں جہاں لٹا کے اپنا
اب آپ سے کیا کریں طلب ہم

دیکھا ہے تمھیں نگاہ بھر کر
ہیں واقعی کتنے بے ادب ہم

○

میں بھی خوددار ہوں اُن میں بھی ہے خوئے تمکیں
داستاں دل کی ہوئی جاتی ہے پھر بھی رنگیں

میں مسافر ہوں مری فکر نہ فرمائے کوئی
کاٹ لی صبح تو کٹ جائیگی اب شام کہیں

عمر اک نزع کے عالم میں بسر کی میں نے
زیست کا وہم ہی کب تھا کہ ہو مرنے کا یقیں

داستانیں بھی غلط عرضِ حقیقت بھی فضول
تم سے کہنے کے لیے آج کوئی بات نہیں

○

میں کتنے ماہ پارے راستے میں چھوڑ آیا ہوں
نہ جانے آ رہا ہے یاد کیا کیا دیکھ کر تجھ کو

مہک پا کر تری گلشن کی شاخیں جھوم اٹھتی ہیں
کلی کا رنگ ہو جاتا ہے گہرا چوم کر تجھ کو

نہ آئی راس وہ سادہ نگاہی میری رندی کو
کیا کن مشکلوں سے بدگماں اے بےخبر تجھ کو

○

عشق سے اک جہان ہے ورنہ
چند ذرّوں کی کائنات ہی کیا

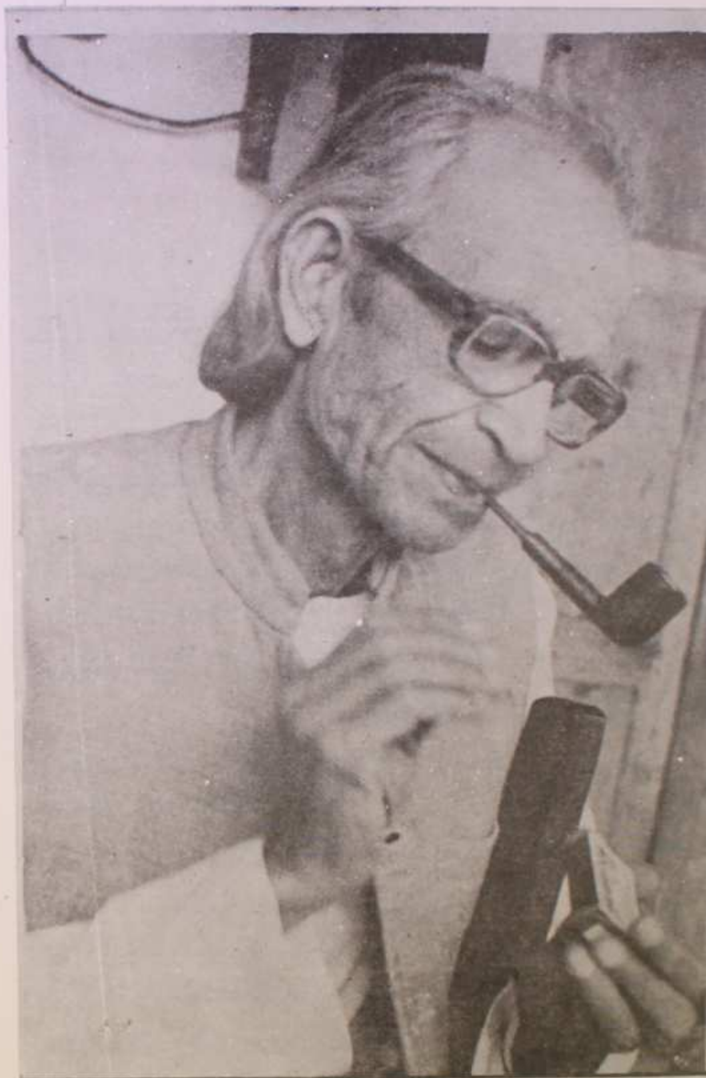


یہ جہاں ایک نظر، اور نظر کچھ بھی نہیں — وہ جہاں حرفِ خبر، اور خبر کچھ بھی نہیں
اُن کی خوشبو سے مہکتی ہوئی میری سانسیں — اور اِس باغ میں اے بادِ سحر کچھ بھی نہیں
ق
رنگ و بو کا یہ جہاں کارگہِ لالہ رُخاں — کیسے کہہ دوں کہ بجز ذوقِ نظر کچھ بھی نہیں
کیوں یہ بجلی سی چمکتی ہے نظر کے آگے — دل یہ کیوں شعلہ سا گرتا ہے اگر کچھ بھی نہیں
رات شبنم کی طرح ہو گئی پھولوں میں بسر — اب یہ کیا غم ہے اگر وقتِ سحر کچھ بھی نہیں
یہ حرم ہے یہ صنم خانہ، یہ دنیا ہے یہ دیں — ہم اُدھر دل لیے بیٹھے ہیں جدھر کچھ بھی نہیں
میری منزل کے نشاں ہیں مرے رستے کا غبار — انجم و کاہکشاں، شمس و قمر کچھ بھی نہیں
آبگا آب ہے اِن آنکھوں کو چھو کے تو دیکھ — یہ خط و خال و رخ و زلف و کمر کچھ بھی نہیں
نقشِ پا بھی تو ٹھہرتے نہیں راہی کی طرح — منزلِ عشق بجز راہگذر کچھ بھی نہیں
ایک ہی رنگ پہ ہے حالتِ دل اے میکش — یہ وہ عالم ہے جہاں شام و سحر کچھ بھی نہیں



ہے میرا رازِ جنوں ایک فتنۂ معصوم — ترا ہی ذکر ہے لیکن تجھے یہ کیا معلوم
کسے خبر کہ تو کس وقت باخبر ہو جائے — سرِ مژہ یہ رکھوں دل کی عرضِ بے مفہوم
ابھی چمن میں ترے خار ہیں نہ نکہتِ گل — ترا ستم بھی ہے محفوظ، لطف بھی موہوم
ہے میری توبہ بھی قصدِ گناہ کی صورت — ترا گناہ بھی موہوم، قصد بھی معدوم
حیات و موت ہے تفریح سادگی کو تری — مری حیات بھی افسردہ، موت بھی مغموم
کچھ اس طرح ہے تری غنچگی میں آمدِ گل — پسِ غبارِ شفق جیسے فوجِ ماہ و نجوم
کھبی ہیں دل میں وہ سادہ نگاہیاں تیری — نظر میں گھوم رہی ہے وہ شوخیِ معصوم
تو ہی ہے درد تو دل کا علاج نامنظور — تو ہی دوا ہے تو دل کی شفا ہے نامعلوم
تری نگاہ میں اپنا مقام کیا ڈھونڈوں — نہیں ہے خود بھی مجھے اپنی حیثیت معلوم
معاف کر میں اگر دل کی بات کہہ نہ سکوں — نہیں ہے یار اس محبت کو اس جہاں کے رسوم
ترا تپاک بھی ہے دل کی مصلحت کے خلاف — ترے نثار، تو میکش کی نظم سن کے نہ جھوم

وامق جونپوری



سید احمد مجتبیٰ وامق جونپوری ۲۳ر اکتوبر ۱۹۰۹ء

عکسِ تحریر

غزل در غزل سے ماخود غزل

وہ دور دور ہی رہتا ہے زندگی جیسے
مگر خیالوں سے بجھتا ہے روشنی جیسے

جو لوٹ لوٹ کے ملتے ہیں غیر ملکوں میں
دلوں میں فاصلے رکھتے ہیں اجنبی جیسے

سفید کپڑوں میں ملبوس کتنی بدروحیں
بدل کے چہرے لگاتی ہیں آدمی جیسے

ہے آبِ تیغ ہی آبِ حیات در زر فرات!
جو خود ہو قید شہیدوں کی تشنگی جیسے

زبورِ شوق تو ملتی نہیں دکانوں پر
غزل ہیں ہے وہ صحیفوں میں انگلی جیسے

غزل سے ملتا ہے آوارہ جنونوں کا سراغ
غزل ہے خانہ بدوشوں کی زندگی جیسے

غزل کہو تو یہ محسوس ہی ہے وامق
چھروں کو کاٹ رہی ہو کوئی چھری جیسے

وامق جونپوری

وامق جونپوری

میرا نام سید احمد مجتبیٰ زیدالواسطی ہے۔ تخلص وامق جونپوری۔ وطن کجگاؤں ضلع جونپور (222138) ہے۔ والد کا نام سید محمد مصطفیٰ صاحب خان بہادر بطاب تراہ۔ جائے پیدائش خاص وطن۔ تاریخ ولادت ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۹ء۔ ابتدائی تعلیم اردو فارسی عربی (بس میزان منشعب تک) اور انگریزی مکتبی صورت میں گھر پر ہوئی۔ وطن سے چل کے پہلے بارہ بنکی تک گیا جہاں والد مرحوم صوبائی سول سروس میں تھے اور مولوی متوسط حسین صاحب مرحوم زیدپوری اردو فارسی اور عربی کے عالم میرے اتالیق مقرر ہوئے۔ آج میرے استعمال میں جو زبان اور لغت ہے وہ سب انھیں کا عطیہ ہے۔

بارہ بنکی سے ہائی اسکول کیا جب وہاں شیخ مہدی حسین ناصری صاحب مرحوم ہیڈ ماسٹر تھے، والد مرحوم کے دوست اور راقم الحروف کے ہفت زبان بزرگ "اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں"۔ فیض آباد گورنمنٹ انٹر کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی کیننگ کالج سے بی اے۔ ایل ایل۔ بی کی ڈگریاں لے کے ۱۹۳۲ء میں تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد ضروری ٹریننگ لیکر ۱۹۳۹ء میں فیض آباد میں وکالت شروع کر دی۔

میں نے ایک آسودہ حال زمیندار اور سرکاری نوکری پیشہ خاندان میں آنکھیں کھولی تھیں۔ سن شعور تک پہنچتے پہنچتے اپنے ماحول کی قدیم روایت پسند اور انگریز پرست ذہنیت سے متنفر ہو کر میں اپنے میں ایک نوع کی گھٹن سی محسوس کرنے لگا تھا۔ مگر ہماری خاندانی تہذیب میں حفظ مراتب، انداز خطاب، نشست و برخاست اور بزرگوں کے احترام کا رنگ اس قدر پختہ تھا کہ انحراف یا بغاوت تو درکنار اپنے خیالات کا اظہار بھی بعید از تصور تھا۔ البتہ جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوا تو وہاں آزادی اور غلامی کا براہ راست تصادم دیکھنے میں آیا۔ یونیورسٹی میں بھی اور اس کے باہر بھی۔ آرگینک کیمسٹری کے میرے استاد ڈاکٹر حسین ظہیر آئے دن قید ہو کر جیل جایا کرتے تھے، اور تحریک آزادی شباب پر تھی۔ کسی موقع پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی سے ملایا۔ یہ کتنی مبارک و مسعود ملاقات تھی کہ ڈی۔ پی۔ کی مقناطیسی شخصیت کے طفیل میں میری زندگی ایک نئے موڑ پر آگئی۔ ان کی قربتوں اور صحبتوں نے آزادی فکر و نظر کا وہ راستہ دکھلایا کہ خاندانی بورژوا اور نوکر شاہی روایات کی سب گرمیں ایک

ایک کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ بندھن ٹوٹنے لگے۔ میرے سیاسی سماجی اور جمالیاتی شعور کو وہ جلا نصیب ہوئی کہ آج تک اس کی روشنی میں اپنی منزل کی طرف گامزن ہوں۔ ان کی عالمانہ سحر گفتاری نے ذہن میں ایسے دریچے کھولے کہ ساری گھٹن دور ہو گئی اور غلامی کی فصیلوں میں دراڑیں نظر آنے لگیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب بنّے بھائی سجاد ظہیر نے ادبی محاذ پر رجعت پرستی اور غلامی کے خلاف پنڈت نہرو کی سرپرستی اور منشی پریم چند کی صدارت میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی لکھنؤ میں بنیاد رکھی تھی۔ ترقی پسند تحریک نے ادیبوں اور دانشوروں کو وہ شعور عطا کیا جس میں رجعت، روایت، توہم اور خوف و ہراس کی زنجیریں ٹوٹ کر رہ گئیں۔ کاروان ادب ایک نئے افق کی سمت گامزن تھا اور جوق در جوق اہل قلم اس میں شامل ہو رہے تھے۔ اور میں ان سب کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا اور ان کی تخلیقات پر رشک کرتا تھا۔ ادب تخلیق کرنے کے لیے شعور علم اور تخلیقی صلاحیت کے علاوہ مشق کی ضرورت بھی ہوتی ہے جس کا مجھ کو کوئی تجربہ نہ تھا۔ علاوہ مطالعہ کے کبھی شعر نہیں کہا تھا۔ بس ایک حسرت لیے ہوئے کئی سال گذر گئے۔ وکالت کی ٹریننگ کے بعد جب فیض آباد میں پریکٹس شروع کی تو وہاں اچھا خاصہ ادبی ماحول ملا۔ مقامی شعری نشستیں اور مشاعرے ہوتے تھے۔ فیض آباد سے قربت کی وجہ سے اکثر جگر صاحب، مجروح سلطانپوری، خمار بارہ بنکوی اور مسعود اختر جمال وغیرہ آجایا کرتے تھے۔ ہر فن کے ماہرین کی صحبت اور قربت سے فن آ ہی جاتا ہے۔ چنانچہ ان حضرات سے اختلاط میسّر ہونے پر میں نے بھی شعر موزوں کرنا شروع کر دیا۔ اور اوائل ١٩٤١ء تک شعرا میں میرا شمار ہونے لگا۔ ١٩٤١ء میں گورکھپور کے ایک مشاعرہ میں بہت سے ترقی پسند شعرا سے ملاقات ہوئی۔ مشاعرہ کے دوسرے دن مجنوں صاحب کی نگرانی میں ایک خالص ترقی پسند مشاعرہ ہوا۔ میں نے بھی اس میں شرکت کی اور اس دن سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ عملی ممبر بن گیا۔

١٩٤٢ء میں وکالت ترک کر کے تلاش معاش میں میں دہلی چلا گیا۔ دوسری عالمی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی۔ تلاش معاش تو کم البتہ شعر و شاعری سے زیادہ سروکار رہا۔ اس زمانہ میں ملک کے چوٹی کے ادیب وہاں مجتمع تھے۔ مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، پروفیسر احمد علی، میرا جی، اختر الایمان، ن۔ م۔ راشد، حفیظ جالندھری، سید محمد جعفری اور پطرس بخاری وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کے سب ترقی پسند تحریک سے تعلق تو نہ رکھتے تھے مگر جدید اذہان کے مالک ضرور تھے۔ ادبی صحبتیں، شعری اجتماعات اور نظریاتی بحثیں رہا کرتی تھیں جن میں شرکت کے لیے علاوہ تحقیقی کام کے نظریاتی مطالعے کی ضرورت ہوا کرتی تھی سو وہاں وہ تقاضہ بھی پورا ہوتا رہا۔ وہاں سے بے نیل و مرام ١٩٤٣ء تک وطن پھر واپس آگیا۔ وطن میں ایک دن گذارنے کے بعد کلکتہ چلا گیا۔ وہاں قحط بنگال کے دلخراش مناظر دیکھے۔ واپسی پر نظم "بھوکا بنگال" لکھی جس کے بعد میرا شمار صف اوّل کے ترقی پسند شعرا میں ہونے لگا۔ بیکاری سے تنگ آکر میں نے بنارس کے محکمہ سپلائی و راشننگ میں نوکری کر لی اور ایک سال میں ترقی کر کے راشننگ افسر ہو گیا۔ مگر اپنی تخلیقات پر اس نوکری کو میں نے حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ ایک انتقامانہ جذبہ کے ساتھ قلم چلاتا رہا۔ میں بالاعلانی

مشاعروں اور جلسوں میں اپنی انقلابی نظمیں پڑھتا تھا۔

اب جنگ ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ اور اس کے خونی نتائج کا ایک حشر برپا تھا اور ہم اس شرمناک اور بہیمانہ اظہار فرقہ پرستی کے خلاف چیخ چیخ کر نظمیں کہہ رہے تھے۔ ان دنوں میں الہ آباد میں متعین تھا۔ میرا پہلا شعری مجموعہ چیخیں ۱۹۴۸ء میں وہیں سے شائع ہوا تھا، جس میں تقسیم ملک، فسادات اور مہاتما جی کے قتل پر میری نظمیں شامل تھیں۔ اسی زمانہ میں میری قیام گاہ معتوب کمیونسٹ رہنماؤں کا خفیہ سیل اور جائے پناہ بھی تھی۔

جب میرا تبادلہ بارہ بنکی ہوا تو وہاں سے میں ہر اتوار کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشست میں شرکت کرنے لکھنؤ جایا کرتا تھا جو پروفیسر آل احمد سرور کے مکان پر ہوا کرتی تھی۔ احتشام صاحب، رضیہ سجاد ظہیر، مجاز، مسیح الحسن رضوی، عابد سہیل، منظر سلیم، باقر مہدی اور تقی حیدر وغیرہ سے ملاقاتیں اور بحثیں رہتی تھیں۔ اب حکومت کے کان کھڑے ہونے لگے تھے۔ جب نوکری کا جامہ ترقی پسندی کے جسم پر تنگ ہو کر مسکنے لگا تو میں سرکاری نوکری سے مستعفی ہو گیا۔ یہ ۱۹۵۰ء کا زمانہ تھا۔ اور اسی سال میری نظموں کا دوسرا مجموعہ "جرس" دانش محل سے شائع ہوا۔

۱۹۵۲ء تک گھر پر رہا۔ اب زمینداری بھی ختم ہو چکی تھی جس کا مجھ کو کوئی افسوس نہ تھا۔ مگر جب فاقوں کی نوبت قریب آگئی تو میں پھر دہلی چلا گیا اور ماہنامہ شاہراہ کا مدیر ہونے اور ڈھائی سو روپے ماہوار کو غنیمت جانا۔ ۴۴-۱۹۴۳ء تک وہاں رہا۔ وہاں سے ذاکر صاحب (Dr. Zakir Husain V.C.M.U.) مجھ کو علیگڈھ لے گئے اور انجینئرنگ کالج کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا۔ رہنے کو ایک اچھا مکان مل گیا اہل و عیال آ گئے اور بچوں کی باقاعدہ تعلیم شروع ہو گئی۔

اب انجمن ترقی پسند مصنفین کا مصنوعی بحران علیگڈھ تک پہنچ چکا تھا۔ یہ بحران تحریک کے چوٹی کے نام نہاد ممبروں کی سازش تھی جس کو موقع پرستی کا ایک تاریخ ساز منصوبہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں ان حضرات کو حالات سے باخبر رکھنے کی حجت تمام کرنے کے لیے خطوط پر خطوط لکھتا رہا اور تحریک کو جاری رکھنے کی ضرورت پر زور دیتا رہا مگر تحریک کے کسی .H.Q نے کسی ایک خط کا جواب دینا بھی گوارہ نہ کیا۔ جواب کون دیتا۔ بقول ڈاکٹر افغان اللہ کے وہ سب لوگ تو "گیہوں گلاب" کی کھیتی میں لگے ہوئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ میری تخلیقات اور میرے جیسے دوسرے پختہ ذہن اور شعور رکھنے والوں کی تخلیقی سرگرمیوں پر تو اس بحران کا کوئی اثر نہ ہوا مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نئی نسل جو انجمن سے منسلک تھی منتشر ہو گئی اور وہ نوجوان جو انجمن کی جانب آ رہے تھے آدھے راستے سے لوٹ گئے۔

میں بھی ۱۹۶۱ء میں علی گڑھ سے کشمیر چلا گیا اور نو برس وہاں نوکری کر کے ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہو کر وطن واپس آگیا۔

وطن واپس آنے کے بعد چھ سات مہینہ خوب آرام کیا اور اس کے بعد پھر جو قلم اٹھایا تو اپنی دم کتاب اور قلم ہاتھ سے

چھوٹے ہنیں۔ ۱۹۷۹ء میں میرا تیسرا شعری مجموعہ "شب چراغ" شائع ہوا جس پر مجھ کو اتر پردیش اردو اکادمی کا پہلا ادارڈ ملا۔ اور ۱۹۸۰ء میں ادبی خدمات پر مجھ کو سوویت لینڈ نہرو ادارڈ ملا۔ چوتھا شعری مجموعہ "سفر ناتمام" زیر ترتیب ہے۔ میری ۴۵ سالہ ادبی زندگی میں بمقابلہ غزل نظموں کا حصہ زیادہ ہے جن میں قاری کو نئے تجربے ملیں گے۔ مثلاً "مینا بازار" اردو کا پہلا سیمائر ہے۔ "زمین" اردو کی پہلی اوڈ (Ode) ہے۔ اور بہت سی سالیلوکی ہیں۔ اور دوسری نظمیں مثلاً امن عالم پر "نیلا پرچم" فسادات پر "تقسیم پنجاب" قحط بنگال پر "بھوکا بنگال"۔ فنون لطیفہ پر "فن"۔ میرے تصور وقت پر "وقت" اور میری تازہ ترین نظم "سفر ناتمام" ایسی ہیں جن میں مقصد اور تخلیقی فن کی آمیزش قابل توجہ ہے۔

مجھ کو اعتراف ہے کہ گذشتہ دس برسوں میں بہ نسبت نظموں کے میں نے غزلیں زیادہ کہی ہیں اور شاید عصری تقاضہ بھی یہی تھا۔ مگر اس کمی کو میں نے ادبی تنقیدی اور علمی مضامین لکھ کے بڑی حد تک پورا کیا ہے۔ ان کو بھی جمع کر کے کتابی شکل میں پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ وقت کم ہے اور قلم رکھ دو (PEN DOWN) کی آواز آنے والی ہے۔ این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید۔

وامق جونپوری

انتخاب کلام:

کیا ضروری ہے کہ دیوان پہ دیوان لکھو
ایک شعر ایسا کہو زندۂ جاوید کہو

ہم نے خاموشی کو آواز ہمیشہ جانا
تم بھی دیوار سے کان اپنا لگا کر سن لو

آہن ہنیں کہ چاہئے جب موڑ دیجئے
شیشہ ہوں مڑ تو سکتا ہنیں توڑ دیجئے

پتھر تو روز آتے ہی رہتے ہیں صحن میں
حل اس کا یہ نہیں ہے کہ گھر چھوڑ دیجئے

دیار شوق نگاہوں سے دو قدم بھی ہنیں
مگر یہ فاصلۂ چند گام کم بھی ہنیں

میری بربادی کا ہر لب پہ فسانہ ہوگا
تم نہ ہوگے تو کوئی اور بہانہ ہوگا

رباب زندگی میں جتنے ٹوٹے تار ہوتے ہیں
انھیں کو جوڑ کر نغمے مرے تیار ہوتے ہیں

ضبط غم آج بہت کام آیا
ہنس دئے ہم جو ترا نام آیا

دیکھئے آج گذرتی ہے مری شام کہاں
گردش جام کہاں گردش ایام کہاں

غم حبیب غم زندگی غم بے وجہ
بہر نصیب عجب چیز ہے یہ قلب حزیں

سکوں ہے اس شور کا نتیجہ جو انقلابات سے ہو پیدا
وہیں خوشی کا نقش پا ہے قدم اٹھا ہے جہاں سے آگے

قریب تے تو قیامت کا لطف آتا تھا
ہوئے جو دور تو یادوں کا حشر برپا ہے

حسرتوں کا ہمیں نہ پرسہ دو
ہم نے یہ رسم ہی اٹھا دی ہے

یوں جزوِ زندگی ہوئی جاتی ہے تیری یاد
جیسے کوئی شراب ملا دے شراب میں

دستِ دریا شل ہیں کنارے سے لگا بیٹھا ہوں
لیکن اس شورشِ طوفاں سے ہارا تو نہیں

جہاں چوٹ کھانا وہیں مسکرانا
مگر اس ادا سے کہ رو دے زمانہ

فلک سے کہو سرد کر لے جہنم
زمانے کو خود پھونک لے گا زمانہ

میری خاموشی پہ برہم نہ ہو مجھ سے اے دوست
چلنے والے ہی تو دم لیتے ہیں چلنے کے لیے

پا لیا کرتے ہیں جینے کی تمنّا میں کبھی
ڈگمگانا بھی ضروری ہے سنبھلنے کے لیے

یقیں سے کام لو وہم وگماں سے کچھ نہیں ہوتا
زمیں کے رہنے والو آسماں سے کچھ نہیں ہوتا

کبھی کتاب کبھی انقلاب لائے ہیں
بدل بدل کے سبو ہم شراب لائے ہیں

ہے عجیب عالمِ سرخوشی نہ شکیب ہے نہ شکستگی
کبھی منزلوں سے گذر گئے کبھی رہ گذر کی تلاش ہے

مجھے اس جنوں کی ہے جستجو جو چمن کو بخش دے رنگ و بو
جو نوید فصلِ بہار ہو مجھے اس نظر کی تلاش ہے

ابھی تو شفق ظلمتوں میں گھری ہے طلوعِ نگارِ سحر ہو تو کیسے
ابھی تو پریشان ہے زلفِ گیتی مری داستاں مختصر ہو تو کیسے
یہ اندھیر نگری بہت دور تک ہے لٹیروں کی بستی بہت دور تک ہے
گذرنا ادھر ہی سے ہے کارواں کو بغیر تصادم گذر ہو تو کیسے

کیا کبھی ہوتی کسی کی تو مگر اے زندگی
زہر پی کر ہم نے رکھ لی تیرے دیوانوں کی بات

رشتۂ یادِ بتاں ٹوٹا نہ ترکِ عشق سے
ہے حرم میں اب بھی زیرِ لب صنم خانوں کی بات

آج کی شام ہے کس درجہ حسیں کتنی اداس
ہو بھری بزم میں تنہائی کا جیسے احساس

لغزشِ پا کا علاقہ نہیں سرمستی سے
لغزشِ پا تو ہے خمیازۂ پندارِ حواس

ان سے سمجھوتے پہ دل مائل نہیں
ہم ادھوری بات کے قائل نہیں

برق سرِ شاخسار دیکھیے کب تک رہے
ہم کو یقینِ بہار دیکھیے کب تک رہے

دیکھیے کب راہ پر ٹھیک سے اٹھیں قدم
رات کی مئے کا خمار دیکھیے کب تک رہے

محنتِ بے دام پر نظمِ کہن برقرار
نظمِ کہن برقرار دیکھیے کب تک رہے

اہلِ جنوں خوب ہیں واقفِ آئینِ شوق
دل پہ مگر اختیار دیکھئے کب تک رہے

کہیں ساقی کا فیضِ عام بھی ہے
کسی شیشے پہ میرا نام بھی ہے

نوائے چنگ و بربط سننے والو
پسِ پردہ بڑا کہرام بھی ہے

جب علم ہو صورت گردشِ شاطرِ دو رُخ
فردوس ہے آدم کے لیے بے خبری بھی

اک سلسلۂ دار و رسن پھیلا ہوا ہے
منجملہ خطاؤں کے ہے صاحب نظری بھی

صہبا کے لیے موزوں ہر جام نہیں ہوتا
یا رند بھی ہر بادہ آشام نہیں ہوتا

رسوائیٔ دولت بھی عصمت کی ضمانت ہے
مفلس جو نہیں ہوتا بدنام نہیں ہوتا

میخانہ کو ہم چھوڑ کے کعبہ سے گذرتے
وہ راہ مگر کہتے ہیں سنسان بہت ہے

جس شہر میں ہم پہنچے وطن بن گیا اپنا
جس شہر میں ہم رہتے ہیں ویران بہت ہے

وہ ایک شب تھی کٹ گئی جو انتظارِ صبح میں
مگر وہ صبح جب سے نیند آج تک حرام ہے

جنوں کی درس گاہ ہے برا کہو نہ دشت کو
دعائیں دو اُسے کہ یہ ہمارے گھر کا نام ہے

ہمسائیگی میں اس کی ہے کیا لطف اندروں
لیکن یہ لطف سایۂ دیوار ہی تو ہے

جنوں مشرب جنوں ساماں جنوں کردار دیوانے
مگر یاروں کی محفل میں سراپا یار دیوانے

وہ دورِ سرفروشی یاد تو ہوگا تمہیں واثق
کہ جب ہنستے ہوئے جاتے تھے سوئے دار دیوانے

قرطاس پہ نقشے ہمیں کیا کیا نظر آئے
سب خشک نظر آئے جو دریا نظر آئے

ہم نے جو تراشے تھے صنم عہدِ جنوں میں
اُن میں سے ہر اک آج شوالا نظر آئے

اِس دور کی تصنیف بھی کیا شیشہ گری ہے
ہر آئنہ میں آدمی اُلٹا نظر آئے

پابندیوں میں تھے تو دکھاتے تھے معجزے
آزادیوں میں شعبدہ گر ہو کے رہ گئے

اہلِ جنوں وہ کیا ہوئے جن کے بغیر ہم
اہلِ خرد کے دستِ نگر ہو کے رہ گئے

منھ جتنے اتنی باتیں بھی جا رہی ہیں آج
یوں مشتہر ہوئے کہ خبر ہو کے رہ گئے

اس طرح سے کشتی بھی کوئی پار لگے ہے
کاغذ کا بنا ہاتھ میں پتوار لگے ہے

اک وقت وہ تھا جب کہ رسن و دار میں تھا لطف
اب لطف بھی ان کا رسن و دار لگے ہے

مہکتی رہتی ہے غربت میں بھی شرافتِ نفس
گُلِ فسردہ سے خوشبو کبھی نہیں جاتی

کچھ فیصلہ نہ ہو سکا ابھی بہار میں
دامن کو تار تار کریں یا رفو کریں

در میکدہ کا بند حرم کا چراغ گل
خون جگر پئیں کہ لہو سے وضو کریں

کس قدر ہے گداگروں کا ہجوم
تیرے کوچہ میں راستہ ہی نہیں

لطف دیکھو اک کھنڈر تعمیر کرنے کے لیے
گھر سے بے گھر ہو گئے کتنے گھرانے شہر میں

کر رہا ہے ہر کس و ناکس حقیقت سے فرار
اب نہیں لگتا کسی کا دل پرانے شہر میں

حسن ضرب المثل ہر ادا بر محل تو سراپا غزل
جس طرح چاندنی میں نہایا ہوا تاج آئے نظر

شعر ذکر بتاں شعر فکر جہاں شعر عطر زباں
شعر ہے اک فسوں کیا خرد کیا جنوں اسکے زیر اثر

اونچے محل سے چھپ نہ سکی پست ذہنیت
ہم ایک دن میں بھول گئے جھونپڑوں کی رات

بے تاج دن میں رات میں نغفور میکدہ
وامق ہزار راتوں کی ہے شاعروں کی رات

پرچھائیوں کی باہوں میں مہتاب کے سبو
یہ جنگلوں کی رات ہے یا میکدوں کی رات

وقت آگیا انڈیلئے ساغر میں آفتاب
پھر اپنے جوڑے کھول رہی ہے غموں کی رات

اس کی آواز ہے نغمہ کبھی نکہت کبھی رنگ
خامشی ایسی کہ اس کو بھی نوا کہتے ہیں

یہی پتھر ہے جسے کہتے ہیں سب تاج محل
سر پہ آئے تو محبت کی سزا کہتے ہیں

مدتوں بعد جو دیکھو گے تو ڈر جاؤ گے
اپنے کو آئینہ ہر روز دکھاتے رہنا

خود فریبی سے حسیں تر نہیں کوئی جذبہ
خوش جو رہنا ہے تو یہ دھوکا بھی کھاتے رہنا

خبر نہیں کہ ساتھ رہنے کا نتیجہ کیا ہوا
کچھ اس کا قد بڑھا بھی ہے کہ میں ہی قد میں گھٹ گیا

جسم پہ سر لیے جب ہم سر محشر نکلے
سرنگوں شرم سے قوموں کے پیمبر نکلے

کون سولی پہ جائے گا پہلے
بولا قاضی شہر پہلے کہ ہم

جو ہری حشر گاہ میں وامق
کس کو معلوم تم رہو گے کہ ہم

ایک گلزار تصور ہے بہت تیرے لیے
بلبل شوق ابھی اور چہک اور چہک

ایک تہذیب ہے فنکاری کی آشفتہ سری
اے جنوں اور بہک اور بہک اور بہک

ایک تشکیک سے بوجھل ہے فضائے گلشن
اے گل زخم جگر اور مہک اور مہک

ایک وقت آتا ہے جب آتا ہے تاریخ کو ہوش
جام لبریز غم زیست چھلک اور چھلک

اس خاکداں میں رہنے سے اکتا گیا ہے دل
جی چاہتا ہے پھر کوئی بھاری خطا کریں

ممکن ہے اس کو توڑ کے نکلے کوئی درخت
پتھر کے سامنے چلو مل کر دعا کریں

جان پر بن تو گئی تجھ کو مگر پا گئے ہم
روشنی تو نے یہ رفتار کہاں سے پائی
کاٹ دیتا ہوں غلط بات کو خاموشی سے
میں نے تلوار کی یہ کاٹ زباں سے پائی

ہمارا ذوقِ تجسس صنم تراشی ہے
ہمیں ہے حسن پسِ پردۂ حجاب پسند
الٹ کے آئنہ ہر بچہ دیکھتا ہے ضرور
سکونِ قلب ہے کس درجہ انقلاب پسند
ہر انقلاب نئے انقلاب کا ہے نقیب
مزاجِ وقت ہے کس درجہ انقلاب پسند

سنتے ہیں اہلِ نظر ہوتے ہیں پاگل پیدا
ٹھیک ہے خاک سے ہوتے نہیں بادل پیدا
ہم نے صحراؤں میں دیکھی ہیں کچھ ایسی آنکھیں
قدرتی جس میں ہوا کرتا ہے کاجل پیدا
قوتِ نامیہ حیواں کی نہیں انساں میں
آج ہم سے وہ بڑا ہے جو ہوا کل پیدا

آگیا کیا ہی زمانہ مشکل
نالۂ بے سود ترانہ مشکل
ترکِ الفت پہ کوئی روک نہیں
ہے مگر اس کا بھلانا مشکل
کس طرح سمجھے زمانہ واحق
سہل باتوں کا بتانا مشکل

لوگوں کو دے رہا تھا وہ دعوتِ حیات کی
ورنہ یونہی کبھی نہیں دیتے صلیب لوگ
واحق اسی سوال پہ مبنی ہے انقلاب
کتنے امیر لوگ ہیں کتنے غریب لوگ

چھپائے زخموں میں اپنے چمن کی ساری بہار
پرندہ اُڑ گئے ہل چل میں ڈال ہے پھر بھی
ٹپکنے لگتا ہے رہ رہ کے اب جو دل سے لہو
بوصفِ شیشہ گری اس میں بال ہے پھر بھی
اسے بھلانے کی کوشش بھی ہو گئی بیکار
اُسے بھلانا اُسی کا خیال ہے پھر بھی

بہت سے ہم نے بھی دیکھے ہیں سایہ دار درخت
مگر وہ سائے تھے بھاری ہماری قوت سے
لٹائی میر نے یوں دولتِ سخن واحق
کہ ہم امیر ہوئے ہیں اُنھی کی دولت سے

وعدہ خلافی کر کے صفائی نہ دیجئے
اس شرط پر ہمیں شبِ ہجراں قبول ہے

میر و غالب میں شاعری کا فرق
دو رسولوں میں اک صدی کا فرق
تیغ پر قبضہ بندگی تہہ تیغ
سرکشی اور سروری کا فرق
اک پہ شمشان اک پہ تاج محل
دو کناروں میں اک ندی کا فرق
ایک روپوش دوسرا ظاہر
رہبری اور رہزنی کا فرق
اک کھلی اور ایک بند کتاب
دشمنی اور دوستی کا فرق

داغ دل اور چراغ دیر و حرم — روشنی اور روشنی کا فرق
تنگ دل کوئی تنگ دست کوئی — آدمی اور آدمی کا فرق
جاننے والے کیا ہوئے واثق — زیستن اور زندگی کا فرق

جسے فرعون سرمایہ نے اک مجبور سمجھا تھا — وہ موسیٰ عہد نو کا پل رہا ہے کارخانوں میں
ہمیں گاہک نہ جانا تو ان لڑائی کے کھلونوں کا — سجا رکھا ہے مغرب نے جنھیں اپنی دکانوں میں

قیمت لگا سکا نہ کوئی دل کی آج تک — خالی ہے مدتوں سے یہ گھر تم بھی دیکھ لو
صحرا ہے شہر شہر ہے صحرا تمام عمر — کام آئے گی یہ راہگذر تم بھی دیکھ لو
نوک قلم پہ خون پسینہ ہے لوح پر — ڈھلتے ہیں کیسے لعل و گہر تم بھی دیکھ لو
واثق نہ کہنا پھر کہ ہمیں کر دیا تباہ — اک تجربہ ہے بن کے بشر تم بھی دیکھ لو

سر اٹھا سکتے نہیں اس کو بھلا سکتے نہیں — جبر کو طوق کہو یا دل کو زنجیر کہو

وہ چھپ چھپاتے ہوئے میلے والیوں کی طرح — غزل میں آتے ہیں نازک خیالیوں کی طرح
اب آ بھی جا کہ شب تار کا یہ سناٹا — ہمارے کانوں کو لگتا ہے گالیوں کی طرح

عمر کی رَو بدل گئی شاید — ہم سے آگے نسل گئی شاید
لوح پر چند ٹیڑھے بیڑھے خطوط — میری صورت بدل گئی شاید

جو ترک مے پہ مصر ہیں وہ کاش سوچ سکیں — کہ تلخ ترکو نہ کرنا پڑے گوارا پھر
زمیں کی پیاس تو کیا بجھتی موج دریا سے — لہو کی نہر کا کاٹا گیا کنارا پھر
سلگتے لمحے حرارت کی آخری منزل — منگا دُ برف کی سل چڑھ رہا ہے پارا پھر
بدن کے زخموں سے ہے سخت تر جراحت ذہن — جریدہ! شیشوں کا مرہم کوئی شمارا پھر

نہ جس کی شکل ہے اس کی نہ جس کی عمر اس کی — وہ مجھ کو شیشہ میں اکثر دکھائی دیتا ہے
ہے اس کا نطفۂ تعمیر کوئی جرم ضرور — جو سب سے اونچا سا گھر دکھائی دیتا ہے

میرے بچپن کی وہ پریاں کیا ہوئیں — نقرئی بالوں کی دولت اب کہاں
کوئی قیمت ہی نہیں الحاد کی — لوگ کرتے ہیں عبادت اب کہاں

بچھا دو راستے پہ میرے خون کی بانات — ادھر سے قافلۂ انقلاب گذرے گا

یہ عجیب طرح کا دور ہے تو مرا جنوں بھی کچھ اور ہے — مری عمر قابلِ غور ہے میں چلا ہوں جیسے جواں چلے
مرے صحن میں جو بکھر گئے مرے دستِ پا کے ہیں آبلے — یہ مرے لہو کے گلاب ہیں چلے دیکھ کر جو یہاں چلے
مرے دوستو مجھے چھوڑ کر بھری بستیوں میں کہاں چلے — نہ رکو تو میری زباں چلے جو رکو تو کارِ جہاں چلے

دور میں اٹھی لگار کھی ہے شاید تم نے — پاس ہم رہ کے تمہیں دور نظر آتے ہیں

وامق بہت ہے دور ابھی منزلِ سحر — کچھ تیز چل مسافرِ شب تیز چل کچھ اور

ہم نے مشرق کے جھروکوں میں اُسے دیکھا تو تھا — پھر نہ جانے کیا ہوا اک دم اندھیرا ہو گیا

کوئی جنوں وہ نہیں جس کا اذنِ عام ہے — شراب میں ہے مزا جب تلک حرام ہے

وعظ کے بعد ذہن دھو لیتے — اک ذرا میکدے تو ہو لیتے

میں چلا صحرا تو کوئی روکنے والا نہ تھا — اک مرا سایہ تھا جو پیروں سے لپٹا رہ گیا

وہ چاہے کچھ بھی نہ ہو اس کے پاس کھولی میں — فقیر رکھتا ہے نشہ ضرور جھولی میں
سخن رہے گا وہ رطب اللسان مدت تک — غریبِ شہر جو کہتا ہے اپنی بولی میں
صحیح وقت پہ جب داد فن ملی وامق — ہمارا ہو گیا نیلام ایک بولی میں

کشتی اب اپنے ہاتھوں سے کھینے کا وقت ہے — جب کھو دے بادباں ہوائیں بدل گئیں

جنت میں تیری حال عجب بے بسی کا ہے — رونے کی کوئی بات نہ موقع خوشی کا ہے
غمہائے روزگار کہ شب ہائے انتظار — ان پتھروں کے بیچ جگر آدمی کا ہے

حیات جاودانی موت کے آنچل سے چھنتی ہے — نہ ہو جس پر شہیدوں کا لہو پرچم نہیں کہتے

تاریخ شوق لکھ رہے تھے ہم غزل کے بیچ — صدیاں سمٹ کے آ گئیں ایک ایک پل کے بیچ
عکس سفینۂ سبد گل فردوش ہے — یا قوسِ ہفت رنگ چھلکتی ہے ڈل کے بیچ
ہم کیوں کہیں کہ موت ہے منزل حیات کی — اک رات کا پڑاؤ ہے یہ آج کل کے بیچ

سنا تھا اب وہ نہ ہوگا جواب سے قبل ہوا — خبر ملی ہے کہ پھر اک ادیب قتل ہوا

آسماں لاکھ جھکا پھر بھی زمیں مل نہ سکی — آستانے کو ترے میری جبیں مل نہ سکی

ملے ملے نہ ملے منزل اس کی بات الگ — ہے دن میں لٹنے کا دھڑکا اندھیری رات الگ
جو خاک ہو گئے ان کا حساب پاک ہوا — جو زندہ بچ گئے اب اُن سے ہو گی بات الگ
غبارے بن گئے خیمے وہ آندھی آئی تھی — دلہن بھٹک گئی دولہا الگ برات الگ

Eminent Ghazal-writers in 1985/95

Autobiographies & Selections from their poetry, by the poets themselves

Contents

1995

Price Rs. 75/-

Printed by Pakeeza Offset Press, Muhammadpur, Shahganj, Patna-800006
and published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna.

Khuda Bakhsh Library
Journal

100

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Khuda Bakhsh Library Journal

100

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna